کتابی سلسلہ ۲۸
دنیازاد
ترتیب: آصف فرخی

کتابی سلسلہ

دنیا زاد

کتاب ۲۸

کوئے ملامت

ترتیب و تالیف

آصف فرخی

کتابی سلسلہ

دنیا زاد

کتاب ۲۸

اگست ۲۰۱۰ء

کمپوزنگ : احمد گرافکس، کراچی info@ahmedgraf.com

طباعت : اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

رابطہ : شہرزاد

بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی

ای میل : asiffarrukhi@hotmail.com

کتابی سلسلہ، سال میں تین کتابیں

پاکستان میں : ۴۰۰ روپے

بیرون ملک : ۴۰ امریکی ڈالر

فہرست

◆

◆

◆

اردو فکشن کا غیر فانی کارنامہ

تہذیب، ادب، عشق، فن، سیاست اور تاریخ کا نادر مرقع

کئی چاند تھے سرِ آسماں

شمس الرحمٰن فاروقی

اٹھارویں انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کے پس منظر
میں زندگی، فن اور محبت کی تلاش پر مشتمل

پاکستان میں پہلی اشاعت

محفل

ایک مدّت گزری جب ''کشف المحجوب'' میں اُس چوہے کا حال پڑھا تھا اور وہ بیان کانٹے کی طرح دل میں چُبھ گیا تھا...... علی بن عثمان ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش کہ مزار جن کا بلاد لاہور میں مرجع خلائق ہے، راوی ہیں کہ اس چوہے نے ایک قلّہ کوہ میں اپنا بل بنایا تھا اور ایک روز جب اس پہاڑ میں آگ بھڑک اٹھی تو چوہا نکل کر بھاگا، پھر اس پہاڑ کی جانب پلٹ گیا جو اس کا مقام تھا...... اس حکایت کو پڑھا تو چوہے کے پنجوں کی کھرکھراہٹ بہت قریب سے سنائی دی، بہت مانوس معلوم ہوئی تھی۔ ٹی ایس ایلیٹ کی وہ سطریں یاد آ کر رہ گئی تھیں:

I should have been a pair of ragged claws
Scuttling across the floors of silent seas......

جب حکایت آشکار ہوئی تب ہم میں سے کس کو معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب پہاڑ میں آگ لگے گی اور اس جلتی بھومی پر پناہ ڈھونڈنے والے آگے بڑھ کر اپنے نکیلے دانتوں اور پنجوں میں سے اس روشن ہاتھ پر ہی شب خون ماریں گے جو ان کا احوال رقم کر رہا ہے۔ لاہور داتا گنج بخش کے آستانے پر خودکش حملہ اس نوعیت کا ہے کہ اس کی نظیر اس علاقے کی تاریخ میں نہیں ملتی، اقتدار میں تبدیلی کے اس دور میں نہیں جس کو ہمارے مؤرخ انتشار اور بدامنی سے عبارت سکّھا شاہی قرار دیتے ہیں۔ پہاڑ میں آگ لگ رہی ہے اور بہت سارے چوہے اپنے پنجوں سے تاریخ کی کتاب کے ورق پھاڑ ڈالنا چاہتے ہیں، ان اوراق میں چھپ جانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ چوہا بھی کسی دور دراز کے نے نواز کی دُھن پر اپنی دم کے بل ناچ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اگلے ہی کسی لمحے میں ناچتے تھرکتے ہوئے پائیڈ پائپر کے اس اشارے پر چوہوں کی جگہ ہمارے بچّے بستی کی گلیوں کوچوں میں نکل آئیں گے اور ہم ایک دوسرے کا منھ تکتے رہ جائیں گے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں؟

ہم اب حکایتیں مسخ کرنے والے لوگ بن کر رہ گئے ہیں، حکایتیں پڑھنے اور ان پر غور کرنے والے لوگ نہیں۔

چلتے چلتے ہم اب ایک ایسے مقام پر آ پہنچے ہیں جہاں سے منزلِ آخر کے نشان واضح نظر

آ رہے ہیں۔ پاؤں شل ہیں اور کندھے بوجھل۔ مگر اب واپسی کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

دمشق میں قحط کے مارے لوگ عشق کرنا فراموش کر بیٹھے تھے۔ ہمارا وہ حال ہو رہا ہے کہ ہم لوگ زیست کرنا بھولتے جا رہے ہیں۔

اس بے آسرا زندگی کی ذلت سے بچنے کے لیے اپنے بچوں سمیت موت کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ انفرادی فیصلے جو ایک بڑی اور اجتماعی ابتلاء کی نشانیاں ہیں...... پنجاب کے ایک دیہات میں ایک عورت نے اپنے چار بچوں سمیت نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ لاہور میں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک رکشہ چلانے والے نے بیوی اور بچوں کو زہر دے دیا۔ نوکری ملنے سے مایوس ہو کر فاقہ زدہ نوجوان نے پنکھے سے لٹک کر جان دے دی...... اخباروں میں آئے دن ایسی خبریں آنے لگی ہیں۔ پھر یہ خبریں بھی نقار خانے کے شور میں گم ہو جاتی ہیں لوگ اگلی کسی خبر کے صدمے میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں کسی اخبار نے تجزیہ کیا تھا کہ ایک ماہ کی مدّت میں ایک سو ستر کے قریب افراد غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کر بیٹھے۔

خودکشی وبائے عام بنتی جا رہی ہے۔ ہماری اجتماعی کیفیت کی اندوہ ناک علامت...... اس تجزیے پر ناقابلِ فراموش بیان ہمارے ان محترم وزیر نے دیا جنھوں نے فرمایا کہ لوگ اپنے بچوں کی جان نہ لیں، ان کو بیت المال میں جمع کرا دیں۔ حیرت ہے کہ یہ ترکیب فرعون کو کیوں نہ سوجھی۔ شاید اسے اپنے بیت المال پر اعتبار نہ ہوگا۔ عوام کو سرکاری ملکیت بنوانے کی سفارش کرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ کیا وہاں وزیرے چُنّیں اور شہریارے چُناں کے لیے بھی گنجائش ہے؟ یا پھر عذرا عباس کی نئی نظم کی طرح پرانی اور بے کار بسیں کسی اور گیراج میں بھیج دی جاتی ہیں؟ یہ وزیر فاطمہ حسن کے افسانے جیسے کیوں نہیں ہو سکتے؟

اس شمارے کے افسانوں کا آغاز الطاف فاطمہ سے ہوتا ہے۔ ان کی اس نئی تحریر میں ایک متوسط طبقے کے گھر میں ملازم کی ضرورت ملک کے بڑے بڑے مسائل سے دو لکیروں کی طرح مل جاتی ہے۔ یہ افسانہ الطاف فاطمہ نے اپنے نقطۂ نظر سے لکھا ہے لیکن یہ صوت حال اس لڑکے کے لیے کیسی ہے جو اس کے مرکز میں سوالیہ نشان کی طرح موجود ہے؟ کیا اس کے سامنے اب اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا؟ کیا اس کے مقدّر میں یہی لکھا ہے کہ چھوٹا سا نوالہ بن کر دہشت گردی کے بلاخیز شکم میں اُتر جائے؟ رضیہ فصیح احمد امریکا میں مقیم ہیں اور بر اعظم بہنوں کی زندگی پر

مبنی ناول ''زخمِ تنہائی'' کے بعد ایک اور ناول کو لکھنے میں منہمک ہیں، جس کے دوران انہوں نے یہ مختصر افسانہ لکھا۔ نکہت حسن کا ناول ''جاگنگ پارک'' اور جاپانی ادیب یاسوناری کاواباتا کے تراجم ''کفِ دست'' حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ افسانہ انہوں نے ''جاگنگ پارک'' سے قبل مکمل کرلیا تھا لیکن شائع اب ہورہا ہے۔ پاکستان کے مایۂ ناز مصوّر تصدق سہیل تصویر کشی کے دوران گاہے بگاہے افسانے سے اپنی پرانی محبّت کو بھی یاد کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ وہ اس شہر کی جل پری کا قصّہ لکھیں گے مگر اس دوران پچھلی پیری راستہ کاٹ گئی اور یہ بھی افسانہ ہوگیا۔

''نئی آواز'' کے سلسلے میں اس بار محمد عباس کے افسانے شائع کیے جارہے ہیں جو اس جانب ان کا پہلا قدم ہیں۔ محمد عباس نے اپنے گاؤں کی مناسبت سے شروع میں اپنے نام کے ساتھ طوروی لکھا جو ضلع جہلم میں واقع ہے۔ محمد عباس نے گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور سے ایم فل کررہے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کی ادبی شخصیت کے حوالے سے ان کا مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ افسانہ لکھنے کا شوق تو کافی عرصے سے تھا مگر اشاعت کے لیے بھیجنے کی ہمّت نہیں تھی۔ جناب محمد سلیم الرحمٰن نے ان کے یہ افسانے پڑھ کر اشاعت کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ گاؤں کی فضا اور سماجی رشتے ناتوں کا جدلیاتی عمل ان افسانوں میں واقعات کے پیچ وخم کے ساتھ لسانی سطح پر بھی ایک مختلف انداز کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس آغاز سے امید بندھتی ہے کہ محمد عباس افسانے کے سفر میں اپنی ابتدائی کامیابی کو دہرانے کے بجائے اس سے بہت آگے جائیں گے۔

بزرگ شاعر منیب الرحمٰن کی دو نئی نظموں سے اس بار حصّہ نظم کا آغاز ہورہا ہے۔ شاعری کے علاوہ منیب صاحب نے ہمیں بتایا کہ خودنوشت سوانح بھی زیرِ تصنیف ہے۔ معروف شاعرہ تنویر انجم کی شہرت کا آغاز ان کی نثری نظموں سے ہوا تھا اور انہوں نے جدید شاعری میں ایک اہم مقام جلد ہی حاصل کرلیا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں، ادھر انہوں نے تواتر سے نئی نظمیں لکھی ہیں جن میں تازہ کاری کی لہر نظر آتی ہے۔ شوکت عابد اپنی شاعری کی اشاعت سے خاصا پرہیز کرتے ہیں مگر ان کا کلام ''دنیازاد'' کے ابتدائی شمارے میں شامل تھا۔ انہوں نے پچھلے دنوں نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کا مزید کلام اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔ دلّی میں مقیم شاعر عبید صدیقی تدریس اور ٹیلی وژن پروگرام کی میزبانی میں زیادہ مصروف رہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری پر بھی اثر پڑا لیکن ادھر وہ خوب لکھتے رہے ہیں۔ ان کی تازہ غزلوں میں سے

چند اس بار شامل ہیں، باقی آئندہ۔ صابر وسیم صحافت کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ شعر تواتر کے ساتھ کہتے رہے ہیں مگر شائع کم ہوئے ہیں۔ ان کی یہ غزلیں بھی کاشف حسین غائر کی بدولت حاصل ہوئی ہیں جو اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ شاعروں کے کلام تک رسائی میں ہمارے لیے ممد و معاون ثابت ہوتے آئے ہیں۔

اس شمارے کے خاص فن کار فہمیدہ ریاض اور احمد مشتاق ہیں جو نثر و نظم میں اپنی جولانئ طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ احمد مشتاق کے تراجم کا پچھلی بار ذکر ہوا تھا، ان کی اس سرگرمی کے نئے ثمرات اس بار دیکھیے۔ فہمیدہ ریاض کی نثری تحریروں کے ساتھ (کیا ان کو افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ یا روداد کا ایک اندازِ بیان؟) ان کی نظم ''تم کبیر'' اپنی مکمل صورت میں شائع کی جارہی ہے اور اس اجمال کی تفصیل بھی۔ پولش شاعر میلوش کو بیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہندی کے سربرآوردہ ہم عصر شاعر اشوک واجپئی نے نمائندہ پولش شاعری کو ہندی میں منتقل کیا ہے۔ ان کی یہ گفتگو میلوش کے انتقال کے بعد دلّی کے ممتاز جریدے ''دلی لٹل میگزین'' میں شائع ہوئی۔ جان برگر اپنے ناولوں اور مقالوں کے لیے شہرت رکھتے ہیں، خاص طور پر وہ ناول جو یوروپ کی دیہاتی زندگی کو اجاگر کرتے ہیں۔ انہوں نے مصوری کی تحسین و تفہیم کے بارے میں جو کتابیں لکھی ہیں، وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

سیمیں دانش ور معاصر فارسی ادب کا بڑا محترم نام ہے۔ دل کو چھو لینے والے اس افسانے کو پڑھ کر اردو کی اہم افسانہ نگار اور نقاد ممتاز شیریں کا افسانہ ''آئینہ'' یاد آنے لگتا ہے جس میں بوڑھی ملازمہ کا کردار اور بچّے سے محبت کا نقش نمایاں ہے۔ اس افسانے کا ترجمہ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے فارسی سے کیا ہے۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان کو فارسی ادب سے خصوصی شغف ہے اور ہماری درخواست پر انہوں نے سیمیں دانش ور کے ایک ناول کا ترجمہ شروع کیا ہے، جس کے چند صفحات آپ جلد ہی 'دنیا زاد' میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

جاسوسی ناول کے دو مختلف نمونے ایک عجیب حسن اتفاق سے Phenomenal قرار پائے ہیں۔ ابنِ صفی کے بارے میں عثمان قاضی نے قلم اٹھایا ہے جو ڈھاکہ میں اپنی ملازمت مکمل کرنے کے بعد اب اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ وہ ادب کے سنجیدہ قاری ہیں اور اپنے حلقۂ احباب میں اپنی وسعتِ معلومات اور گفتگو کی بذلہ سنجی کے لیے پہچانے جاتے ہیں۔

کلاسیک کے عنوان کے تحت اس بار آغاز محمد حسین آزاد کو خراجِ تحسین سے کہ آزاد کی صد

سالہ تقریبات بہت دھوم دھام کے ساتھ منائی گئیں۔ انتظار صاحب کا یہ مضمون بھی اسی سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ آزاد ایسی دھوم دھام کے یقیناً مستحق ہیں لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آزاد کے مطالعے کے کیا نئے گوشے سامنے آئے اور جدید ادب کی اس کلیدی شخصیت کہ جس سے جدید نظم، جدید تنقید اور انشائی ادب کے نئے راستے کھلے، اس کی تفہیم و تعبیر میں اب کیا نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔ یہی معاملہ اقبال کے ساتھ بھی ہے جو پیہم رواں زندگی کی طرح مطالعے کی نئی جہات کے متقاضی ہیں۔ معروف نقاد اور ادیب شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ مضمون لاہور میں منعقدہ ایک کانفرنس کے کلیدی خطبے کے طور پر لکھا تھا مگر وہاں پڑھا نہ جاسکا۔ فاروقی صاحب نے لاہور میں منعقد ہونے والی ن م راشد صدی کی تقریبات میں بھی شرکت کی اور ایک عمدہ مقالہ پیش کیا۔ لاہور میں سیّد عبداللہ یادگاری خطبہ جناب شمیم حنفی نے پیش کیا۔ یوں تنقید کے اعتبار سے ادبی محفلوں میں رونق رہی۔ لیکن تنقید کا اپنا اعتبار کس حد تک قائم ہے؟ نئے پرانے جن سوالات کی یورش نے اس وقت ادب کو نرغے میں لیا ہوا ہے، ان مسائل کا سامنا کرنا میں تنقید کا جو بنیادی و منصبی کردار ہونا چاہیے، اس ضمن میں تنقید فکری رہ نمائی اور جذباتی تربیت کا فریضہ پورا کررہی ہے؟ اسی سوال کے تناظر میں اس مرتبہ کے افسانے اور نظمیں، غزلیں پڑھ کر دیکھیے۔

انتظار حسین

محمد حسین آزاد

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ عین مین یہی کچھ ہوا۔ پر پرزے نکال رہے تھے کہ سن ستاون کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ باپ کو پھانسی پر چڑھتے دیکھا۔ گھر کو تلنگوں کے ہاتھوں لٹتے اجڑتے دیکھا۔ خاندان کو سمیٹا اور دلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ پھر دربدری خاک بسری قسمت میں لکھی گئی۔ خیر یہ لمبی داستان ہے۔ مجھے یہ داستان لکھنی مقصود نہیں ہے۔ میں صرف یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس سے بھی بڑھ کر ایک دہشت ناک واردات آزاد کے ساتھ گزری تھی۔ یہ واردات وسط ایشیا کے اس سفر کے دوران گزری جو انہوں نے برطانوی مشن کے ایک رکن کے طور پر کیا تھا اور جس سفر پر یار و اغیار نے بہت انگلیاں اٹھائی تھیں۔ خیر مجھے یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ دوران سفر جو واقعہ گزرا اور جسے آزاد کے پوتے آغا محمد اشرف نے اس سفر کی روئداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے وہ سن لیجیے۔ کہیں سمرقند و بخارا کے آس پاس انہیں ایک رات کسی سرائے میں بسر کرنی پڑی۔ رات بھیگ چلی تھی۔ وہ تندور کے قریب بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ چراغ کی مدھم روشنی میں انہیں اچانک احساس ہوا کہ ایک اجنبی ان کے بالمقابل بیٹھا ہے۔ انہوں نے اس کی صورت دیکھی اور چونکے۔ پھر غور سے دیکھا۔ ارے یہ شخص تو میرا ہم شکل ہے۔ عین مین میں ہوں اور سارے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہمت کرکے پوچھا ''اے عزیز، تیرا نام کیا ہے۔''

''میرا نام'' اس نے گمبھیر آواز میں کہا ''میں محمد حسین ہوں۔''

آزاد کو ایک دہشت نے آلیا۔ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور سرائے سے نکل کر سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔

آغا اشرف اتنا بیان کر کے اور طرف نکل گئے۔ یہ نہیں بتایا کہ اس دہشت کے ہوتے باقی سفر کیسے کٹا۔ بہر حال کسی نہ کسی طور اس تجربے پر قابو پا ہی لیا ہوگا کہ کافی دنوں بقائمی ہوش وحواس لکھتے پڑھتے رہے۔ دیوانگی کا دورہ تو بہت بعد میں پڑا۔ پتہ چلا کہ اس تجربے پر وقتی طور پر قابو پایا تھا۔ اس نے آگے چل کر جانے کن کن اثرات کے تحت پھر سر اٹھایا اور اس طرح سر اٹھایا کہ پھر آخری ایام عالمِ جنوں ہی میں گزرے۔

یہ آخری ایام بھی لمبے کھنچے۔ مگر قلم پھر بھی چلتا رہا۔ ایران توران کی ہانکتے رہے اور لکھتے چلے گئے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ان تحریروں کے بارے میں نقادوں کا عمومی روّیہ کچھ اسی قسم کا رہا ہے۔ میں نے ان تحریروں کا ذکر سب سے پہلے عسکری صاحب سے سنا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جوائس کے ساتھ ان کا عشق چل رہا تھا۔ 'یولیسس' سے گزر کر فنی گنز ویک سے بھی میں نے انہیں الجھتے سلجھتے دیکھا۔ اس ناول کا یا جس قسم کی یہ تحریر تھی، اس کا پہلا صفحہ میں نے بھی پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر فوراً ہی کان پکڑ لیے۔ بس انہیں دنوں جانے کس تقریب سے آزاد کی ان تحریروں کا ذکر ان کی زبان پر آیا۔ میں نے تھوڑے تجسس کا اظہار کیا تو کہنے لگے کہ یار عجب قسم کی تحریریں ہیں۔ کوئی پورب کی کوئی پچھم کی۔ ابھی رام چندر جی کا ذکر تھا اور ابھی سبزی ترکاری کا ذکر شروع ہوگیا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے، مولانا نے دیوانگی بھی نئی تکنیک میں کی ہے۔ یہ کہتے کہتے کسی قدر سنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے عجب ہے جوائس وغیرہ نے ہوش وحواس میں رہ کر کتنے تردد سے جس تکنیک کو برتا تھا اسے آزاد نے عالم دیوانگی میں کس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں کہ آزاد کا تعلق فکشن سے کہاں جا کر قائم ہوا ہے۔ یہاں مجھے اپنا ہی ایک بیان یاد آرہا ہے تو چلیے آزاد کے عہدِ جنوں کو تھوڑی دیر کے لیے التوا میں ڈالتے ہیں۔ انہوں نے ہوش کے عالم میں جو لکھا ہے اس حوالے سے تھوڑی بات ہو جائے۔ مجھے آزاد کا فکشن سے تعلق انہیں تحریروں کے حوالے سے بلکہ تخصیص کے طور پر ایک تحریر کے حوالے سے نظر آیا تھا۔ بحث یہ چل رہی تھی کہ اردو میں کوئی ایسا ناول بھی ہے جسے ہم بڑا ناول کہہ سکیں۔ جوشِ بیان میں میرے قلم سے ایک فقرہ عجب نکلا کہ میرے حساب سے اردو میں پہلا بڑا ناول آبِ حیات ہے۔ یہ فقرہ لکھ کر

میں، تو چور بن گیا۔ اپنی ادبی زندگی میں جن قبیح حرکتوں کی وجہ سے مجھ پر بے بھاؤ کی پڑی ہیں انہیں میں شاید یہ بیان بھی شمار کیا گیا۔ اب اتنے برسوں بعد اپنا یہ بھولا بسرا بیان مجھے یاد آیا ہے تو اس میں یہ اطمینان شامل ہے کہ تب سے اب تک پلوں کے نیچے سے پانی بہت بہہ گیا ہے۔ اب نثر کو بھی خالی Prose and Reason سے عبارت نہیں سمجھا جاتا اور ادھر اردو فکشن کی دنیا میں بھی کتنے اسالیب برتے جا چکے ہیں۔ خیر اردو فکشن کی یعنی نئے اردو فکشن کی عمر ہی کتنی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ اس سے قطع نظر عالمی فکشن میں ایسے ناول افسانے بھی لکھے گئے ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم کسی علمی مباحثہ میں شریک ہیں۔ اور ایسے علمی مباحث بھی ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ ہم کوئی بہت سنجیدہ ناول پڑھ رہے ہیں۔ بے شک عالمانہ نثر کا بھی اپنا ایک مقام اور ایک وقار ہے اور تحقیق و تنقید نے اپنے لیے جو نثری اسلوب وضع کیے ہیں ان کی بھی اپنی ایک قدر و قیمت ہے اور آزاد کے زمانے ہی میں ایسے نثری اسالیب کے اچھے نمونے سامنے آچکے تھے۔ اس کی سب سے خوب اور مرغوب مثال مولانا شبلی کی شعر العجم ہے۔ لیکن اگر کوئی محمد حسن عسکری جیسا نقاد عالمانہ نثر کی ثقاہت سے تنگ آ کر اس سے رسّہ تڑا لے اور کھلی ڈلی نثر لکھنے پر اتر آئے تو اس کی معنویت کو بھی ہم سمجھ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور ہاں جب میں نے وارث علوی کو اس کے غیر ثقہ اسلوب بیان پر داد دی تو انہوں نے کہا کہ اس باب میں میں نے محمد حسن عسکری سے فیض پایا ہے۔

خیر وہ محمد حسن عسکری ہوں، وارث علوی، ہوں، سلیم احمد ہوں سب برحق۔ مگر آزاد کی 'آب حیات' وہ چیزے دگر ہے۔ وہ اردو شاعری کی تاریخ ہی لکھنے بیٹھے تھے۔ مگر اپنے تخلیقی جوہر کو جو انہوں نے بطور خاص ودیعت ہوا تھا، اسے وہ کہاں لے جاتے۔ تو انہوں نے اس پوری تاریخ کو اس کٹھالی میں انڈیل دیا۔ وہاں سے تپ کر جو شے برآمد ہوئی وہ تاریخ بھی تھی۔ مگر تاریخ سے بڑھ کر بھی ایک شے بن گئی۔ اس سارے بیان میں ایک تخلیقی ذائقہ پیدا ہو گیا۔ ایسا ذائقہ جو صرف بڑے ناولوں میں ہمیں ملتا ہے۔ اردو شاعری کا وہ پورا زمانہ جو وہاں مختلف ادوار میں منقسم ہے اس طرح سے جیتا جاگتا ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے کہ پھر ہمارے تصور میں سما جاتا ہے اور پھر اس زمانے کے وہ چھوٹے بڑے شاعر کس طرح چلتے پھرتے ہنستے بولتے کبھی خوش کبھی غم زدہ نظر آتے ہیں جیسے کسی بڑے ناول نگار کے قلم نے انہیں جنم دیا ہے۔ واضح ہو کہ اچھے ناول کے کردار زندہ لوگوں سے زیادہ زندہ ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے زمانے میں جتنی نیک نام اور بدنام خواتین کو

دیکھا ہے یا ان کے قصے سُنے ہیں انہیں وقت کے ساتھ ہم بھولتے چلے جاتے ہیں لیکن جس نے رسوا کا ناول ایک مرتبہ پڑھ لیا وہ امراؤ جان ادا کو شاید ہی کبھی بھول پائے۔ اور الف لیلہ کی شہرزاد۔ ارے یہ عورتیں بھولنے کی چیزیں ہیں۔ اسی لیے میں داغ کا دو حوالوں سے قائل ہوا۔ ایک اقبال کا مرثیہ داغ، اور اُن کی والدہ ماجدہ کا احوال شمس الرحمان فاروقی کے ناول میں پڑھ کر۔ جسے ایسے طمطراق والی ماں نے جنا ہو وہ چھوٹا موٹا بندہ تو نہیں ہو سکتا۔

لیجیے اچھا حوالہ میری زد میں آ گیا۔ تو یہ جو آبِ حیات کے بارے میں اب اپنی رائے کو دہرایا ہے اُس سے اب کم از کم شمس ارحمان فاروقی تو اختلاف نہیں کر سکتے۔ اب بھی انہیں اس رائے سے اختلاف ہوگا تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں فکشن کی دنیا میں آ کر جو ایک طرزِ سخن نکالی ہے اُسے بلا شرکت غیرے اپنی ایجاد جانتے ہیں۔ وہ جو انہوں نے اپنے افسانوں میں مختلف شاعروں کی شخصیتوں کو افسانوی کرداروں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کی ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر ایک پورے ادبی عہد کو ناول کی سطح پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس سب کے پیچھے مجھے مولانا محمد حسین آزاد اپنی آب حیات بغل میں دبائے کھڑے نظر آتے ہیں۔

اچھا تھوڑی بات تو میں آزاد کی نثر پر بھی کرنا چاہتا تھا مگر سوجھ نہیں رہا کہ کس ڈھنگ سے اس نثر کی خوبی بیان کروں۔ اچھا شعر ہو یا اچھی نثر اس کے بارے میں یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کم از کم میرے لیے کہ یہ اچھائی ہے کیا۔ بس ایک فقرے پہ بات ختم کروں گا۔ کسی بھلے وقت میں ٹی ای ہیوم کی نثری تحریروں کے کسی انتخاب میں میں نے نثر پر اس کا مضمون پڑھا تھا۔ اب اس مضمون کی کوئی بات یاد نہیں۔ بس اس کا ایک فقرہ حافظے میں اٹکا رہ گیا ہے۔ شاید بات کچھ اس طرح کہی گئی تھی کہ اچھی نثر میں بیچ بیچ میں فقرہ اس طرح آتا ہے جیسے پھنیر سانپ پھن پھیلا کر کھڑا ہو جائے۔ میں نے سوچا کہ خود یہ فقرہ بھی کچھ ایسی ہی شان رکھتا ہے اور پھر مجھے فوراً محمد حسین آزاد کا خیال آیا۔ ارے یہ تو آزاد کی نثر کا وصف بیان ہوا ہے۔ یا پھر عسکری صاحب کی نثر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر ایک فرق کے ساتھ۔ عسکری صاحب کے فقرے میں زہر بہت ہوتا ہے اور محمد حسین آزاد شاید کچھ اس طرح سوچتے ہیں کہ ع

گو سے جو مرے تو زہر کیوں دو

بس ان کے قلم کی نوک پر آ کر گڑ ہی زہر بن جاتا ہے۔

مگر تو میں عالمِ میں لکھی ہوئی نثر کی بات کر رہا ہوں۔ یہ جو عالمِ دیوانگی میں قلم نے اپنی

روانی دکھائی ہے اس نثر کو ہم کیسے جانچیں، پرکھیں۔ اس وقت وہ مختصر کتاب جس کا عنوان فلسفۂ الٰہیات ہے اور جو اسی عالم میں لکھی گئی وہ میرے سامنے ہے۔ اور میرا حال یہ ہے کہ ڈور کو سلجھا رہا ہوں اور سرا ملتا نہیں۔ اگر یہ فلسفیانہ بحث ہے تو فلسفیانہ بحثیں بھلا ایسی ہوا کرتی ہیں کہ سرے سے ڈور کا سرا ہی نہ ملے۔ میں ابھی کہہ رہا تھا کہ بیسویں صدی میں ایسے ناول بھی لکھے گئے ہیں کہ لگتا ہے کہ ہم کسی فلسفیانہ مذاکرے میں شریک ہیں اور ڈی ایچ لارنس نے تو مکالماتِ افلاطون کے بارے میں یہ رائے دے رکھی ہے کہ یہ مختصر فلسفیانہ ناول ہیں۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ بالفرض ان میں سے کوئی مکالمہ بیسویں صدی کے ناولوں والی تکنیک میں لکھا جاتا تو کیا عجب ہے کہ اس کی شکل وہی ہوتی جو 'فلسفۂ الٰہیات' کی ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ اس ناول، اگر اسے ناول کہا جا سکتا ہے تو اختتام آپ کو سنا دوں:

''بس یہی۔

ہم نے پتا کا جامیا کو یہاں ختم کیا۔ دیکھ سری جے چند، تو ہے راجوں کا راجہ مہاراجہ۔ یہ ہم نے کیا ہے تجکو۔ آج ہے تو ایسا۔ جو حکم دیتے ہیں تو جاری کرتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ آج کے چار ہزار برس بعد تو ہوگا پروفیسر آزاد۔ اسی کتاب کو تو لکھے گا اپنی زبان میں۔ اسے اردو کہیں گے۔ اردو تیرا لشکر ہے۔ زبان کا نام یہ ہوگا...... اب ہم تجھے کہتے ہیں۔ تو ہے پروفیسر آزاد۔ لکھ تو اپنی طرف سے۔ سری مہاراج میں کیا عرض کروں۔ جو حضور سے ارشاد ہو وہی ہو۔ اچھا ہم کہتے ہیں۔ اے میرے ایشور، تو نے کہا۔ تو نے لکھوایا۔ مجھ میں کیا طاقت ہے۔ تو نے کہا بس۔ میں نے کہا بس۔ یہی خاتمہ ہوگیا۔ (ہاں پروفیسر آزاد) لکھ آج ہے ۲۲ر، ماگھ بدی سمت ۱۱۵۳ جنوری کی پہلی ۱۸۹۶ عیسوی۔ ربیع الثانی کی ۲۶ر ۱۳۱۶ ہجری۔ دن ہے بدھ کا۔ دیکھ یہ ہے معجزہ ہمارا۔ چار ہزار برس بعد ہم نے اس کتاب کو تجھے لکھوایا۔ سنہ، مہینے، مہینوں کی تاریخیں، دن کسی میں فرق نہیں۔ یہ ہے ہماری حکمت۔ جب ہم اپنا فلسفہ کام میں لائیں گے۔ ٹھیک وہی وقت ہوگا جو ہم وعدہ کر چکے۔ یہی ہے۔ یہی ہے۔ یہی ہے۔ بس۔''

مگر یہ سری جے چند کون ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دیوانگی نے ناموں کے ساتھ بھی

کھیل کھیلا ہے اور سری رام چند ہی غوطہ کھا کر سری جے چند بن گئے ہیں۔ گمانِ غالب ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے اور اگر ایسا ہوا ہے تو سری رام چندر جی بھی خوب ہیں۔ اہلِ درد کو انہوں نے کس کس عالم میں درشن دیے ہیں۔ داراشکوہ کو انہوں نے خواب میں درشن دیے تھے اس طرح کہ یہ راج کمار وہاں مغل شہزادے کا بھائی بن گیا۔ حوالے کے لیے دیکھیے 'جوگ بسشٹ' (فارسی سے اردو ترجمہ ابوالحق) جس کے آغاز میں داراشکوہ نے خواب میں رشی بسشٹ اور رام چندر جی سے ملاقات کا احوال لکھا ہے۔ یہاں کس عالم میں پروفیسر آزاد کو درشن دیے ہیں۔ یہ عالمِ خواب تو نہیں ہے مگر عالمِ بیداری بھی نہیں ہے۔ پھر کون سا عالم ہے۔ عالم دیوانگی؟ نہیں۔ یہاں مجھے غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

کوئی نہیں ہے اب اتنا جہان میں غالب
کہ جاگنے کو ملا دیوے جا کے خواب کے ساتھ

شاید یہ ہے وہ عالم جس کی غالب نے تمنا کی تھی اور جس نے آزاد کے یہاں آ کر ظہور کیا۔ اس عالم میں چار ہزار برس بعد سری رام چندر جی نے پروفیسر آزاد کے روپ میں جنم لیا اور اردو میں کچھ نئے اشلوک لکھنے شروع کیے یا کوئی نئی رامائن۔

اس بیان کی کوئی منطق نہیں ہے۔ مگر ان نگارشات کو دیوانگی کا دفتر لایعنی کہہ کر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بس یہ دفتر کسی نئے شناور کا منتظر ہے۔ شاید اس شناوری کی بدولت اس دفتر بے معنی سے معانی کے نئے لال و گوہر برآمد ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اقبال کا اقبال

کئی سال ہوئے علمی حلقوں میں یہ بحث اٹھی کہ اقبال کا کلام نوجوانوں میں کیوں مقبول نہیں ہے؟ اس بات سے قطع نظر کہ ''نوجوان'' اور ''مقبول'' دونوں الفاظ تعریف اور وضاحت کا تقاضا کرتے ہیں، یہ سوال بھی پوچھنے کے قابل تھا کہ اگر اقبال کا کلام نوجوانوں میں مقبول نہیں تو اس میں نقصان کس کا ہے، نوجوانوں کا یا اقبال کا؟ اگر کوئی ادبی معاشرہ ایسے نوجوانوں سے محروم ہے جو اقبال جیسے بڑے شاعر کے ساتھ دوستی نہ پیدا کر سکیں تو نقصان اس ادبی معاشرے کا بھی ہوا، کیونکہ اگر معاشرے میں کسی بڑے شاعر کو پسند کرنے والے معدوم ہیں، یا کم ہیں، تو اس حد تک وہ معاشرہ بھی کم ارز اور کم عیار ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو نوجوان آج اقبال کو پسند نہیں کرتا تو ممکن ہے کہ وہ آگے چل کر میر، یا غالب، یا نصرتی، یا شاید ان سب ہی سے منحرف ہو جائے۔ اور یہی لیل و نہار رہے تو کچھ مدت بعد وہ ادبی معاشرہ بھی معدوم ہو جائے گا جس میں ان شعرا کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں جہاں اس طرح کے سوالات اٹھیں کہ مثلاً، اقبال کیوں مقبول نہیں ہیں؟ قصیدہ کیوں مقبول نہیں ہے؟ ناسخ کی شاعری آج کوئی کیوں نہیں پڑھتا؟ معاشرہ خود اپنے احتساب اور اپنی درون بینی کے بجائے بچارے نامقبول شاعر کو، یا نامقبول صنف کو کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یا اگر شاعر یا صنف پر بہت مہربانی کی تو اس عہد کو، یا اس ''سماج'' کو مطعون کرنا شروع کر دیتا ہے جس عہد یا سماج میں وہ پیدا ہوا اور پھلا پھولا تھا۔

مثال کے طور پر، اپنے ناپسندیدہ اصناف یا شعرا پر ہمارا اعتراض، یا بارے میں ہمارا ردعمل، کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:

(۱) قصیدہ آج نا مقبول نہ ہو تو اور کیا ہو؟ قصیدہ ہے ہی کیا؟ محض جھوٹ کا پوٹ، لغویات کی گٹھری، نا اہل ممدوحین کی بارگاہ میں نا اہل مادحین کی ذہنی قلابازیاں۔ قصیدے کو جس زمانے میں فروغ ہوا، وہ زمانہ ہی مائل انحطاط اور علمی، دانشورانہ روایات سے خالی تھا۔

(۲) اور ناسخ؟ ناسخ کون تھے؟ فضول گوئی کے بادشاہ، اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ وہ لکھنو کی زوال آمادہ تہذیب کی پیداوار تھے جہاں شاعری کے نام پر کنگھی چوٹی مسی کرتی کی ثنا ہوتی تھی، جہاں شاعری کو حقیقت سے دور کی بھی شناسائی نہ تھی، جہاں غزل میں خیالی طوطا مینا اڑانے والوں کو استاد مانا جاتا تھا۔

(۳) اب رہے اقبال، تو میاں وہ ہوں گے اپنے زمانے کے حکیم الامت اور ملت اسلامیہ کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کے کھیون ہار۔ اب وہ ملت کچھ نئے ہی طرح کے منجدھاروں میں گرفتار ہے۔ فلسطین اور بوسنیا، چچنیا اور عراق، فلی پینز، تھائی لینڈ، کشمیر اور طالبان اور القاعدہ اور خودکش بمباروں کے زمانے کی ملت کچھ اور ہی رنگ، کچھ اور ہی مزاج رکھتی ہے۔ اب ہم اپنی خودی کو پہچاننے بیٹھیں گے تو دہشت گرد سمجھے جائیں گے۔

(۴) اقبال کے یہاں تیقن اور تلقین اس قدر شدید ہے کہ لگتا ہے ساری دنیا کے اسرار اور مسائل بس اسی انتظار میں ہیں کہ ہم اقبال کا کلام پڑھیں اور اسرار و مسائل دونوں کو حل کر ڈالیں۔ آج زمانہ شک اور استفسار اور درون بینی کا ہے، اور اقبال کے کلام میں ان چیزوں کا فقدان ہے۔ لہٰذا جس طرح قصیدے کی قدر و قیمت نصرتی اور سودا اور مصحفی اور ذوق و مومن و غالب کے لئے رہی ہوگی، لیکن ہمارے لئے کچھ نہیں، اور جس طرح ناسخ کو لکھنو والے جگت استاد مانتے رہے ہوں، لیکن ہمارے لئے وہ شاعر ہی نہیں۔ اسی طرح، دوسری جنگ عظیم اور سقوط سوویٹ روس کے پہلے کی دنیائے اسلام کو اقبال کی ضرورت رہی ہو تو رہی ہو، ہمارے لئے تو ان کی حیثیت اس قصۂ پارینہ کی بھی نہیں جس کی گاہے گاہے باز خوانی ہمارے داغ ہائے سینہ کو تازہ رکھنے کا کام کرے۔ اور یوں بھی، ہمارے داغ ہائے سینہ اور طرح کے ہیں۔ ہمیں تو یہ غم ہے کہ ہمارا داخلہ ایم۔آئی۔ٹی (M.I.T)، یا کیلٹیک (Caltech)، یا وارٹن اسکول آف بزنس (Wharton School of Business) میں کیوں نہ ہو سکا؟ ہمارا درد تو یہ ہے کہ اگلے کے پاس بڑی سی مرسیڈیز (Mercedes) یا پورشہ (Porche) کے علاوہ پچیس تیس لاکھ کی ہارلی ڈیوڈسن (Harley Davidson) بائک بھی ہے، اور ہمارے پاس صرف پجیرو (Pajero)۔ ایسے میں ہمیں کہاں

فرصت کہ ہم شاہین کی طرح پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کی سوچیں؟

اوپر لکھی ہوئی باتوں، خاص کر صنف قصیدہ، یا ناسخ، یا اقبال پر اعتراضات کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ تو کیا یہ رنج کی بات نہیں کہ ہمارا ادبی معاشرہ ان اعتراضات کو رد کرنے میں ناکام رہا ہے؟ (بلکہ اکثر تو یہ اعتراضات، خاص کر قصیدے اور ناسخ کے بارے میں اعتراضات، خود ہمارے ادبی معاشرے کی طرف سے عائد ہوتے رہے ہیں۔)

لیکن معاملہ اتنا سادہ نہیں۔ اس کے ایک دو پہلو مزید ہیں اور وہ غور طلب بھی ہیں۔ یہ بات تو اپنی جگہ پر کہ کسی شاعر کو اس کے ادبی معاشرے کی روایات سے الگ کر کے اور اس کے زمانے کے ''سماجی حالات'' سے جوڑ کر پڑھیں تو نتیجہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والا ہی نتیجہ برآمد ہوگا۔ جن پہلوؤں کا ذکر یہاں مجھے مقصود ہے، ان میں مثال کے طور پر، ایک یہ ہے کہ ہم کسی شاعر سے کس طرح کی توقعات رکھتے ہیں اور کیوں؟ یعنی کیا ہم شاعر سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے کوئی عملی، کارآمد اور ''داشتہ آید بکار'' قسم کا پیغام، یا سبق مہیا کرے، ایسا سبق جسے ہم وقتاً فوقتاً دہرا کر خوش ہوسکیں کہ ہم نے ''اخلاقی'' طور پر مستحسن کام کیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ شاعری عملاً کسی کام کی نہیں ہوتی۔ یعنی اقبال ہوں یا کوئی اور، انھیں پڑھ کر ہم ''کارآمد'' شہری نہیں بن سکتے اور نہ اپنی قوت خرید ہی بڑھا سکتے ہیں۔ تو پھر ہم شاعری سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ یورپی تنقید مدت مدید تک اس الجھاوے میں مبتلا رہی ہے کہ شاعری کا کام ''ہدایت اور مسرت'' مہیا کرنے، یعنی to instruct and to delight کا ہے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ شاعری ہی کو to delight کے ساتھ to instruct کا مزید فریضہ انجام دینے پر مکلف کیوں ٹھہرایا گیا؟ اور نہ ہی اس بات پر کوئی اتفاق ہو سکا کہ شاعری کے سیاق و سباق میں لفظ instruct کے کیا معنی ہیں؟

یورپ والوں کے یہاں یہ سوال بھی نہ پوچھا گیا کہ اگر شاعری منجملۂ فنون لطیفہ ہے تو دوسرے فنون لطیفہ، مثلاً مصوری، یا موسیقی کے ساتھ to instruct کی شرط کیوں نہ لگائی گئی؟ کبھی کبھی یہ تو کہا گیا کہ فلاں طرح کی موسیقی یا مصوری فلاں سیاسی اور تہذیبی نظریے کی رو سے قابل قبول نہیں۔ چنانچہ سوویٹ روس میں شاعری ہی نہیں بلکہ سوویٹ مصوری، سوویٹ موسیقی، سوویٹ طبیعیات، سوویٹ علم الکیمیا، سوویٹ حیاتیات، وغیرہ جیسی چیزیں بھی متعین کی گئیں۔ علیٰ ہٰذ القیاس، ہٹلر کے زمانے میں کئی طرح کی شاعری اور مصوری اور کئی طرح کی سائنس کو نازی فکری نظام سے متحارب قرار دیا گیا۔ کمیونسٹ چین میں بھی طرح طرح کے تہذیبی اور علمی قواعد مقرر کئے گئے۔ جس

زمانے میں یورپی اقوام کو تمام جرمن اشیا سے بڑی نفرت تھی ، اس وقت یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ واگنر (Wagner) کی موسیقی میں ہٹلری نظام کے استبداد کی گونج سنائی دیتی ہے۔ بہر حال، وہ سب باتیں اب پرانی ہو گئیں، اب تو شاید ادبی نوبل انعام دینے والی کمیٹی کے سوا یورپ میں بھی کوئی ایسا نہیں جو شاعری، یا کسی فن لطیف کے لئے ''ہدایت دینا'' یا to impart instruction، لازمی قرار دیتا ہو۔ اور نوبل انعام چونکہ مرے ہوئے ادیبوں کو نہیں ملتا، لہٰذا اب یہ امید بھی نہیں کہ ہم اقبال، یا میر، یا کسی کے بارے میں کہہ سکیں کہ چونکہ ان کے یہاں to instruct اور to delight کی صفات وافر مقدار میں عمل پیرا نظر آتی ہیں لہٰذا ہم نوبل کمیٹی کی خدمت میں درخواست بھیج سکتے ہیں کہ ہمارے اقبال یا غالب کو بھی مشرف بانعام کیا جائے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم شاعر سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے معاشرے کی اصلاح نہ کرے تو کم سے کم اس میں بگاڑ بھی نہ پیدا کرے۔ ہماری ادبی تہذیب میں حالی سے لے کر ترقی پسندوں تک سب نے یہ بات کسی نہ کسی پیرائے میں کہی کہ ایسا ادب کس کام کا جسے بہو بیٹیوں کے ساتھ یا ان کے سامنے نہ پڑھا جا سکے۔ لیکن یہ بات بھی اسی to instruct کی ضمن میں آتی ہے، بلکہ اسی کا ایک روپ ہے۔ حالی نے ایک اور فقرہ وضع کیا تھا ، کہ شاعری کا کام ''تفحص کائنات'' ہے۔ اس بات کو بعد میں کئی طرح کہا گیا۔ مثلاً یہ کہ شاعری کے ذریعہ کائنات یا زندگی کے بارے میں ہمارے شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑا پیچ پنہاں ہے جسے اقبال کو، یا کسی بھی شاعر کو ناپسند کرنے والے لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ پیچ یہ ہے کہ اگر شاعری کے ذریعہ کائنات یا زندگی کے بارے میں ہمارے شعور میں اضافہ ہوتا ہے تو پھر دو میں سے ایک بات درست ہے: اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر، مثلاً اقبال، کے زمانے میں زندگی (لہٰذا کائنات) ویسی نہ تھی جیسی اب ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں شعور حیات و کائنات جو بھی ہو، وہ ہمارے لئے کارآمد نہیں، تو یہ بات تمام گذشتہ شعرا پر صادق آتی ہے۔ شیکسپیئر ہوں یا رومی، حافظ ہوں کہ کالی داس، ابوالعلا معری ہوں یا ہومر، ان سب کے دن لد گئے۔ اب ہمارے لئے ان کی کوئی معنویت نہیں۔ ابوالعلا معری نے تو کہا بھی تھا کہ میں اسلامیوں کا ''اومیروس'' یعنی Homer ہوں (۱)۔ لیکن ہوگا، ہم تو جانتے ہیں کہ حیات و کائنات کے بارے میں ہومر کی بصیرتیں اور تھیں، ابوالعلا معری کی اور۔ غالب کی بصیرتیں کچھ اور تھیں، بودلیئر کی کچھ اور۔ آج ان کا زمانہ نہیں۔ لہٰذا ہمیں ان سے کچھ لینا دینا بھی نہیں۔

ظاہر ہے کہ کٹر سے کٹر تاریخ پرست کو یہ نتیجہ قبول نہ ہوگا۔اس بات سے قطع نظر کہ "ماضی" کسے کہتے ہیں، اس نتیجے کی رو سے ہم ساری ہی شاعری سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔لہٰذا اگر یہ بات درست نہیں کہ گذشتہ شعرا کی بصیرتیں ہمارے لئے بے معنی ہیں، تو یہ استدلال بھی بے معنی ہے کہ اقبال کی معنویت ہمارے لئے کچھ نہیں ، کیونکہ ان کا زمانہ کچھ اور تھا، ہمارا زمانہ اور ہے۔اور یہ استدلال بھی بے معنی ہے کہ کسی شاعر کی معنویت اس کے سیاسی سیاق و سباق کی محتاج ہوتی ہے۔اگر غور سے دیکھیں تو یہ دونوں استدلال مارکسی اور نام نہاد تاریخی فکر پر مبنی ہیں جس کی رو سے تاریخ ہی کسی فن پارے کے معنی متعین کرتی ہے۔یعنی کسی متن کے صحیح معنی ان تاریخی حالات کی ہی روشنی میں متعین ہو سکتے ہیں جن میں وہ بنایا گیا تھا۔اب یہ نتیجہ کسی کو قبول نہیں، حتیٰ کہ مارکسی فکر والوں کو (اگر ایسے کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں) بھی نہیں۔

اب یہاں ایک بات اور نکلتی ہے۔ مانا کہ اقبال کا زمانہ اور تھا، اور شاید ان کے مسائل بھی اور تھے، لیکن ان کی بصیرتوں، یا ان کے کلام، کو ہم اپنے معنی بھی تو پہنا سکتے ہیں۔شیکسپیئر کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ آج کی دنیا اور اس کے اقدار اس دنیا اور ان اقدار سے بالکل مختلف ہیں جو شیکسپیئر کی دنیا میں رائج تھے۔لیکن شیکسپیئر کی بڑائی اسی بات میں ہے کہ ہر زمانہ اس کے کلام کو اپنا آئینہ سمجھ کر پڑھتا ہے، اور شیکسپیئر کا کلام پھر بھی ہر زمانے کے لئے بامعنی رہتا ہے۔پھر جو بات شیکسپیئر کے لئے درست ہے وہ اقبال کے لئے درست کیوں نہ ہو؟ شیکسپیئر میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ شیکسپیئر اقبال سے برتر شاعر تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتنا برتر؟ اور اس برتری کو ناپنے کے پیمانے کیا ہیں؟ آخر کوئی تو بات ہے کہ سات سو برس پہلے کے رومی کو آج سارا مغرب اور بہت سا مشرق سر پر اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔یہ تو قطعاً غیر ممکن ہے کہ آج کے مغربی لوگوں کو رومی میں وہی معنی نظر آتے ہوں جو رومی کے معاصروں کو نظر آتے تھے۔تو پھر اقبال کے بارے میں ہمیں تردد کیوں ہو کہ آج کے نوجوان قاری کے لئے اقبال کو بامعنی کس بنایا جائے؟ ظاہر ہے کہ ہمیں وہی کرنا چاہیئے جو رومی کے ساتھ یا شیکسپیئر کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ہمیں اقبال کو اپنے طور پر پڑھنا چاہیئے، اس نام نہاد فلسفے، یا اعتقاد، یا پیغام کی خاطر نہیں جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے الا یہ کہ جو کچھ ہمیں ان لوگوں نے بتایا ہے جنھیں اقبال سے زیادہ مولانا حالی کے خیالات پر اعتقاد ہے کہ بقول حالی، شاعری کو اصلاح معاشرہ کا کام کرنا چاہیئے، ہمارے اخلاق درست کرنا چاہیئے اور ہمیں پیغام عمل دینا چاہیئے۔اقبال کے یہاں ان چیزوں کی تلاش میں اقبال کی

شاعری ہم سے ترک ہو جائے تو ہو جائے۔ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں، ہمیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

لیکن ابھی بعض معاملات اور بھی ہیں، ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے یہاں تشکیک نہیں، استفسار نہیں، داخلی الجھنیں نہیں۔ وہ ہماری آپ کی طرح عام انسان نہیں۔ان کا لہجہ پیغمبرانہ نہیں تو مبلغانہ ضرور ہے۔ہم جیسے عام لوگوں کو ان کا تیقن، ان کی تلقین بہت گراں گذرتی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ ہر بات کے بارے میں ان کی اور بس ان کی رائے صحیح ہے۔کہا جاتا ہے کہ اقبال کے سارے کلام میں ہمیں عام، گوشت پوست کا انسان نہیں، بلکہ ایک تجریدی انسان نظر آتا ہے جس کے ساتھ ہم ذاتی اور داخلی سطح پر معاملہ نہیں کر سکتے۔ یہ انسان غمگین نہیں ہوتا، وہ صرف برہم ہوتا ہے یا ایک طرح کی فتح مندیت یا Triumphalism مبتلا رہتا ہے کہ بس روز موعود آپہنچا۔ میرا کلام پڑھو اور فتح کی طرف گامزن ہو جاؤ۔

ان اعتراضات کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آپ نے اقبال کا کلام ٹھیک سے نہیں پڑھا، ورنہ آپ دیکھ سکتے تھے کہ اقبال کے یہاں بھی الجھن، استفسار، اور تشکیک ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر تشکیک وغیرہ شاعری کے لئے اتنی ہی اہم چیزیں ہیں تو پھر ہم رومی کو کہاں لے جائیں گے؟ کوئی شک نہیں کہ حزن اور حرمان و آرزو کے مضامین انسان کے جذبات کو متحرک کرتے ہیں اور دل کو بہت بھلے لگتے ہیں۔لیکن اگر صرف حزن و حرمان و آرزو ہی سب کچھ ہے تو پھر فانی اور میر میں فرق کیا رہا؟ اور اگر صرف داخلی واردات اور باطنی کوائف ہی سب کچھ ہیں تو پھر خدا نما سید علی غمگین حضرت جی دہلوی اور میر درد میں فرق کیا رہا؟ بیشک دونوں کے یہاں تصوف ہے، اور ممکن ہے کہ بطور صوفی غمگین حضرت جی صاحب کا مرتبہ درد سے بلند رہا ہو، لیکن وہ درد سے بڑے شاعر نہیں ہیں۔درد کے یہاں تصوف ہے اور تصوف کے سوا اور بہت کچھ ہے۔حضرت غمگین کے یہاں تصوف کے سوا کچھ نہیں۔

اسی طرح، تیقن اور تعقل کے مقابلے میں تشکک اور تحزن کے مضامین دل کو بلا شبہ بہت بھلے لگتے ہیں۔لیکن شک و ریب و استفسار کی وقعت اسی وقت تک ہے جب پوچھنے والے اور ڈھونڈنے والے کے دل میں درد بھی ہو۔اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بیدل کی طرح شاعر اپنے شک اور استفسار کے جذبات کی تجرید کر کے انھیں ان عمومی اور بڑی حد تک سرسری انواع (Categories) سے بلند کر دیتا ہے۔آج کل ایران میں فیشن ہے کہ غزل پر بھی عنوان دے

دیتے ہیں، مثلاً ''وفور شوق''، وغیرہ۔ لیکن اعلیٰ شاعری کسی ایک نوع میں منجمد نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً بیدل کے حسب ذیل اشعار کے لئے کوئی ایک عنوان کافی نہیں، اور نہ مناسب ہے ۔

از شکست رنگم آبِ روے شاہی دادہ اند
ہم چو موجم سر بہ سیر کج کلاہی دادہ اند
چشم باید واکنی ساغر بہ دست غیر نیست
نشۂ تحقیق از مہ تا بہ ماہی دادہ اند
قطرہ ہا تا بحر ساماں جوشِ اسرار غناست
ہر چہ را شائستہ ای خواہی نہ خواہی دادہ اند
بر حضیض طالع اہل سخن باید گریست
خامہ ہا را یک قلم سر در سیاہی دادہ اند
ناز بینائی دریں محفل تغافل مشربی ست
کم نگاہاں را برات خوش نگاہی دادہ اند
تا نفس باقیست بیدل پر فشان وہم باش
کوشش بے حاصلت چنداں کہ خواہی داہ اند

یہ صرف ایک غزل کے منتخب اشعار ہیں۔ کیا ان کے بارے میں کوئی ایک حکم لگ سکتا ہے؟ ہر شعر میں تشکیک، تیقن، تفتیش، شکوہ، خودنگری، آگاہی، حزن کے رنگ ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ بڑا شاعر کسی ایک نوع پر بند نہیں ہوتا اور وہ ہر صنف کی حدوں کو کچھ وسیع کرتا یا توڑتا پھوڑتا ہے، جیسا کہ ہم بیدل اور پھر اقبال کے یہاں دیکھتے ہیں۔ ان کے پہلے خاقانی نے فلسفیانہ شاعری کی حدوں کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ عسکری صاحب نے عبادت بریلوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ فلسفیانہ شاعری کی بلندی کو دیکھنا ہو تو خاقانی کو دیکھئے۔ بقول عسکری، اس میدان میں جان ڈن (John Donne) تو خیر کیا بیچتا ہے، خاقانی کے آگے لکریشیس (Lucretius) بھی ہلکا پڑ جاتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ خاقانی نے کوئی منظم فلسفہ نہیں پیش کیا ہے، جب کہ لکریشیس (Lucretius) کی طویل نظم Of the Nature of Things میں کئی فلسفیانہ نظاموں کا رد اور اپیقوری (Epicurean) فلسفے کی تائید کی گئی ہے۔ اس کے باوجود عسکری صاحب نے خاقانی کو لکریشیس (Lucretius) سے بہتر قرار دیا۔ یہ بھی خیال رہے کہ کولرج (Coleridge) نے لکھا

ہے کہ لکریشیئس(Lucretius) کی نظم میں جہاں فلسفہ ہے وہاں شاعری نہیں ہے، اور جہاں شاعری ہے وہاں فلسفہ نہیں ہے۔ اقبال پر خاقانی کے اثر کا اندازہ لگانے کے لئے صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اقبال نے خاقانی کا ذکر اپنے کلام میں کثرت سے کیا ہے۔ ہم اقبال کو محض شاعر کی حیثیت سے پڑھ سکتے ہیں، بلکہ پڑھنا چاہیئے ہی۔ اقبال کے یہاں شاعری پوری طرح فلسفے میں حل ہوگئی ہے۔ یہاں وہ کیفیت نہیں جس کی شکایت کولرج کو لکریشیئس کے بارے میں تھی۔ اقبال کو ان کی شاعری سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

ہمارے ادبی معاشرے میں ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ ہم اقبال سے بیک وقت دو طرح کی توقع کرتے ہیں۔ یا تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ کلاسیکی غزل کے شاعر کی طرح ان مضامین کو برتیں جو کلاسیکی غزل میں عام ہیں (کم سے کم اس کے بہترین نمونوں میں)، اور ان میں معنی کے نئے رنگ بھریں۔ دوسری طرف، ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اقبال شاعر سے پہلے فلسفی اور کسی جہان نو کے پیغامبر ٹھہرائے جائیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ دونوں باتوں میں تضاد ہے، بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح ہم ان تمام ادبی روایتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے اقبال کی زمین شعر کی آبیاری ہوئی ہے۔ ان روایتوں میں کلاسیکی غزل کے کچھ انداز شامل نہیں ہیں مگر ان میں وہ نیم رومانی، نیم مصنوعی روایت بھی شامل نہیں ہے جو ہم نے بخیال خود مغرب سے حاصل کی تھی اور جس کی رو سے شاعری "داخلی"، اور "ذاتی" جذبات پر مبنی ہوتی ہے۔ اقبال جن روایتوں کے امین ہیں ان میں بشمول دیگراں، فارسی کے سبک ہندی کی روایت، فلسفیانہ قصیدے اور فلسفیانہ مثنوی کی روایت بھی شامل ہیں۔ فلسفیانہ قصیدے اور مثنوی کی روایت میں تبلیغ شامل نہیں ہے۔ لیکن ہم اقبال کو مبلغ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور جب ہم ان خیالات کو اپنے لئے کافی نہیں پاتے جن کی تبلیغ اقبال کے کلام میں بظاہر نظر آتی ہے تو ہم اقبال سے جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ خاقانی نے اپنے قصیدے میں، مولانائے روم نے اپنی مثنوی میں، اور بیدل اور بھوپت رائے بیغم بیراگی نے اپنی متعدد مثنویوں میں آپ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش بالکل نہیں کی ہے۔ انھوں نے اپنے انکشافات اور مکاشفات کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مولانا روم نے جب مثنوی کے چھ دفتر لکھ کر ساتویں سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ ابھی باقی ہے، لیکن اندر سے باہر نہیں آرہا، تو اسی جگہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو ان کہا رہ گیا وہ بھی اس شخص پر منکشف ہو جائے گا جو "زندہ جان" رکھتا ہے۔

باقی ایں گفتہ آید بے زباں

در دل آں کس کہ دارد زندہ جاں

لہٰذا یہ لوگ مبلغ اور واعظ نہیں تھے، شاعر تھے۔ شاعر کو اس سے مطلب نہیں ہوتا کہ وہ کتنے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا ہے۔ اقبال کو بھی اسی طرح پڑھئے۔ ٹھیک ہے ان کی بعض باتیں آپ کو قبول نہیں ہوتیں، لیکن اس سے کیا، شاعری تو شاعری ہے۔ اقبال نے اپنے بارے میں کئی بار کہا ضرور کہ شاعری میرا مقصد کبھی نہیں رہا، لیکن شاعروں کی سب باتیں ہم قبول نہیں کرتے تو یہ بات بھی کیوں قبول کریں؟ وہ جس امت کے حکیم تھے وہ امت تو انھیں شاعر مانتی ہے۔

(۲)

اب ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لیں کہ آیا اقبال کا کلام فی الواقع ہمیں آج کی دنیا کے بارے میں، یا عمومی طور پر دنیا کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا؟ اقبال کے "پیغام" کے بجائے ان کی شاعری کو پڑھیں تو ہمارے بعض مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پہلی بات تو یہی کہ اقبال تنہا نہیں ہیں۔ وہ ہماری تہذیب کے بعض بنیادی مظاہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالب کے بغیر اقبال کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اور بیدل کے بغیر غالب کا امکان نہیں۔ اور عرفی اور فیضی وغیرہ کے بغیر بیدل کا امکان نہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی یہ عادت ترک کرنی ہوگی کہ اقبال کو تنہا، منفرد، اور اپنے اگلوں سے الگ کوئی شاعر سمجھا جائے۔ لطف یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اقبال پر ہر چھوٹے بڑے فلسفی کا اثر ڈھونڈنے میں بہت زور مارا ہے، لیکن یہ پوچھنا بھول گئے کہ اقبال کن شعری روایتوں کے پروردہ ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہند اسلامی تہذیب، اور بالخصوص اس کے اس اظہار کو سمجھے بغیر، جسے سبک ہندی کہا جاتا ہے، اقبال کی شاعری کی کلید ہمارے ہاتھ نہیں آسکتی۔

لیکن اقبال پر مغربی تہذیب بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ اس تہذیب کے پروردہ نہ سہی، مزاج شناس ضرور تھے۔ عسکری صاحب مرحوم اس بات پر بہت خوش تھے کہ مغرب میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ یہی انداز رہے تو نہ صرف یہ کہ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے کا نقشہ نظر آنے لگے گا، بلکہ صنم خانہ کعبے میں ضم ہو جائے گا۔ عسکری صاحب نے یہ بات کم و بیش چالیس برس پہلے کہی تھی۔ اور آج تو واقعی مغربی ممالک میں قبول اسلام کرنے والے مغربیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن ان کا جو حال مغرب میں ہو رہا ہے، اسے دیکھ کر عسکری صاحب کو بے حد مایوسی ہوتی۔ ایسے میں صرف اقبال کا شعر یاد آتا ہے۔ اقبال جانتے تھے کہ مغرب کی بنیادوں میں نسل پرستی بھی شامل ہے۔ اوپر اوپر چاہے جتنی زیادہ خوش

خلقی ہو، لیکن اقبال کے زمانے کے بہت بعد تک مغربی مفکرین کی رائے تھی کہ سفید اقوام باقی اقوام سے فطرتاً بہتر ہیں۔ اقبال نے کہا۔

اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

(''اشاعت اسلام فرنگستان میں'': ضرب کلیم)

جس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں، بلکہ کم و بیش تمام اقوام عالم کی نگاہیں روشن فکری (Enlightenment) سے خیرہ ہو رہی تھیں، صرف دو ہندوستانی ایسے تھے جو مغرب کی مادی ترقی اور ذہنی فتوحات سے مرعوب نہ ہوئے، ایک تو اکبر الہ آبادی اور دوسرے اقبال۔ اکبر الہ آبادی نے مغرب کو نہیں دیکھا تھا لیکن مغرب کے استعمار کو دیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جس روشن خیالی کے ڈنکے ہر طرف بج رہے ہیں وہ کچھ نہیں، صرف مغربی استعمار کو رائج اور نافذ کرنے کا ہتھکنڈا ہے۔ چنانچہ ان کا سارا کلام مغربی استعمار کی علامتوں کی قلعی اتارنے سے عبارت ہے، خواہ وہ تعلیم ہو خواہ مشینی مصنوعات کی ریل پیل، سب ایک ہی منصوبے کے حصے ہیں۔ اکبر کے صرف دو شعر سنیے۔

ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ
دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ
توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

اقبال نے بھی کبھی کبھی طنز کو اختیار کیا، لیکن ان کی روح کی تپش اور ذہن کی خلش انھیں اکثر ایسا اسلوب اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی تھی جس میں کچھ حکیمانہ رنگ بھی شامل ہو۔ لہٰذا اکبر کی بات کو انھوں نے یوں کہا۔

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب

سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

(''نصیحت'': ضرب کلیم)

''بانگ درا'' میں اقبال کی نظم ''مسلمان اور تعلیم جدید'' کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں ۔

شیدائی غائب نہ رہ دیوانۂ موجود ہو
غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر

......

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کے لئے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر

اور اس شعر کے بعد ملک قمی کے شعر پر وہ زبردست تضمین جو کسی اور کے شعر کو تخلیقی طور پر اپنا بنا لینے کی بہترین مثالوں میں سے ہے ۔

لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ہم لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ ٹی۔ ایس۔ الیٹ دوسروں کے مصرعوں اور فقروں کو اپنی نظم میں ضم کرنے کے فن کا بادشاہ تھا۔ لیکن بچارے الیٹ کو یہ ہنر کہاں نصیب کہ دوسرے کا پورا پورا شعر اٹھا لے اور اسے اپنی نظم میں یوں ضم کر لے کہ اصل شعر کے معنی بالکل بدل جائیں۔ کم لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اقبال نہ صرف یہ کہ تضمین میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، بلکہ انھوں نے تضمین کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے، مثلاً یہیں دیکھئے کہ تضمینی شعر کے پہلے مصرعے کو مضمن کیا اور اس طرح، کہ دوسرا مصرع مزید بامعنی ہو گیا۔ اس طرح کی تضمینیں اقبال نے اور بھی کی ہیں۔ اس کے علاوہ، مثنوی کے اشعار کو مثنوی یا کسی اور صنف کی نظم میں مضمن کرنا، تضمینی شعر کو پوری نظم کے آخر میں ڈال کر اسے اپنے حسب منشا بنا لینا، یہ سب طریقے بھی اقبال کی ایجاد ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں، جب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اچھے موضوعات کی کمی ہے، اقبال کی تضمینوں پر بہت اچھا مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔

اقبال کا یہ شعر سب کو یاد ہو گا ۔

عذاب دانش حاضر سے با خبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

("بال جبریل"، حصہ دوم، نمبر ۴۲)

لیکن اس بات پر کم لوگوں کی نظر گئی ہو گی کہ "عذاب دانش حاضر" سے دونوں طرح کے عذاب مراد ہیں۔ ایک تو یہ کہ دانش حاضر خود عذاب ہے، اور دوسرا وہ عذاب جو اقبال پر ٹوٹا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ ۔

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

......

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

("ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام": ضرب کلیم)

ممکن ہے اس میں کسی کو شک ہو، لیکن میرا خیال ہے کہ ان اشعار کے مخاطب اقبال بھی ہیں۔ مغربی تہذیب کے دو ایسے پہلو ہیں جن کا احساس سب سے پہلے شاید اقبال کو ہوا۔ ایک تو یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام دراصل انصاف اور انسان دوستی سے خالی ہے۔ دوسری بات یہ کہ روشن فکری نے خود مغرب کے لئے زبردست روحانی اور فکری بحران پیدا کیا ہے۔ اب تو آئیسیا برلن (Isaiah Berlin) جیسے فلسفی بھی ہیں جو روشن فکری کو مغرب کی تمام موجودہ برائیوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔ لیکن اقبال کے زمانے میں تو روشن فکری کا کلمہ پڑھتے لوگوں کی زبان سوکھتی تھی۔ اقبال اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ نو آبادیاتی نظام دراصل روشن فکری اور سرمایہ داری نظام ہی کا آوردہ ہے اور انھیں کی پشت پناہی کرتا ہے۔

اقبال کی بہت بڑی عظمت اس بات میں ہے کہ انھوں نے کثرت سے ایسی نظمیں کہیں جن

میں مختلف طرح کے افکار بیک وقت سمو دیئے گئے ہیں اور ان میں سے اکثر افکار آج بھی ہمارے لئے غور و فکر کا سامان رکھتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ اُن میں سے اکثر نظمیں استعارہ سازی، روانی، اور کمال بلاغت کی مثال ہیں۔ "بال جبریل" کی صرف ایک نظم "زمانہ" کو دیکھیں تو اس میں مختلف طرح کے افکار کو شعر کی زبان مل گئی ہے۔ زور کلام، استعارہ اور تمثیل کے وفور، اور مکاشفاتی انداز بیان کی بنا پر "زمانہ" صرف منظوم فکری منشور نہیں، بلکہ جدید اردو نظم کا دیباچہ بن گئی ہے۔ فلسفیانہ اور مابعدالطبیعیاتی مضامین سے بات شروع کرتے ہیں، کیونکہ اس نظم کا پہلا ہی شعر فلسفیانہ اور مابعدالطبیعیاتی ہے ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

اب یہ شعر ملاحظہ ہوں جس میں آج کی عالم کاری (Globalization) سے لے کر سیاست، تاریخ اور پس نو آبادیاتی صورت حال کا احساس، سب موجود ہیں ؎

نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ
شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

یہ آخری شعر مجھے کچھ بہت اچھا نہیں لگتا، کیونکہ اس میں تقدیر کا ذکر بے محل لگتا ہے۔ لیکن ممکن ہے یہ طنزیہ ہو اور اس کا متکلم زمانہ نہ ہو بلکہ تیسری دنیا کا ہم آپ جیسا کوئی فرد ہو۔ اقبال نے اس طرح کی ترکیبیں بہت استعمال کی ہیں۔ اب یہ شعر سنئے جس میں مغربی روشن فکری کا سب سے

بڑا جرم بیان کیا گیا ہے، وہ بھی ایسے زمانے میں جب برٹرنڈ رسل کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ کچھ دن پہلے سید حسین نصر نے مانچسٹر یونیورسٹی میں اپنے لکچروں میں یہ بات بہت وضاحت سے بیان کی ہے کہ مغربی روشن فکری کا سب سے بڑا عیب اس کا پندار (Hubris) ہے، کہ اس نے انسان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ کائنات کے سارے راز میری چٹکی میں بند ہیں۔اقبال کہتے ہیں ؎

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

یہی بات اقبال نے مدتوں پہلے ''بانگ درا'' میں ۱۹۰۸ سے پہلے کہی تھی، جب اشپینگلر (Oswald Spengler) اور اس کی کتاب (The Decline of the West) کا وجود بھی نہ تھا (۲) ؎

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

''زمانہ'' کے حسب ذیل شعر میں مغربی تہذیب کی اقتصاد پرست، خطر کوش اور غیر ذمہ دار ذہنیت کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ایسی تہذیب بہت دن چلنے والی نہیں ؎

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

نظم کے آخری شعر میں خسروانہ انداز رکھنے والے مرد درویش کو خود شاعر کی علامت کہہ سکتے ہیں، یا اس پوری عارفانہ شخصیت کی جس میں جہد و جہاد سے لے کر عرفان حق تک تمام عناصر حیات یکجا ہیں۔کوئی ضروری نہیں کہ یہ مرد درویش زمانۂ حال میں ہو یا ہمارے سامنے موجود ہو۔شعر میں صیغۂ حال استعمال ضرور ہوا ہے، لیکن یہ ڈرامائی صیغۂ حال بھی ہوسکتا ہے اور تاریخی صیغۂ حال (Historic Present) بھی۔ دونوں کا استعمال محمد حسین آزاد نے بھی '' آب حیات'' میں بڑی خوبی سے کیا ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

میر کا ایک شعر مجھے اکثر آج کے انسان کی واماندگی حال اور اس کے بے معنی سفرِ حیات کی روداد معلوم ہوتا ہے ۔

راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانند جرس
شور سا کرتے جاتے تھے ہم بات کی کس کو طاقت تھی

اس کے سامنے اقبال کا ایک عام سا شعر رکھئے جس میں جد و جہد حیات میں انسان کی کامیابی کا بیان ہوا ہے ۔

عشق تھا فتنہ گرو سرکش و چالاک میرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

میر کے بظاہر سادہ سے شعر میں معنی کے کئی پہلو ہیں۔اقبال کا شعر میر کی سی باریکیوں سے خالی ہے۔ لیکن دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر فن شعر کے عمدہ نمونے ہیں۔روانی میں دونوں ہی اپنی مثال آپ ہیں۔یہ صحیح ہے کہ آج کے فلسطین اور عراق اور صومالیہ کے زمانے میں انسانی خود اعتمادی کی تمثیل جو اقبال کے شعر میں ہے، مجھے ذرا شرمندہ کرتی ہے۔لیکن شاید اسی لئے ہمیں اقبال کی ضرورت آج بھی ہے۔کبھی کبھی خواب دیکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور وہ خواب سب سے اعلیٰ ہوتے ہیں جنھیں ہم شاعر کی آنکھ سے دیکھیں۔اسی لیے میں کہتا ہوں کہ کوئی کچھ بھی کہے لیکن اقبال کا اقبال بلند ہے اور بلند رہے گا۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) گانی اومیرو س لِد ینِ محمد۔ (مقالات شبلی، جلد چہارم ص ۱۸۹)۔

(۲) اشپنگلر کی کتاب کی جلد اول ۱۹۱۸ میں شائع ہوئی ،اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن اس نے ۱۹۲۲ میں شائع کیا۔دوسری جلد اگلے ہی سال ۱۹۲۳ میں شائع ہوئی۔ اشپنگلر کے نظریے کے مطابق جدید مغربی تہذیب کا کردار فاؤسٹ نما ہے۔ یعنی چودھویں صدی جرمنی کے ایک افسانوی کردار (Faust) کا سا مزاج رکھتا ہے۔ فاؤسٹ نے علم اور دولت اور اقتدار کی خاطر اپنی روح شیطان کے ہاتھ گرو رکھ دی تھی۔ اشپنگلر کا کہنا تھا کہ فاؤسٹ ہی کی طرح جدید مغربی تہذیب کو اقتدار اور علم کی ہوس اس درجہ ہے کہ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ فاؤسٹ کا انجام اچھا نہ ہوا اور مغرب کا بھی انجام اچھا نہ ہوگا۔

O

''غڑپ، غڑپ، غڑپ! بھیگا ہوا بچہ۔ عورت کی بھینچی آغوش میں... کانپتا بچہ... اسے سردی نہ لگ جائے...''

ہندوستان کے ایک سفر کی روداد ''اب کی بار'' (دنیا زاد ۲۱) کے انجام پر فہمیدہ ریاض نے اپنے نوجوان بیٹے کبیر کی حادثاتی موت کا مختصر طور پر ذکر کیا اور اس کے بعد بہت دن تک انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ۲۰۰۹ء میں ۷/اکتوبر کا دن آیا تو کبیر کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے ایک نظم کا آغاز کیا۔ پھر جیسے کوئی بندھ سا ٹوٹ گیا۔ وہ کئی دن تک اس کیفیت میں گرفتار رہیں اور متواتر یہ نظم لکھتی رہیں۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء کے اواخر میں یہ نظم انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دی اور خیال ظاہر کیا کہ یہ نظم بہت نجی واردات پر مبنی اور انتہائی ذاتی ہے، اس لیے مجھے اس کو پڑھ کر تلف کردینا چاہیے۔ میں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ میری رائے میں یہ نظم ایک نمایاں ادبی حیثیت کی حامل تھی، لیکن شاعرہ کو یہ اطمینان دلا دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر شائع نہیں ہوگی۔ نظم اپنی پہلی صورت میں جس طرح لکھی گئی تھی، اس کے بعد بھی وہ اس کو مزید لکھتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ نظم ایک اور سمت چل پڑی۔ شاعرہ کا خیال تھا کہ کہیں بیچ میں سے ایک اور نظم شروع ہوگئی ہے اور اسے علیحدہ کرلیا جائے۔ لیکن یہ نظم اسی صورت میں مکمل ہوئی۔ ایک شدید کرب کے عالم میں انہوں نے نظم کو لکھ لینے کے بعد تراش خراش کا کام کیا۔ اس عمل کے دوران نظم کی جو شکلیں تیار ہوتی رہیں، انھی میں سے ایک کا مسودہ انہوں نے اشاعت کے لیے منظور کیا۔ چوں کہ اس نظم کو پڑھنا یا اس کے بارے میں بات کرنا ان کے لیے بہت مشکل اور تکلیف دہ تھا، اس لیے انہوں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ اس کے بعد اس نظم میں قطع و برید کرتی رہیں۔ ''کبیر تم'' دنیا زاد ۲۶ میں شائع ہوئی تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ اس نظم کی آخری شکل نہیں ہے بلکہ درمیان میں سے کچھ حصہ چھوٹ گیا ہے۔ اگلے صفحات میں یہ نظم

اپنی تکمیل شدہ شکل میں شائع کی جا رہی ہے۔اس نظم کو مکمل کرنے کے دوران ہی انھوں نے ایک انتہائی مختلف حامل کی تحریر شروع کردی جو نثر میں اس دفتر کے معاملات سے انسپائر ہو کر لکھی گئی تھی جس سے وہ اس عرصے میں وابستہ ہوگئی ہیں۔ دفتر کے مسائل پر زبان و ادب اور رموزِ مملکت کے وسیع تر سوالات کا عکس بھی پڑتا ہے اور ان کے درمیان مصنفہ/ شاعرہ کی ذاتی واردات بھی شامل ہوتی جاتی ہے۔ یہ تحریر ''فعل متعدی'' کے نام سے دنیا زاد ۲۶ میں شائع ہوئی۔ ''طیراً ابابیل'' جسے آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے، اسی سے مسلسل ہے۔ جیسے بات سے بات نکلتی ہے، اسی طرح ''دفتر کا ایک دن'' ان پچھلی تحریروں سے پھوٹی ہے جن کو افسانے کے طور پر پڑھا جاسکتا ہے اور روداد کے طور پر بھی۔ قدرے مختلف مزاج کی حامل ''شکر'' میں افسانویت کا رنگ نسبتاً گہرا ہے، حالاں کہ روائتی افسانوں والے انداز سے پھر بھی خاصا مختلف۔ اس تحریر میں بھی شگفتگی نمایاں ہے جو فہمیدہ ریاض کی ان نثری تحریروں کی خصوصیت ہے۔

فہمیدہ ریاض افسانہ اپنی طور پر اور ایک نئے ڈھنگ سے لکھتی ہیں۔ مگر اُن کی انفرادیت اُن کی تنقید سے بھی نمایاں ہے۔ مکتبی اور مدرسانہ تنقید کی فروانی کے اس دور میں وہ اپنی پسند اور ناپسند کی کتابوں پر لکھتی ہیں اور یہ مضامین اُن کے تخلیقی سروکار سے جڑے رہتے ہیں۔ دوستوئیفسکی پر اُن کے مضمون سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ روسی ناول نگار اُن کے تخلیقی جوہر کو سمجھنے کے لیے ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

فہمیدہ ریاض

تم کبیر...

آج رات
میں نے سارے تلخ و نمکیں آنسوؤں کو پی لیا
جیسے پیتے ہیں دوا
میں نہیں روئی کبیر
گو رہی بیدار شب بھر
نیند آئی ہی نہیں
جب خیال آیا کہ اس دَم
اپنے بستر سے اُٹھے تم
اور اس پل جا رہے ہو گے
فقط دو سال پہلے
تیرنے، پانی کی سمت
اس گھڑی پانی کے اُوپر گونجتی ہو گی تمہاری چیخ
اس دَم
گھٹ رہی ہو گی تمہاری سانس
ساکت ہو گیا ہو گا بدن
اور وہ ساعت
کش مکش کا ہو گیا جب خاتمہ

اب تمہارے کاسۂ سر میں دماغ
بے حس و حرکت ہوا
لے چلا پانی تمہیں جیسے شجر کا ہوتنا
رو میں چکراتا ہوا
گرداب کی گہرائیوں میں لے چلا
سر ہلا کر میں نے جھٹکا ہر خیال
کرچیوں میں آئی ہر تصویر میرے سامنے
جان کر میں نے جنھیں جوڑا نہیں
میں نے دُہرایا نہیں ایک ایک لمحہ
جن کی میں گردان کرتی ہوں مسلسل
روز و شب
روز و شب

چلتی رہتی ہوں ہمیشہ اپنی چھت پر شام سے
روتے روتے، دل میں چیخیں ماتی
خاموش چیخیں
چاند تاروں کے تلے
ہیں جہاں برج حمل، برج اَسد
کہکشاں کے راستے
ہم نے دیکھا تھا اُنہیں، تم پاس لیٹے تھے مرے

میں کہ ہوں ایسے گرجتے گونجتے گرداب میں
کھینچتا ہے جو مجھے گہرائیوں میں روز و شب
روکتی رہتی ہوں خود کو
اک قدم کا فاصلہ ہے

اک قدم کا
ورنہ اس پانی کی غرّاہٹ سنو
کان میں آتی ہے جامہ چاک کرنے کی صدا
دیکھتی ہوں سوگواروں کی قطار
''کس طرح زندہ رہی پھر کیسے اپنی جان لی''

مرگ!
موت!
مدتوں سے اب یہ لفظ
لب پہ آسکتا نہیں
''کیوں مرے جاتے ہو'' کہہ سکتی نہیں
ایک دہشت کھینچ لیتی ہے مرے منہ میں زباں
یہ نہیں ہے لفظ، یہ کچھ اور ہے
میں نے دیکھا ہے اسے
لوگ اب کہتے نہیں یہ لفظ میرے سامنے

ایک ریگستان میں مورت کسی دیوی کی ہے
یا وہ کوئی دیوتا ہے
دھوپ میں تپتا ہزاروں سال سے
پرسکوں آنکھیں ہیں، ہونٹوں پر تبسم
رکھ کے مٹی پر گلاب
میں نے سوچا تھا میں اس کے پاس جاؤں گی ابھی
اس کو جھنجھوڑوں گی، کہوں گی
لال میرا کیا تری اندھی حفاظت میں نہ تھا؟
جس پہ مٹی ڈال کر آئی ہوں اپنے ہاتھ سے

جسم پر اس کے نہیں کوئی خراش
پھر یہ نچلے ہونٹ پر کیسا نشاں ہے سرخ سا؟
تیرنے میں اس کا چہرہ کیا کہیں ٹکرا گیا؟
ریشمی پلکوں کی صف رخسار پر سایہ فگن ہے
سو رہا ہے کیسی گہری نیند میں اتنے سکوں سے
دور سے آئی ہوں میں
دو سمندر کر کے پار
وہ تو اُٹھ جاتا تھا اک آواز پر
کیوں نہیں اب جاگتا
وہ تو میلوں چلتا رہتا تھا
کبھی تھکتا نہ تھا
لوگ کیوں کولی میں بھر کر لائے ہیں بیٹا میرا
ہو گیا بیمار کیا؟
میں نہ کہتی تھی نہیں رکھتے ہو تم اپنا خیال
اب نہ جانے دوں گی سردی میں کہیں
ٹھیک ہے وہمی ہوں میں، وہمی سہی

اس میں واپس سانس ڈال
خاک سے باہر نکال
کیا نہیں تھا مجھ سے کچھ وعدہ ترا؟
یہ بتا اے گونگے بہرے دیوتا!
ورنہ تجھ کو توڑ ڈالوں گی ابھی!
روند ڈالوں گی تبسم
جو ترے ان کھردرے ہونٹوں پہ ہے!

سال خوردہ، ٹوٹی پھوٹی مورتی
جھڑ چکی ہیں جس کے کانوں کی لویں
گھس گئی ہے نصف ناک
گرم ریتیلی ہوا کے جھکڑوں میں
ریت بن کر ریت میں مل جائے گی
اس سے کیا شکوہ کروں
اس سے کیا رنجش مری
الوداع اے دیوتا تو خوش رہے
الوداع!

آج رات
کھول کر اپنا دریچہ چاند بھی دیکھا نہیں
گھس گئی جس کی گگر
آج شاید سولہویں کا چاند ہے
جانے اس شب آفتاب کون سی منزل میں تھا
کیوں تمہارا زائچہ میں نے بنوایا نہیں
ایک شب دیکھا تھا میں نے چاند گہناتے ہوئے
کیا وہ راہو کے گلے میں پھنس گیا تھا؟
کیا ملی مجھ کو سزا؟

سب یقین میرے
گماں میرے
پگھل جاتے ہیں روز
کیا یقین ہے، کچھ نہیں چلتا پتہ
منتشر ہے ہر خیال

زندگی، اِک بددُعا

زور سے ہنستا ہے کون
''جا مرا منہ دیکھ لے اپنی جواں اولاد کا''
بس گئی ہے میرے اندر نیستی
جیسے وہ اس کے سرہانے تھی کھڑی
اور گئی مجھ میں سما
نحس ہوں میں، نحس ہوں
دور جاؤ، ویرتا!
میرے سائے سے بھی دور
تم مرے نزدیک اس معصوم بچے کو نہ لاؤ
اس پہ پڑ جائے نہ پرچھائیں مری
میرے اندر موت ہے
ایک مریخی چمک بالکل سیاہ
''زندگی'' کے نام سے شدت سے نفرت کر رہی ہوں
شراپ ہوں چاروں دشاؤں کے لیئے
بدشگونی کی بلا
ایسی عورت
جس کا بیٹا مر گیا، کڑیل جواں!!

ہیں نقوش ابھرے ہوئے ان گھومتے اطراف میں
جن کو میں پلکیں جھپک کر دیکھتی ہوں بار بار
جس طرح شیشے سے شبنم پونچھ کر
دیکھتی ہوں آر پار

کہر کا وہ ایک مرغولہ سپید
راستے کی اک چٹاں پر نرم بل کھاتا ہوا
میرا استقبال کرنے کے لیئے اُٹھتا ہوا
آ گئیں امی، کئی دن سے تمہارا منتظر ہوں
آ گئی میں، جان مادر
آ گئی، چندا مرے
میں بھلا کیسے نہ آتی
جب مجھے تم نے پکارا

''اس کے جوتے، اک قمیض
اور جو کچھ بھی کنارے پر ملا۔''
اک پولس افسر کا ہاتھ
مجھ کو نرمی سے تھماتا
کاغذی بھورا سا تھیلا، مہر بند
اور میرا اس سے کہنا
شکریہ!

گود میں رکھے اسے، چھاتی سے بھینچے
چومتی دیوانہ وار
روٹھتی منتی ہوئی، کرتی ہوئی باتیں ہزار
اتنے دن تک کیوں نہیں دیتے مرے خط کا جواب؟
یاد ہے، اک روز ہم تم ساتھ آئے تھے یہاں
دیکھو طیارے کے پیچھے ڈوبتا ہے آفتاب
سرخ ہے سارا اُفق
جانے اَب دن ہے کہ رات

ہم جہاں سے آئے ہیں
اور اب .....
ہم کو جانا ہے کہاں!

چلتے چلتے جب بہت تھک جاؤں میں
دیکھتی ہوں پھر تمہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے
دیوانہ پن؟ یا خودکشی؟
صاف میرے دل میں آتا ہے خیال
اے مری آنکھوں کے نور
یہ نہیں منزل ہماری
یہ نہیں!

گاہے گاہے دیکھتی ہوں نیم عریاں کائنات
واہموں سے ماورا کھلتا ہے اک بابِ طلسم
ہیں کہیں شمسی غبار، اک تجلی ہے سیاہ
جال مقناطیس کا چاروں طرف پھیلا ہوا

ان میں تم گھل مل گئے کیا؟
اشتیاق اور خوف سے
دل اچھلتا ہے مرا
ٹوٹتے تاروں میں ہیں جو سالمے نادیدہ وپُر اضطراب
جن سے کہتے ہیں زمیں پر زندگی پیدا ہوئی
ہیں وہی خوشبو میں ہیں جو مضطرب
جن سے پُر ہے یہ زمیں
ہے مہک اک گرم سی

آہن و فولاد میں
خاک میں اور آب میں
ہر مفرد اور مرکب کی جدا بو باس ہے

بن کے خوشبو
پاس میرے
آئے تھے کیا
تین بار؟
کیا وہ تم ہی تھے کبیر؟

یہ شجر یہ برگ و بار
نیلم و مرجاں سے پُر یہ کوہسار
یہ کہاں سے آ گئے اور کس لیے
اور ان کے درمیاں
لے کے وہ میٹھی ہنسی وہ پھول سے تازہ خیال
تم کہاں سے آئے تھے
اب تم کہاں ہو
جانتا کوئی نہیں
علم کی سرحد نہیں پہنچی وہاں تک
کھوج میں ہے آدمی
کچھ حقیقت کچھ قیاس
کیا ہے اس ریکھا کے پار

ہاں مگر ناقابل تردید ہے
وہ خوشی

جو گود میں بھر کر تمہیں مجھ کو ملی تھی
دیکھ کر مجھ کو ہنسے تھے ایک دن تم جس طرح
بھول سکتی ہی نہیں
اور یہ غم
جیسے کھُرچتا ہے کلیجہ کوئی ہاتھ
روز و شب
روز و شب

کیا خبر تھی اس طرح ممکن ہے جینا
سانس لینا، روز کی چکّی چلانا
بات کرنے بیٹھنا، ملنا ملانا
اور جیے جانے کا یہ زہراب پینا
روز و شب
روز و شب
اس طرح کیوں کر بسر ہو گی کبیر و؟

روتی رہتی ہے تمہاری ماں مگر
سوچتی ہے ساتھ ساتھ
کیا نکالے راستہ
ساتھ چھوٹے یہ تو اب ممکن نہیں
ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہے تمہارا
اور کنارِ آب دوڑی جا رہی ہے
بس بہت تیرے،
تمہیں اب کھینچ لانا چاہتی ہے
وہ تمہیں

اس آب وگل کے معجزے میں
پھر بسانا چاہتی ہے
کس طرح؟
جس طرح بھی بن پڑے!

سارے دن کرتی رہی تھی فاتحہ کا انتظام
گوشے گوشے میں اگر سلگا رہی تھی
چاندنی بچھوا رہی تھی
چاروں کمروں میں چھڑکتی تھی گلاب
اور پھولوں کی بچھاتی سرخ تازہ پتیاں
کس قدر مصروف تھی
اور کتنی حیراں
گر نہ یہ کرتی تو کیا میں آج کرتی
اج تو ہے سات اکتوبر کا دن
ٹھیک ہے جو کچھ کیا
بھر گیا ہے، دیکھ لو، گھر تمہارے نام سے
جو کیا سب نے تمہارا کام تھا
شادماں ہے گھر تمہارے کام سے

پڑھتا جاتا تھا کوئی قرآں بہ آواز بلند
دل کو عربی کا لحن اچھا لگا
اک زبان پر شکوہ!
گو سمجھتی تو نہیں، کیا ہے سمجھنے میں دھرا
دل تو پاتا ہے سکوں
دل کو جو اچھا لگے وہ سب بھلا ہے

ہے بھلی خوشبو اگر کی
اور بھلے ہیں چار قل
یہ بھلا لگنا بھی ہے کتنا عجیب!
لاکھ کوشش ہم کریں بھاتی نہیں ہے کوئی شے
اور بنا کوشش کوئی شے دل کو لگتی ہے بھلی
بے شبہ ہم میں وہ کچھ آباد ہے
اس قدر با اختیار
ہم سے جو آزاد ہے

کہہ کے اچھے اسم سارے
پڑھ کے پاکیزہ کلام
لوگ رُخصت ہو گئے
گھر اکیلا ہو گیا پھولوں بھرا
کیسا پیارا ایک گہوارہ نہایت بے نظیر
وہ رہا کمرہ تمہارا
اس جگہ سوتے تھے تم
اس میں اب ہم تم رہیں گے
کیوں کبیر!

اے کہ تو مجھ میں ہے اور مجھ سے رہا
ہوش ہے جب سے سنبھالا، جانتی ہوں میں تجھے
اے کہ تو پاکیزہ ہے
اے مرے عطرِ وجود
ہے مرے، آلودہ و لا انتہا باطن میں پنہاں
اے مری دلدل میں گوہر آبدار

علم ہے جس کو مرے ظاہر کا میرے غیب کا
رُوح کے ایک ایک پیچ وخم سے واقف
ہے مرا اچھا برا تجھ پر عیاں
کوئی ننھی سی ہوئی گر بھول چوک
تجھ سے پوشیدہ نہیں اے سخت گیر
ہو مگر کیونکر یقیں سے اس کے ہونے پر مجھے
جس سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو
سامنے رکھتا ہو میری رُوح کے جب آئینہ
اے کہ تو ہر دسترس سے ماورا
عزت وعصمت ہے میرے پارہ پارہ نفس کی

رقص میں آتا ہے جب انساں کو کرتا ہے عطا
ظلم سے لڑنے کی قوت
جس کو سچ سمجھے وہ کہہ سکنے کی جرأت
جو صحیح مانے وہ کر جانے کی ہمت
اس طرح سود وزیاں سے بے نیاز
جیسے عالم کیف کا
جیسے اک گہرا نشہ

آہ میں مجبور اِک انسان ہوں
ہے حرارت سے اُٹھا جس کا خمیر
سرکشیدہ ہے جو شعلے کی طرح
یوں تو وہ مسرور ومست
خاک پر بچھ جائے پانی کی مثال
ہاں، مگر اپنی غرض کے واسطے

ایک حد تک عجز کر سکتا ہے وہ
جس کے بعد آتا ہے اِک ایسا مقامؔ
قابل ترجیح ہے اس کے لیے دیوانگی

مجھ سے کہتا ہے کبیر
یہ نہیں منزل ہماری
یہ نہیں

اے مرے بھیتر کے جادو
اے مرے اندر کی خوشبو
جو اندھیرے میں دِکھا دیتی تھی مجھ کو راستہ
دَب گئی ہے، چھپ گئی ہے تو کہاں!
گڑگڑاتی ہوں پڑی ہوں خاک پر
ہے مری اوقات تجھ پر آشکار
جو پڑا ہے مجھ پہ غم اِتنی سکت مجھ میں نہ تھی
دیکھ مایوسی مری
دیکھ میرا اضطراب
ہاتھ ہیں خالی مرے
ہے کہاں میرا کبیر
نقش جس کا دھیرے دھیرے مٹ رہا ہے خاک میں
وہ ہے میری ٹوٹی پھوٹی زندگی بھر کی متاع
کرب سے دُہری ہوئی جاتی ہوں میں
آمدد کو میری آ
اے ہجوم شر میں غلطاں خیر کی ننھی کرن
تو کہاں سے آ گئی ہے؟ کیا ترا اسرار ہے؟

تیرے پرتو سے منوّر تھی کبیر کی جبیں
چومتی تھی جس کو میں
چومتی تھی تیرا حسن

کون ہے اور کیا ہے تو مجھ کو نہیں پورا پتہ
تو نہیں تخلیق میری
مجھ میں از خود آ گیا
کیا ہے تو ثمرہ ہزاروں سال کی تہذیب کا
اور اس قرنوں سے جاری زیست کا؟
حاصل انسانیت
آہ یہ انسانیت، تاریخ کے یہ جانور
جن کی باچھوں سے ٹپکتا ہے لہو
نور تیرا اس کثافت سے چھنا؟
دھیرے دھیرے
رفتہ رفتہ
ارتقاء در ارتقاء
قلب انساں میں کیا تو نے ظہور
جدل میں اضداد کی مضمر ترا اِسرار ہے؟
کیا یہی ہے تیرے جلوے کی ادا؟

اے کہ تو "کچھ بھی نہیں"
اے کہ "بے تعداد" اور "قبل از شمار"
تجھ کو لوگوں نے کہا
جس میں ہم کچھ بھی بڑھا سکتے، گھٹا سکتے نہیں
تجھ کو سناٹا کہا جس میں ہوا خود مرتعش

مُنھ میں دُم اپنی دبائے سانپ میں دیکھا تجھے
نیش عقرب میں کیا تجھ کو شناخت
اور کبھی مچھلی میں دیکھا معجزہ

اے تحیر آفریں سربستہ راز
تجھ سے کچھ کم تو نہیں حیران کن
جو تعاقب تیرا انساں نے کیا

ارتقا در ارتقاء!

اے مکمل تیرگی سے بننے والی روشنی
کیوں نظر آتی نہیں اب کیوں نظر آتی نہیں
دیکھ میرے تیرہ باطن کا دُھواں
جس کے ہونٹوں پر تبسم
جس کا چہرہ پر سکوں
میرے ریگستاں کی مورت
عکس تھا جس میں ترا

مہرباں ہو مہرباں
اے کہ تو ہے ذہن میں میرے تخیل کی سکت
جس سے تو پیدا ہوا
اے مرے دل میں ارادے کی نمود
اے مرے گم گشتہ راز

نام ہیں تیرے ہزار
اے مرے حصے کے نام
اے مرے اللہ مجھ پر رحم کر!

فہمیدہ ریاض

نئی ڈکشنری

بناتے ہیں ہم ایک فرہنگِ نو
جس میں ہر لفظ کے سامنے دَرج ہیں
وہ معانی جو ہم کو نہیں ہیں پسند
جرعۂ تلخ کی مثل پی جائیں گے
اَصل کی اَصل جو بس ہماری نہیں
سنگ سے پھوٹتا آبِ حیواں ہے یہ
جو ہمارے اشارے پہ جاری نہیں

ہم فسردہ چراغ، اِک خزاں دیدہ باغ
زخم خوردہ اناؤں کے مارے ہوئے
اپنی توصیف حد سے گزارے ہوئے
اپنے ہر زخم کو ہر گھڑی چاٹتے
دبلیاں زہر کی چار سُو بانٹتے
دوسروں کے لیے صرف نفرت لیے
خشک ہونٹوں پہ حرفِ حقارت لیے
جو اِک خلا ہے جہاں اس کو بھرتے نہیں
چار آنکھیں حقیقت سے کرتے نہیں

کامراں ہو چکے ہیں نہ کل اور نہ آج
مرض پیارا ہو گر کیا کریں گے علاج
کیوں گریزاں رہے، ہم سے روٹھی رہے
آنے والے زمانوں کی صد رنگ ضو
کیوں بنا لیں نہ ہم ایک فرہنگِ نو

اس اندھیرے کنویں سے نکل آئیں گر
چند قدموں کا ہے اِک کٹھن راستہ
بے کراں وسعتیں ڈھونڈتی ہیں ہمیں
روشنی ہے جہاں، پو پھٹنے کا سماں
ایک شاداب وادی ہے چاروں طرف
سانس تازہ ہواؤں میں لیں گے وہاں

اپنے چہرے سے دھو دیں گے گردِ ملال
وقت کا کھیل ہیں سب عروج و زوال
وقت کے آینے میں جو تصویر ہے
اِس میں شامل ہیں ہم خوش وضع باکمال
دل ربا خال و خد دیکھ پائیں گے ہم
اس گلستاں کے ہر ایک مہمان کے
روبرو ہوں گے ہم اصل اِمکان کے
جس کے آگے برابر ہیں میں اور تو
جس کی نظروں میں یکساں ہیں ہم اور وہ
بناتے ہیں ہم ایک فرہنگِ نو

فہمیدہ ریاض

طیراً ابابیل

نئے ہفتے کا پہلا دن سب سے مشکل تھا۔ دفتر میں، چھ افراد پر مشتمل ایک پوری ٹیم اس کی منتظر تھی۔ نئی ڈکشنری کا پراجکیٹ شروع ہو چکا تھا۔ افسر خاتون سے فرمائش کی گئی تھی کہ پہلے وہ نئی ڈکشنری کے ''اُصولیات تالیف'' بتائے۔

''اصولیات تالیف، یاخدا!'' اس نے دل ہی دل میں سر پیٹ کر کہا تھا۔ ''میرے فرشتوں کو بھی کسی نئی، یا پرانی ڈکشنری کے اُصولیات تالیف کا بھلا کیا پتہ؟''

''پرانی ڈکشنریوں کے اُصولیات پڑھ لیجیے۔'' اس نے کہا تھا۔

''لیکن یہ تو نئی ڈکشنری ہے۔ یہ مختلف ہوگی، یہی تو ہمارا دعویٰ تھا، اسی پر تو پراجکیٹ ملا ہے۔''

عورت نے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا جو بہرحال قمیض سے ڈھکا ہوا تھا۔ ''یا پیٹ!'' اس نے سوچا۔ ''تیری خاطر میں نے ڈکشنری بنانے کی ملازمت کرلی!'' یہ ملازمت اسے ایک اچھی انگریزی میں لکھی ہوئی درخواست کی بنا پر دی گئی تھی، بلکہ دے ڈالی گئی تھی۔ اس احتمال کے ساتھ کہ اُردو تو اسے خوب آتی ہی ہوگی۔ پیٹ پوجا کے چکر میں اس نے کبھی ایک بائی لنگوئل ڈکشنری پر تھوڑا سا کام بھی کیا تھا۔ لیکن اُردو کی ڈکشنری! یا اللہ! یہ تو ایک بالکل دوسری دنیا تھی۔

"ہم نے جو دعویٰ کیا ہے۔ یعنی دعوے کی جو تفصیل ہے، اسے پڑھ کر اس کے مطابق بنانا شروع کر دیجیے۔ دس بارہ صفحات کے بعد دیکھیں گے کہ ہم نے کیا کیا ہے۔ وہ ہی ہمارے اُصولیات ہوں گے۔ پھر وہ ہم لکھ لیں گے۔" اس کے دماغ نے تیزی سے کام کرتے ہوئے اسے بجھایا تھا۔ یہی بات اس نے ٹیم کو بتا دی تھی۔ انہوں نے سو پچاس صفحات پر کام کر کے نئی ڈکشنری

کے چار صفحے بنا ڈالے تھے۔ اور آج ...... آج اسے ان پر بات چیت کرنی تھی۔ ڈسکشن! جو دراصل بحث نہیں ہوتا۔ بحث کا کیا سوال؟ تبادلۂ خیالات؟ ایک بنائی ہوئی ترکیب جو دراصل اس کے کلچر میں نہیں ہوتا۔ مخالفت ہوتی ہے، جو بحث بنتی ہے اور پھر اس کے بعد ہوتی ہے لڑائی۔ ہا ہا ہا۔ عورت نے سوچا تھا۔

چہرے کو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے چائے کی پیالی کا پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ اگر میں آج نہ آتی؟ شہر میں ہر طرف قتل کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ جانے کب سے چل رہا تھا یہ سلسلہ، عاشورہ کے روز خودکش دھماکے سے تعزیتی جلوس میں چالیس سے زیادہ مرد عورتیں بچے جاں بحق ہوئے، یہ کوئی مہینے بھر پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد ہر روز منتخب افراد کو گولی مار کر ہلاک کرنے کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ رات اس کے ایک دوست نے فون پر کہا تھا کہ شہر میں افواہ گردش کر رہی ہے کہ کل وارداتیں پوری شدت سے ہوں گی اور یہ کہ وہ احتیاط کرے۔ صبح عورت احتیاطاً تھوڑی دیر بستر میں لیٹی رہی تھی، پھر عاجز آ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ خودکش دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ تو ختم ہونے والا نظر آتا نہیں۔ تو پھر کیا ہاتھ پیر توڑ کر گھر بیٹھ جایا جائے؟

باہر سے پھیری والے کی آواز آ رہی تھی۔ ”لے لو آلو مٹر ٹماٹر، گاجر“ آخر یہ کیوں نہ ڈرا؟ اس نے سوچا تھا۔ سبزی منڈی سے ٹھیلہ بھر کر آیا ہوگا! کراچی کے شہری سرعت سے ناگہانی موت کے امکان کے عادی ہو گئے تھے اور اپنے اپنے کام سے لگے رہے تھے۔ پس وہ بھی مُنھ پر چھپکا مار کر دفتر آ گئی۔

تو ایسے، بسم اللہ! اس نے ٹیم کے ارکان سے کہا جو اس کے دفتر میں آ چکے تھے۔ ان کے چہروں پر ہمیشہ ایک دُھندسی چھائی رہتی تھی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ صرف کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں ایک چمک کا شرارہ نظر آتا تھا۔ ان میں زیادہ تر باریش تھے۔ عورت کے سامنے سیاہ اور کھچڑی، گھنی اور پتلی داڑھیوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ڈسکشن کرنے کے لیے وہ گویا اپنے زمین دوز تہہ خانے سے نکل کر آئے تھے۔

”تو چلیے۔ بسم اللہ۔ الف مقصورہ“ اس نے بہ آواز بلند کہا اور سوچا کہ اس الف سے کوئی قصور ہوا ہوگا۔ جب کہ الف ممدوحہ نے بڑے اچھے کام کیے ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔ اس کامیاب خیال پر وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔ تب ٹیم کے ایک ممبر نے کہا، ”ممدودہ نہیں ممدوء۔ حائے حطی نہیں اس لفظ میں۔“

''نہیں ہوگی......'' اُس نے شرمندہ ہو کر کہا۔ سب سے پہلے وہ ''اب'' تک پہنچے۔
''ماخذ لکھ رہے ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔
''جی ہاں۔ سب سے پہلے لکھ رہے ہیں۔''
اب کے آگے درج تھا، ''قدیم آریائی۔''
قدیم آریائی؟ یعنی سنسکرت سے بھی پرانا؟ عورت نے حیرت سے کہا۔
کمرے میں موجود سب لوگ مبہوت ہو کر اب کو دیکھتے رہے۔ اس کا اوّلین تلفظ ''اَو'' سامنے لکھا تھا۔ ہزاروں برس سے یہ ہندوستانیوں، اور اب پاکستانیوں کے ساتھ لگا چلا آ رہا تھا۔ حیرت انگیز اب! ماضی کے سارے ملبے کو چیرتا پھاڑتا، طوفانوں، زلزلوں، آتش زنی سے بچ نکلتا۔ جب کہ پہاڑ ڈھے گئے تھے اور اب باقی تھا۔ کسی قدیم، دھندلائے ہوئے، مدفون ماضی کی یادگار...... ''میں تھا...... میں ہوں۔'' کہتا ہوا۔ کون کہتا ہے پتھر آدمی سے زیادہ دیر پا ہیں! انہوں نے سوچا تھا۔ پتھر ٹوٹ گئے ہیں، آدمی کے نطق سے بنا لفظ باقی ہے۔ یہ کہاں تک ہمارے ساتھ چلے گا؟ کون کہہ سکتا ہے! تہذیبیں مٹ جائیں گی۔ خاک ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے اب کپڑے جھاڑ کر نئے آنے والوں نئے لوگوں کی زبانوں پر دوبارہ دوڑتا پھرے، شاید وہ شکل بدل لے۔
اب! جس کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ دن میں سینکڑوں بار تو اسے کہتے ہوں گے۔ اس قدر قدیم اب کی خاطر وہ انجانے میں احتراماً چند لمحے خاموش رہے، پھر عربی کے ابّ اور ابّ وجد کو جھک جھک کر آداب و تسلیمات کرتے آگے بڑھے۔
''ابتاج آپ نے نہ ڈالا؟'' افسر عورت نے پوچھا۔
''نہیں۔'' انہوں نے کہا۔
''گڈ'' عورت نے کہا۔ ''یہ لفظ اب اردو میں کوئی استعمال نہیں کرتا، لیکن پھر ابتسام کیوں شامل کر لیا؟''
داڑھیاں مسکرائیں، مگر خاموش رہیں۔
''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہ تھی۔'' ایک نے کہا۔
''تھی! تھی؟'' دوسرے نے کہا۔ ''دیکھیے جب لوگ بچے کا نام رکھنے کے لیے ڈکشنری دیکھیں گے تو...... یہ الفاظ تو ہونے چاہئیں۔''
''بچے کا نام رکھنے کے لیے وہ ہماری بڑی والی ڈکشنری دیکھ لیں۔'' عورت نے خیال آرائی

کی۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ ابتہاج اور ابتسام دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں۔ دو ننھے منے کھلنڈرے بچے جو کسی گیند کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں اور اس نئی ڈکشنری میں داخل ہو گئے ہیں۔

اپنے بے قابو تصور کو لگام ڈال کر عورت نے کہا۔

''دیکھیئے رُول آف دی تھمب یہی رکھیں کہ جو الفاظ ۱۹۰۱ء سے اور اس کے بعد چھپی ہوئی کتابوں میں موجود ہیں، بس وہی رکھیں گے۔''

بات یہ تھی کہ یہ ادارہ باوا آدم کے زمانے سے اُردو میں استعمال ہونے والے الفاظ کی ایک بائیس جلدوں والی ڈکشنری پہلے ہی بنا چکا تھا۔ اب منصوبہ یہ تھا کہ ایک مختصر ڈکشنری بنائی جائے جو محققوں کے علاوہ دوسروں کے بھی کام آسکے۔ منصوبہ ایک جلد کی ڈکشنری کا تھا، لہٰذا کثیر تعداد میں تراکیب اور الفاظ تو چھوڑنے ہی تھے۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ ڈکشنری کو بالکل جدید طرز پر بنایا جائے گا۔ یعنی جیسے انگریزی، فرانسیسی وغیرہ کی جدید ڈکشنریاں ہوتی ہیں۔ دعوے میں ''یوزر فرینڈلی'' قسم کے الفاظ بھی لکھے گئے تھے۔

جب اس نے یہ تجویز رکھی تھی کہ یہ جنزل آئیڈیا لینے کے لیے کسی قسم کے لفاظ کو چھوڑا جا سکتا ہے، ٹیم کے سب ممبران (اور وہ خود) انگریزی کی قدیم ترین اور جدید ترین ڈکشنری کے دس بارہ صفحات کا تقابلی مطالعہ کریں تو ان میں سے ایک نے لال پیلا ہوتے ہوئے اور اکبر کی طرح غیرت قومی سے زمین میں گڑتے ہوئے کہا تھا۔

''گویا ہم ان کی نقل کریں؟ مکھی پر مکھی ماریں؟''

''تو پھر آپ کوئی راستہ بتائیں؟'' عورت نے کہا تھا۔

چھ کارکنوں نے چھ راستے بتائے تھے۔ حاصل ان کا یہی تھا کہ کوئی لفظ چھوڑا نہیں جا سکتا۔ انہیں تمام الفاظ سے شدید جذباتی لگاؤ ہو چکا تھا۔ گفتگو کا حاصل یہی تھا کہ پرانی ڈکشنری کو پورے کا پورا دوبارہ لکھ ڈالا جائے۔

تو یہ خاتون ان سے کچھ کم جذباتی نہ تھیں، لیکن پریکٹیکل ہونا بھی تو کوئی چیز ہے دُنیا میں...... ''ہم نقل نہیں کر رہے ہوں گے، لیکن سیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا بھی تو پڑتا ہے۔'' اس نے بیچارگی سے کہا تھا۔ پھر اسے ایک کارگر مثال یاد آئی تھی۔ ''آپ ہمارے ایٹم بم ہی کو دیکھ لیجیے۔ کیا اس کا نسخہ ہالینڈ سے نقل کر کے ایک کاغذ کا کارتوس بنا کر پاکستان اسمگل نہیں کیا گیا تھا؟ اور

اب دیکھیے کہ اس نقل کے باعث ہم کیا سے کیا ہو گئے ہیں!" مجال ہے کہ دشمن میلی آنکھ سے اب ہمیں دیکھے۔"

''وہ اور بات تھی اور یہ اور بات ہے۔'' انہوں نے کہا۔

اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکی تھی۔ بات تو واقعی وہ اور تھی یہ اور ہے۔

''ہندوستانیوں کو ہی لیجیے۔'' اس نے انہیں راضی کرنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "مار روسیوں کے ٹینکوں وغیرہ کو نقل کر کر کے دھڑا دھڑ ٹینک بنا رہے ہیں۔ بنا رہے ہیں کہ نہیں؟"

اس مثال سے وہ زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ جو کچھ دشمن کرتا ہے وہ کرنا مباح بلکہ عین شریعت ہے کہ اُصول کے مطابق وہ انگریزی ڈکشنریاں پڑھنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور پھر تو کام تیزی سے چل نکلا تھا۔

اچانک انہیں ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ سب کے سب چونک پڑے۔ ''یہ...... یہ کیا ہوا؟'' چند لحظوں بعد عورت نے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' دروازے پر کھڑے نائب قاصد نے بتایا۔ ''ایک دروازہ ذرا زور سے بند ہو گیا۔''

''افوہ!'' انہوں نے کہا۔ ان کی جان میں جان آئی۔ وہ خوب ہنسے۔ انہوں نے پانی پیا، جب ان کے بلّیوں اُچھلتے دل قرار پر آئے تو عورت نے سب کے لیے چائے منگوائی۔ اب وہ آگے چلے۔

ابابیل سے وہ سرسری گزر رہے تھے کہ عورت کو اچانک خیال آیا۔ نہ جانے کب سے اس کے ذہن میں ایک خلش سی تھی جو اس نے کہہ ڈالی۔

''دیکھیے انگریزی ڈکشنری میں ہر پرندے پھول، درخت وغیرہ کے ساتھ لاطینی میں اس کی اصل نسل وغیرہ درج ہوتی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم بھی ڈکشنری استعمال کرنے والے کو کسی بھی لفظ کی بہترین معلومات دیں گے۔ کیا ہم یہ سائنسی توضیح ان ناموں کے ساتھ شامل نہیں کر سکتے؟''

''سائنسی توضیح کہاں سے لائیں؟'' انہوں نے کہا۔

''پلاٹس میں دیکھیے۔'' کسی نے مشورہ دیا۔ پلاٹس میں ابابیل کا چھوٹا سا مطلب Swallow لکھا تھا۔ اس کی سائنسی توضیح جدید انگریزی ڈکشنری میں موجود تھی۔ کوئی لاطینی نام تھا۔

عورت سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔ اس نے کہا، ''بھائیو۔ یہ کوئی انگریزی چڑیا ہے۔ زمین کے

مختلف حصوں میں ایک سے چرند پرند نہیں ہوتے۔ ہندوستانی ابابیل وہ نہیں ہوسکتی جو انگلستان کے مرغزاروں میں اُڑتی پھرتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اُن کا کوا کچھ اور ہے اور ہمارا کوا کچھ اور...... میں نے خود دیکھا ہے۔"

"تو نسل میں جو فرق ہے، جغرافیائی...... وہ ہمیں بتانا چاہیے نا۔"

اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا...... وہ ابابیل کے مختلف اندرجات غور سے دیکھنے لگی، یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی کہ توضیحات میں قرآنی آیت کا ذکر تھا کہ اُردو میں ابابیل کی تقریباً مقدس حیثیت ہے کہ کنکریوں کی بارش سے اس نے ابرہہ کے لشکر کو مجروح کر دیا تھا جو خانۂ کعبہ پر یورش کرنے کے ارادے سے نکلا تھا۔ ابابیل کا ماخذ عربی درج تھا۔

"گڈ" اس نے کہا۔ "یہ اہم توضیحات ہیں، انہیں ضرور شامل ہونا چاہیے۔"

وہ سب داڑھیوں میں مسکرائے۔ انگریزی میں Swallow کے ساتھ ضرب المثال لکھی تھی۔ "ون سوالو ڈز نوٹ میک سپرنگ۔" یہ پڑھ کر انہوں نے کہا۔ گویا بہار کے آغاز میں یہ پرند آتے ہوں گے۔ یوں سمجھیے کہ سردیوں کے اختتام پر...... دیکھیے یہ ہم نے بھی لکھا ہے۔ اس کا نام ابابیل کوچی ہوتا ہے۔ یعنی جو آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔

عورت نے ابابیل کوچی کے معنی دیکھے۔ "سیاہ پرند، جس کے پر دولخت ہوتے ہیں اور گردن پر سرخ ڈوری ہوتی ہے یہ سردیوں کے آغاز پر شہروں میں آتا ہے۔"

"لیکن انگریزی پرندہ سردیوں کے آغاز میں نہیں، گرمیوں کے آغاز پر آتا ہے۔"

عورت نے غور کرتے ہوئے کہا۔ یہ دو مختلف پرندے معلوم ہو رہے ہیں۔ ان کے عادات وخصائل جدا ہیں۔ "سیر الطیور میں کوئی نسل نہیں دی گئی۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"وہ جو دس بارہ برس پہلے ایک انگریز نے کتاب لکھی تھی۔ "پاکستانی پرندے؟" وہ ہے لائبریری میں"

"وہ تو نہیں ہے۔"

تو فوراً منگوا لیجیے۔ مفید معلومات ملیں گی، بلکہ درختوں، پھولوں کے بارے میں جو نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ سب بھی منگوا لیجیے۔" پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "سب انگریزوں کم بختوں نے لکھی ہوں گی وہ بھی۔" پھر اسے یاد آیا...... "وہ جو ایک برڈ واچر ہیں انڈیا میں...... کافی مشہور...... تو انہوں نے کوئی کتاب لکھی ہو تو منگوا لیں۔"

انڈین کے نام سے ان کے چہروں پر تذبذب پھیلنے لگا۔

''بھئی وہ مسلمان ہیں۔'' عورت نے تسلی دی جس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

''ویسے نام ان صاحب کا کیا تھا۔ خیر نیٹ سے نکال کر بتا دوں گی۔'' عورت نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس کے نیٹ کے استعمال پر یہ ٹیم مرعوب رہتی تھی۔ اس بات سے عورت کو بہ یک وقت اطمینان، افسوس اور شرمندگی ہوتی رہتی تھی۔

ابابیل کے ضمن میں آگے ابابیلیہ بھی تھا۔ ایک ایسا کبوتر جس کے پر اور دُم ابابیل سے مشابہہ اور ہم رنگ ہوتے ہیں۔

''ہم م م...... '' عورت نے کہا۔ ''بہت خوب!'' لیکن اب اس کے دماغ میں مزید جغرافیائی اُلجھنیں آ چکی تھیں۔ ''اس نے کہا۔'' ہندوستانی یا پاکستانی پرندے...... ضروری نہیں کہ عرب سرزمینوں پر بھی ہوں یا بلکہ نہیں ہوتے۔ یہ ہمارے جنگلات کے باسی ہیں۔ اچھا دیکھتے ہیں عربی ڈکشنری میں ابابیل کے لیے کیا لکھا ہے۔''

عربی ڈکشنریاں لائبریری سے فوراً منگوائی گئیں۔ دس پندرہ منٹ کی ورق گردانی کے بعد بھی کمرے میں سناٹا تھا۔ لغت نویسوں کے چہروں پر عجب پریشانی طاری ہو چکی تھی۔

''کیوں؟ کیا لکھا ہے؟'' عورت نے پوچھا۔

انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ عجیب بات ہے میڈم...... عربی میں تو اس نام کا کوئی پرندہ ہے ہی نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' عورت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''کیا یہ لفظ ہی نہیں؟''

''لفظ تو ہے۔ یہ ببل کی جمع ہے۔ اور ببل کا مطلب ہے گروہ یا جھنڈ، پرندوں، چوپایوں کا......''

''اور وہ جو قرآن شریف میں ہے کہ......'' عورت نے ہکلاتے ہوئے آیت یاد کی۔

''وہی...... طیراً ابابیل''

''جی ہاں'' ایک عربی داں لغت نویس نے کہا۔ ''یعنی پرندوں کا جھنڈ۔''

''اور قرآن میں یہ نہیں ہے کہ وہ کون سے پرندے تھے؟'' عورت نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔

''جی نہیں...... یہ نہیں بتایا گیا ہے۔ عربی لغات کی روشنی میں تو بات واضح ہے۔''

چند منٹ تک کمرے میں خاموشی رہی۔ لغت نویس اور ان کی افسر عورت ساکت وصامت،

حیرت اور کچھ مایوسی میں غرق تھے۔ آخر افسر عورت نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"اور میں...... ساری عمر سمجھتی رہی کہ وہ ابابیلوں کا لشکر تھا جس نے ابرہہ کی فوج پر کنکریاں برسائیں۔"

"صرف آپ ہی نہیں، آپ کے ابّ وجد اور ان کے ابّ وجد نے بھی ایسا ہی سمجھا۔" کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ "جب غیر عربوں نے قرآن کریم پڑھا تو ابابیل کو ایک چڑیا سمجھا۔ تیرہ چودہ سو برس پہلے پھر انہوں نے ایک خوش نما سیاہ پرند کو یہ نام دے دیا اور یقین کرلیا کہ کنکریاں برسانے والا پرند یہی تھا۔ وہ پرند...... جو نہ صرف عرب میں نہیں، بلکہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس طرح ایک چڑیا کو یہ نام ملا۔ اور وہ چڑیا ابابیل بن گئی۔ جس نے کنکریاں برسائی تھیں۔"

عورت کو یاد آیا۔ اس نے تو ایک عرب مصنف کی انگریزی میں لکھی کتاب میں یہ بھی پڑھا تھا کہ ابرہہ کا لشکر دراصل چیچک کا شکار ہو گیا تھا۔

مکہ کے باسیوں نے ہاتھیوں کی طرح چیچک کو بھی پہلے نہ دیکھا تھا۔ وہ اس موذی مرض سے ناواقف تھے۔ انہیں بالکل ایسا نظر آیا تھا جیسے لشکر کے سپاہیوں کے جسموں پر ننھی ننھی کنکریوں نے زخم ڈال دیے ہوں۔ عربوں کے شاعرانہ تخیل نے اس بیماری کے اثرات کے لیے یہی تشبیہ تراشی تھی۔

ذہن میں تیرتی کتاب کی اس یاد کو اس نے پرے دھکیل دیا، وہ باریش لغت نویسوں کے سامنے یہ کفر کے کلمات نہ کہنا چاہتی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ انسانی تخیل کس قدر اہم ہوتا ہے اور کتنا طاقت ور تخلیق کار! مثال تو سامنے تھی۔ یہ تخیل ہی تو تھا جس کے باعث ابابیل ایک جیتا جاگتا پرند بن گیا۔ جس کا رنگ سیاہ، دُم اور پر دولخت ہیں اور جو ہندوستان اور پاکستان اور ترکی اور ایران میں رہتا ہے۔ وہی پرندہ، جس نے ابرہہ کے لشکر پر کنکریاں برسائی تھیں۔

"میں کچھ نہیں کہوں گی۔" اس نے سوچا۔ "نہ نہ بابا، میری توبہ! میرے باپ دادا کی توبہ۔" اس نے دل میں کہا اور سوچا کہ توبہ ہمیشہ باپ دادا کی کی جاتی ہے۔ ابّ وجد کی نہیں۔ نہ جانے کیوں؟ معنی تو دونوں کے بالکل ایک ہیں۔ شاید ایک ترکیب دوسری ترکیب کا لفظی ترجمہ ہو۔ اس کے باوجود...... اس کے باوجود کسی قدر باریک پھر بھی کتنا واضح فرق موجود تھا۔ باپ دادا سے ہم زیادہ بے تکلف ہیں۔ اس کی توبہ بلاتے رہتے ہیں۔

"چونکہ لفظ عربی ہے لہٰذا ماخذ عربی ہی رہے گا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"دُرست" عورت نے کہا۔

''لیکن ابابیل کوچی کا ماخذ کیا ہوگا؟ فارسی ترکیب ہے۔''

''ماخذ فارسی لکھ دیجیے۔تراکیب کا ماخذ اگر اصل لفظ سے مختلف ہے تو وہ لکھا جائے گا، لکھ لیجیے اُصولیات تالیف میں......''

وہ جلد ہی چار صفحوں کے اختتام تک پہنچ گئے۔ افسر عورت ان کے کام پر بے حد مسرور تھی۔ سو پچاس صفحات کو دو تین صفحوں میں اس طرح سمیٹنا کہ ہر ضروری لفظ شامل رہے کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ انگریزی اور اُردو انگریزی جدید لغات میں الفاظ کو دیکھتے رہنے کا فائدہ ہوا تھا۔ مثلاً اُبال میں وہ حرارت کے ایک خاص درجے کا ذکر شامل کر سکے تھے، جیسا کہ انگریزی ڈکشنری میں بوایل کے معنوں میں درج تھا جب کہ اُردو کی پرانی ڈکشنریوں میں نہیں تھا۔ کہیں کہیں فونٹ کو گاڑھا کر کے، مختلف بریکٹوں کا استعمال کر کے، کوما اور سیمی کولن کا ہر لفظ کے معانی میں یکساں استعمال کر کے، انہوں نے معنی تخلیق کیے تھے جو صرف اسی ڈکشنری سے مخصوص تھے۔ (یہ ایک شان دار معنی آفرینی ہے عورت نے سوچا تھا۔)

وہ پرانی ڈکشنری میں اِدھر اُدھر بکھرے محاورات، ضرب الامثال اور تراکیب کو کھینچ لائے تھے اور ہیڈ ورڈ کے تحت درست ترتیب میں انہیں جما دیا تھا۔ عورت کی ترکیب کامیاب رہی تھی کیونکہ تکنیکی اُصولیات کیے ہوئے کام سے نکل رہے تھے۔ اس کامیابی پر عورت کو تعجب بھری خوشی ہو رہی تھی۔ (ٹھیک ہی تو کہتے تھے چچا کارل مارکس۔ پیٹ بھرنے کے لیے کام کرنے سے انسان نے علم حاصل کیا۔ اس نے دل ہی دل میں مارکس کی تصویر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا جو اس کے دل ہی میں تھی۔ نوجوانی میں، اسے یاد آ رہا تھا، وہ مارکس اور اینجلز کی تصویریں اپنی امی کو دکھا کر کہا کرتی تھی ''دیکھیے یہ بھی صوفیائے کرام ہیں۔ ذرا ان کی نورانی داڑھیاں دیکھیے'' امی ہنس کر اس نے کہتی تھیں۔ ''بکومت۔ یہ اور قسم کے لوگ ہیں۔''

اس کا بے چارگی سے ٹیم سے یہ کہنا، ''کون سا لفظ لینا ہے اور کون سا نہیں، بالآخر یہ فیصلہ آپ کو ہی کرنا پڑے گا'' سودمند ثابت ہوا تھا۔ اب وہ ہر لفظ میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اور سچ تو یہی تھا کہ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا؟ لفظوں کے بارے میں اگر حتمی فیصلہ افلاطون بھی آ کر صادر کرتا تو اسے بھی چیلنج کیا جا سکتا تھا جبکہ افسر عورت کو تو افلاطونیت کا دعویٰ بھی نہ تھا۔ (یہ دعویٰ کرنے سے وہ بال برابر ہچکچاتی تھی۔)

عورت کو اپنی ٹیم پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ کتنے ذہین، محنتی اور من موہنے ہیں یہ لوگ!

اس نے ڈکشنریاں اور کاغذات اپنی بڑی سی میز پر رکھنے کے لیے میز پر کھلے ہوئے اخبار کو تہہ کر کے ایک طرف رکھا جو سارا ٹارگٹ کلنگ کی خبروں سے بھرا پڑا تھا۔ دو تین دن سے میڈیا کے ذریعے یہ بھید نہیں کھل رہا تھا کہ کون کسی کو مار رہا ہے۔ آیا شیعہ سنیوں کو یا سنی شیعوں کو قتل کر رہے ہیں یا مہاجر پٹھانوں کو یا سندھیوں کو یا سندھی یا پٹھان مہاجروں کو قتل کر رہے ہیں۔ یا یہ سب ایک دوسرے کو ہر قتل کے انتقام کے لیے گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ یہ قتال خود ایجنسیوں کا کھیلا ہوا ایک تماشا تھا جو کسی خاص مقصد برآری کے لیے منعقد کیا جا رہا تھا۔ چوتھی صورت یہ بھی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی غیر ملکی ہاتھ ہے۔ شاید یہ باہر والوں کو یہ باتیں بہت مضحکہ خیز لگیں لیکن انہیں کیا پتہ بھئی، کسی کو کیا خبر۔ یہاں کے حالات تو مدت سے بس ایسے ہی ہیں۔

کتابیں میز پر اوپر تلے رکھ کر، تشکر سے پر لہجے میں عورت نے کہنا شروع کیا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔ میں آپ لوگوں کی کیسے تعریف کروں۔ پہلے مجھے فکر تھی کہ پتہ نہیں جو ذمہ داری ہم نے لی ہے، جدید طرز کی ڈکشنری بنانے کی، آپ اسے پورا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔" پھر وہ جوش مسرت میں ان سے مذاق کرنے لگی۔ "مثلاً میں تو آپ لوگوں کے حلیے سے خوف زدہ رہتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خودکش بمبار تو آپ میں نہیں'' ......

وہ مسکرائے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہی تو ہیں ہم لوگ۔'' اور اپنی کرسیوں پر جنبش کی۔

پھر نہ وہ کمرہ تھا اور نہ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ۔ صرف ایک زوردار دھماکہ تھا جو شہر میں گونج رہا تھا۔ ڈکشنریوں کے پرخچے دور دور تک اُڑ رہے تھے۔ تنہا ابتہاج اور اس کا چھوٹا بھائی ابتسام فضا میں اُچھال دیے گئے تھے۔ ان کے ننھے منے کپڑوں پر بنے ہاتھی گھوڑوں کی تصویریں بھڑکتے ہوئے شعلوں میں خاکستر ہو چکی تھیں۔

اب وجد کے ہاتھ پاؤں جسم سے علیحدہ بکھرے پڑے تھے۔ ایک تصور سے حقیقت بن جانے والی ابابیلیں جھلس کر مر گئی تھیں۔ قدیم آریائی گھڑسوار اب کا حال ابتر تھا۔ اس کا اشویا اسپ الف ہو کر ہنہنا رہا تھا۔ بھڑکتے شعلوں سے اس کی آنکھیں خوف زدہ ہو کر پھیل گئی تھیں۔ اب کے قدیم بلم بھالے لٹوؤں کی طرح چکراتے دور دور تک منتشر ہو چکے تھے۔ اس کا حلق خوف سے خشک ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں مسلسل چلا رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا! اب کیا ہوگا!''

ایک اور زوردار دھماکہ...... اور اب کی بار وہ بھی اپنے رہوار سمیت بھک سے اُڑ گیا۔

فہمیدہ ریاض

دفتر میں ایک دِن

فدوی کی گزارش ہے کہ بوجوہ رمضان المبارک از بتاریخ ۲۳ رمضان بمطابق ۱۲ فروری تا ۲۷ رمضان المبارک قمری ہجری بمطابق تاریخ فلاں عیسوی فدوی کو رُخصت مکسوبہ عطا فرما دی جائے۔

احقر العباد

فلاں

اس مضمون کا ایک نامہ عورت کی میز پر پڑا تھا۔ اس نے حسب عادت پہلے تو اس میں جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک نظر میں سمجھنے کی کوشش کی لیکن سچ یہی ہے کہ اسے دوبارہ پڑھنا پڑا۔

"یہ رُخصت مکسوبہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی Earned Leave" ملازم لغت بورڈ نے انکسار سے کہا۔

"یہ چھٹی کی درخواست ہے کہ نکاح نامہ!" عورت نے کاغذ پر "منظور" لکھ کر دستخط جماتے ہوئے کہا۔ "بس مہر معجّل کی کسر ہے۔" پھر ہنس کر اضافہ کیا۔ "ایک لمحے کو تو میں یہ بھی سمجھی تھی کہ گورنر سندھ جناب عشرت العباد نے کسی شادی کا دعوت نامہ بھیجا ہے۔" پھر اس نے حسرت سے پوچھا "یہاں اسی زبان میں خط لکھے جاتے ہیں؟"

"جی! مدت سے!" جواب ملا۔ پھر مسکراتے ہوئے۔ "دراصل ہم دفتر میں انگریزی کا استعمال پسند نہیں کرتے۔ جیسا کہ آپ واقف ہی ہوں گی، یہ اِدارہ پاکستان میں نفاذ اُردو کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور گو سر سید رحمت اللہ علیہ و حالی مدظلہ کی یہ آرزو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی لیکن اب......

(معنی خیز وقفے کے بعد) آپ کے یہاں تقرر کے بعد تو اُمید از سرِ نو بیدار ہوگئی ہے۔''
حالیؔ اور سرسید سے فوری طور پر منسوب اس آرزو پہ کہ پاکستان میں اُردو نافذ کر دی جائے، عورت نے بہ مشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے اور آخری فرمائشی خوشامدانہ جملے کے جواب میں درخواست پر منظور کے ساتھ ''بخوشی'' کا اضافہ کر کے بدبداتے ہوئے کہا۔
''اس اُمید کو آپ محوِ خواب ہی رہنے دیں تو بہت بہتر رہے گا۔''
''کیا فرمایا؟''
''کچھ نہیں۔''
''پھر بھی ......''
''میں کہہ رہی تھی کہ ماشاء اللہ آپ کی اُردو کتنی اچھی ہے۔''
وہ کانوں تک مسکرائے اور میز پر سے کاغذ اُٹھاتے ہوئے بولے۔
''اجی صاحب میں کیا اور میری بساط کیا۔'' پھر انہوں نے اُوپر دیکھ کر چھت میں لگے ہوئے پنکھے کی طرف انگشتِ شہادت سے اشارہ کر کے کہا۔
''یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی۔''
اتنا کہہ کر وہ غائب غلا ہوئے۔ پنکھا بہرحال فوراً بند ہوگیا کیونکہ بجلی چلی گئی تھی۔ ایک نائب قاصد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ گرم ہوا کے تیز جھونکوں نے میز پر رکھے کاغذ تتر بتر کر دیے۔ عورت نے دونوں ہاتھ باندھ کر گود میں رکھے، ٹوٹی ہوئی صدارتی کرسی پر احتیاط سے ٹیک لگائی اور پھر خیالوں میں اُداسی سے غرق ہوگئی اور کھڑکی سے دَر آتی روشنی کی چوڑی پٹی میں ناچتے گرد و غبار کے ذرّوں پر نظریں جما دیں۔
''نفاذِ اُردو!'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''بروزن نفاذِ مارشل لاء، یا نفاذِ ختمِ نبوت'' اس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ گزشتہ ہفتے وہ لاہور میں ایک قدیم مسجد مسجد وزیر خان دیکھ کر آئی تھی جس کے شکستہ حال Entrance پر کہ جس کے بارُعب نیلے اور زمردیں نقش و نگار بتاتے تھے کہ کبھی وہ کتنی جمیل و جلیل رہی ہوگی، بڑا سا بینر دیکھا تھا۔ ''اجتماع برائے نفاذِ ختمِ نبوت'' بالکل یوں معلوم ہو رہا تھا کہ شہر کے کونوں کھدروں سے لاتعداد نبوت کے داعی نکل پڑے ہیں۔ ایک وبا سی پھیل گئی ہے جس کا فوری انسداد بے حد ضروری ہے۔
''یہ سب قادیانیوں کی منڈیا رگڑنے کے لیے......'' تب اس نے افسوس سے

سوچا تھا...... اور بچارے قادیانی کیا کہتے ہیں..... ایسا سننے کی کسی کو فرصت نہیں۔ کبھی اسکول کے زمانے میں ایک قادیانی لڑکی اس کی ہم جماعت تھی۔ وہ خوش بخت اس قدر روزہ نماز کی پابندی تھی کہ اس سے کبھی دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ روزہ نماز سب بیکار! افسوس۔

بہرحال اسے نفاذ اُردو کا ذرّہ برابر شوق نہ تھا۔ اس موضوع پر وہ اکثر خاموش ہی رہتی تھی یا کبھی کہہ بھی دیتی تھی، ''انگریزی میں کیا ہرج ہے؟ کیوں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالتے ہیں؟ پاکستان کی اپنی زبانیں بھی ہیں۔ اور ویسے تعلیم کے لئے اعلیٰ درجے کی کتابیں نہ اُردو نہ سندھی، پنجابی، پشتو، سرائیکی یا بلوچی میں ہیں۔ ایک میڈیکل ہی کو لیجیے۔ انگریزی کے سوا کون سی زبان میں ایم۔بی۔ بی۔ ایس ہی کے درجے کی کتابیں پڑھائیں گے ہم؟ اس سے آگے اسپیشلائزیشن کی تو دُور کی بات ہے۔ علم اچھا اور ضروری ہے ہمارے بچوں کے لیے، خواہ کسی بھی زبان میں ملے۔ خواہ مخواہ کی بغیر سوچے سمجھے نعرہ بازی۔ خوشامد اور حد درجہ مبالغہ۔ یہ سب بھی اُردو کا حصہ سمجھا گیا ہے یہاں جب کہ یہ سچ نہ تھا۔ اُردو میں تو فیض احمد فیض تھے اور عصمت چغتائی...... راشد اور میرا جی...... منٹو...... اس زبان کا اَدب باغیوں سے بھرا پڑا تھا۔ کم از کم عورت تو اسی اُردو کو جانتی تھی۔ اُردو میں ''انقلاب زندہ باد'' برصغیر کی بیش تر زبانوں میں رَچ بس گیا تھا یا شاید خوشامد صرف اُردو کا حصہ نہیں۔ قومی مزاج بن چکا ہو۔ اسے یاد آیا تھا۔ اسلام آباد میں فنانشل ایڈوائزر سے ملنے اس کے ساتھ سندھ مدرسہ کی پرنسپل بھی گئی تھیں۔ دونوں کی درخواست ایک ہی تھی کہ اِداروں کے وجود کو تسلیم کرایا جائے جو ۱۹۸۶ء سے مرکزی کھاتوں سے غائب ہیں۔ سندھ مدرسہ کی پرنسپل لیاری کی ایک مہذب اور تعلیمیافتہ خاتون تھیں جنھوں نے زندگی کے پچیس تیس برس اسی مدرسے میں تدریس کرتے ہوئے بتائے تھے لیکن فنانشل ایڈوائزر سے وہ کس طرح بات کر رہی تھیں! جب انہوں نے کہا۔

''جناب ہم آپ کے بال بچوں کو دُعائیں دیں گے۔ اللہ سائیں آپ کا اقبال ہمیشہ بلند رکھے۔'' تو عورت غم و غصے سے مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنے اِدارے کے لئے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ افسوس اور شرمندگی کی طاقتور رَو نے اس کا دل جکڑ لیا تھا۔ بار بار ایک ہی خیال ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ ''بھکاری بنا کر رکھ دیا ان کو۔''

''بھکاری!'' کیا فنانشل مشیر کو یہ سن کر شرمندگی ہو رہی تھی؟ ایسا ان کے چہرے سے ظاہر نہ تھا۔ شاید انہیں یہ سب سننے کی عادت پڑ چکی تھی۔

عورت نے کرسی پر پہلو بدلا تو کرسی ٹیڑھی ہو کر گرنے لگی۔ عورت نے سنبھل کر کرسی کا توازن ٹھیک کیا۔ یہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے بدل دیا جانا چاہئے تھا یا اس کی مرمت کی جانی چاہئے تھی۔ لیکن ایک تو عورت کو اس کی فرصت نہیں مل سکی تھی اور دوئم یہ کہ مرمت اور فرنیچر کی مد میں جو رقم تھی اسے دوسری مدوں میں منتقل کرنے کی درخواست دے دی گئی تھی تا کہ اِدارہ بجلی اور ٹیلی فون کا بل ادا کر سکے۔

ری اپرو پری ایشن، یعنی منتقلیِ رقوم کی فائل مہینے بھر پہلے فنانس کے ڈپٹی ایڈوائزر کو بھیجی جا چکی تھی لیکن ہنوز جواب نہیں آیا تھا۔ دفتر کے اسٹاف نے اس سے کہا تھا کہ یہ تو روٹین کا معاملہ ہے گزشتہ برس اس میں دو ایک دن سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ پچھلی بار جب وہ اسلام آباد گئی تھیں تو سیکشن افسر کے کہنے پر وہ ڈی ایف اے سے ملنے بھی گئی تھی۔

''ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ رقوم کی تمام فائلیں ان کے دستخطوں ہی سے چلتی ہیں۔''

''لیکن اِدھر آپ مجھ سے کہتے رہتے ہیں کہ میں اپنے سے ایک نمبر بھی نچلی گریڈ کے آفیسر کو خط تک نہ لکھوں۔ دفتر کے کسی دوسرے افسر سے لکھواؤں ورنہ میں وزارت کا پروٹوکول خراب کر رہی ہوں۔ اب آپ کہتے ہیں کہ ان سے ملوں۔''

''اوہو بھئی ان سے تو سب ملتے ہیں۔'' خوش مزاج ہنس مکھ سیکشن افسر نے کہا۔ ''خزانے کی چابی ان کے ہاتھ جو ہوئی۔ اور میڈم، انہیں کوئی تحفہ بھی، دینا چاہئے۔ کوئی ڈائری، مٹھائی شٹھائی......''

سو وہ وزارت کی راہداریوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی ان کے دفتر تک جا پہنچی تھی۔ اتفاق سے افسر کمرے میں موجود مل گئے تھے۔ کسی ''میٹنگ'' میں نہیں گئے ہوئے تھے (چائے پینا، گپ مارنا، کسی ذاتی کام سے باہر چلے جانا، ان سب کو وزارت کی اصطلاح میں ''میٹنگ'' ہی کہا جاتا ہے۔) تو افسر صاحب وہاں تھے۔ سانولے رنگ میں زردی گھنڈی تھی۔ پتہ مار کر برسوں کام کیا تھا تو پتے نے احتجاجاً سبز رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اپنی اہمیت سے نہایت واقف، وہ تمکنت سے کرسی پر فروکش رہے اور دوسری فائلیں دیکھنے میں منہمک! دس منٹ گزرے...... پھر بیس منٹ۔

''ج ن اب......'' عورت نے گھبراہٹ میں خود کو ''جناب والا'' کہنے سے باز رکھا مبادا وہ اس نازک پروٹوکال کا ناس ہی نہ پیٹ دے جس کے بغیر یہ دفتری نظام نہیں چل سکتا، حالانکہ صورت حال بالکل ایسی ہی تھی کہ ڈی ایف اے کے در پردہ وہ کسی سائل کی شکل میں ہی پہنچی تھی۔

''مسٹر فلاں'' اس نے پھر بھی ممکنہ حد تک متانت مجتمع کر کے کہا۔ ''ہماری فائلیں......''

"ہوں ہوں!" ڈی ایف نے اس کی بات کاٹی۔ "بڑا ارجنٹ میٹر ہے اس وقت میرے سامنے۔ وزیراعظم کی معاون خصوصی کا ٹیلی فون آیا ہے۔ پرسوں انہوں نے کانفرنس کے لیے لاہور جانا ہے تو سارا انتظام تو مجھی کو کرنا ہوا ناں۔"

پھر وہ پے بہ پے متعدد فون کرنے لگا جن میں وہ مختلف شعبوں کو کچھ اور شعبوں سے رابطہ کر کے معلومات حاصل کرنے اور پھر اسے اطلاع دینے کی ہدایات دے رہا تھا۔

اس کے بعد پھر وہ کسی دوسری فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اب تک اس دفتر میں آئے عورت کو تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں کافی دیر سے یہاں بیٹھی ہوں اور کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں اب چلی جاؤں گی۔"

افسر ہذا نے پورے اطمینان سے فائل سے سر اُٹھا کر کہا۔

"محترمہ! آپ جب چاہیں یہاں تشریف لا سکتی ہیں، یو آر موسٹ ویلکم۔"

"ہماری فائلیں......" عورت نے کہنا شروع کیا......

"ایک نئی افسر آئی ہیں...... سنا ہی بڑی سخت ہیں۔ آپ ان سے بھی مل لیجئے"

اب عورت کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہو ہی گیا۔ اس نے کہا۔

"میں یہاں مختلف کمروں میں بھٹکنے کے لئے نہیں آئی ہوں۔ آپ نے مجھ سے فائلوں کے بارے میں ایک بات بھی نہیں کی ہے جو میں کوئی وضاحت کر سکتی۔"

ڈی ایف اے نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔

"اب مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔" اس نے کہا اور اسے کرسی پر بیٹھا چھوڑ کر اپنے دفتر سے باہر جانے لگا۔ عورت ہونقوں کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے مٹھائی کا ڈبہ لے کر آنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ مٹھائی کا مطلب واقعی مٹھائی ہی تھا یا کچھ اور......

"وزارت تعلیم کے لوگ خود تو کچھ کام کرتے نہیں۔" ڈی ایف نے جاتے جاتے کہا۔ "ادھوری فائلیں بھیجتے ہیں، چاہتے ہیں کہ ان کا کام بھی ہم کریں۔ کچھ آتا جاتا تو انہیں ہے نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

راستہ ڈھونڈتی عورت اس عمارت سے باہر نکلی تھی۔ اس ساری کدو کاوش کا نتیجہ یہی نکلا تھا کہ رقوم کی منتقلی کی فائل ہنوز ڈی ایف اے کے قبضۂ قدرت میں تھی۔ رقم ادارے کے پاس موجود تھی لیکن صحیح مد میں نہ ہونے کے باعث نکالی نہیں جا سکتی تھی۔

''میں ڈی ایف اے کو خوش نہیں کر سکی۔'' عورت نے پچھتاوے سے سوچا۔ ''میری وجہ سے ادارے کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ بل ادا نہ کرنے کے باعث ایک ٹیلی فون کٹ چکا ہے۔ گاڑی کے لیے پیٹرول کی بوند نہیں...... بجلی بھی کٹ سکتی ہے۔ یہ سب...... میرا قصور ہے۔'' عورت جانتی تھی کہ گو اس نے کہا کچھ بھی نہ ہو لیکن ڈی ایف اے کے دفتر کے اس نے چہرے پر لکھا ہوگا۔ ''مجھے پریشان نہ کیجئے۔ اپنا فرض وقت پر انجام دیجیے۔'' یہ بات ڈی ایف اے کو کیسے پسند آ سکتی تھی۔

دفتر کے کچھ لوگ اس کے پاس پہنچے۔

''میڈم...... ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا...... کہیں یوں تو نہیں کہ......''

''کیا؟'' اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

''کہ سازش اسی دفتر سے شروع ہوئی ہو۔''

عورت غور نے سننے لگی۔

''آپ سے پہلے جو صاحبہ قائم مقام تھیں وہ اکثر اسلام آباد فون کرتی رہتی ہیں۔''

''ہوں۔'' عورت نے کہا۔ اس کی تقرری سے ظاہر ہے کہ قائم مقام کو نقصان پہنچا تھا۔ اگر وہ کچھ نہ کرتی تو تعجب کی بات تھی جو بات اس سے کہی جا رہی تھی وہ ناممکن نہیں تھی۔

''کیا یہ اتنے اثر و رسوخ رکھتی ہیں؟'' عورت نے کہا۔

''خیر اثر و رسوخ تو کوئی کیا رکھے گا اسلام آباد میں......'' ایک نے کہا ''لیکن ایک رشتہ تو ان میں اور ڈی ایف اے میں ہے نا...... وہی...... بھئی دونوں اہل تشیع ہیں۔''

عورت کے دماغ میں گھنٹی سی بجی۔ اس کی آنکھیں اور بھی پھٹ گئیں۔

''یہ لوگ ایک دوسرے سے ہمدردی رکھتے ہیں، مدد کرتے ہیں ایک دوسرے کی۔'' دوسرے نے خاموشی سے کہا۔

عورت سن سی بیٹھی رہی۔ کیا یہ ممکن تھا؟

اس کا پہلا خیال یہی تھا کہ یہ ناممکن نہیں تھا۔

''پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے بالآخر کہا۔

اس کے ذہن میں آیا، وہ شکایتی خط جو وہ اس نازیبا تاخیر پر لکھنے والی تھی اس میں ایک پیرا گراف کا اضافہ۔

''دیگر یہ کہ یہاں کی پرانی قائم مقام خاتون نے ڈی ایف اے کے ساتھ مل کر سازش کی

ہے، ان کے کہنے پر ڈی ایف اے میرے تقرر کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ وہ سابق قائم مقام کی مدد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دونوں شیعہ ہیں۔ اس طرح اہل تشیع نے ہم سنیّوں کے خلاف محاذ بنالیا ہے۔

دُہائی ہے، دُہائی...... یا اہل سنّت! آیئے مدد کو آیئے۔ ایک سنّی عورت مصیبت میں مبتلا ہے۔''

یہ سوچتے سوچتے عورت دائیں ہاتھ کی چار اُنگلیوں کو بے خیالی میں اپنے مُنھ میں ٹھونس چکی تھی اور انہیں چبا رہی تھی۔ اس کی چشم تصور نے دیکھا کہ اس کی پکار سن کر سمندروں پر جہازوں نے بادبان کھول دیے ہیں اور ایک فوج اس کی مدد کو روانہ ہوگئی ہے۔ جہازوں سے غلغلہ بلند ہو رہا ہے..

''لبیک، لبیک، اللّھم لبیک...... ہم پہنچنے کہ پہنچے۔ اے اُمت کی دُختر نیک دُختر!''

بجلی پھر چلی گئی۔ اس کے ہمدرد رُخصت ہوئے۔ نائب قاصد نے پھر دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ کھلے دروازے سے ایک اور ہمدرد کارکن اندر آیا اور میز کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''جی؟'' عورت نے مُنھ سے اُنگلیاں نکال کر پوچھا۔

''تو ڈکشنری بالآخر ختم ہوگئی ہے۔'' ہمدرد نے پریشان حالی سے کہا۔

''ہاں...... یہ تو اتنی خوشی کی بات ہے۔ پانچ چھ عشروں کی محنت سوارتھ ہوئی۔''

''تو اس کی اطلاع اخباروں میں بھیجیں۔''

''کیوں نہیں!'' عورت نے کہا۔ گڈ آئیڈیا! آپ پریس ریلیز بنایئے۔''

''وہ تو میں بنا کر ہی لایا ہوں'' کارکن نے کہا۔ ''بس آپ دستخط کر دیں، لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کل کے اخباروں میں دھماکہ ہو جائے گا۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ آپ ان سب کو روند کر پھینک دیجئے۔''

عورت نے کچھ مسکرانا شروع کیا۔ ''کن کو روند کر پھینک دوں؟'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے سب مخالفین کو۔'' کارکن نے کچھ چکرا کر کہا۔

''وہ کون ہیں؟'' عورت نے پوچھا۔

ہمدرد کارکن کافی مایوس ہوا۔ پھر بھی اس نے کہا۔

''یہیں...... اسی دفتر میں...... اور باہر بھی۔ لوگ بے حد جل رہے ہیں۔ ان کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔''

''ہوں!'' عورت نے خود کو کچھ محظوظ ہوتا ہوا پایا۔ بے خیالی میں وہ میز سے اپنا ہینڈ بیگ

اُٹھا کر کمرے سے نکلی اور سیڑھیاں اُترتی چلی گئی۔ وہ سانپ لوٹنے پر غور کر رہی تھی۔ کیا سانپ کے لوٹنے سے بھی کچھ نقصان ہوتا ہے؟ زہر تو سانپ کے پھن میں ہوتا ہے۔ جب سانپ ڈس لے نقصان، درد یا جلن تو تب ہی ہوتی ہے۔ اس نے خود ایک مصرعے میں کبھی باندھا تھا۔

"ایک سیاہ سانپ سا، دل پہ تمام شب پھرا۔"

پھر یہ سانپ والا محاورہ کیسے بنا؟ سانپ لوٹ رہا ہے، سانپ پھر رہا ہے۔ دل پر سانپ سا پھرنا۔ شاید یہ محاورہ نہیں، محض ایک محاورے کی شاعرانہ ترمیم ہے۔ مگر سانپ لوٹنے سے جو ڈر، جو گھبراہٹ پیدا ہوسکتی ہے کہ اب یہ ڈس لے گا، غالباً محاورہ کا جواز یہ خوف ہی ہو، لیکن یہ وضاحت اسے کچھ جچی نہیں۔ اس نے سوچا کہ محاورے کی وضاحت غالباً کچھ بھی نہیں ہے، لیکن یہ نہایت پرتاثیر محاورہ ہے اور بس اسی لیے وجود میں آیا اور باقی ہے۔

دفتر کی کار اسے گھر کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس نے ہینڈ بیگ کے اندر جھانکا۔ ہمیشہ کی طرح وہ کئی چیزیں دفتر کی میز پر ہی بھول آئی تھی۔ اس کا سیل فون، ٹیلیفون ڈائریکٹری، چشمہ......

ایک لمبی سانس کھینچ کر اس نے سوچا۔ "خیر، کل صبح یہ سب کچھ وہیں رکھا مل جائے گا۔" پھر اپنی دوراندیشی کی داد دی کہ گھر پر اس نے ایک اور چشمہ رکھ چھوڑا ہے۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے، عورت کو خیال آیا کہ شیعہ گردی، سنی گردی، مہاجر گردی، سندھی گردی اور جانے کتنی ہی گردیوں کے اجزاء ترکیبی کو اس نے غالباً تھوڑا بہت سمجھنا شروع کیا ہے۔ اسے ان کی حیرت خیز طاقت اور ترغیب پر شرمندگی بھرا تعجب ہوا۔ اسے سانولے ڈی ایف کا خیال آیا جو آج غالباً اس ادارے کی فائلوں پر بقول محاورۂ وزارت "انگریزی لکھ لکھ کر" وزارت تعلیم کے افسران کے بادشاہوں پر اکے مار رہا ہے، ان کی ایسی کی تیسی کر رہا ہے انہیں روند کر پھینک رہا اور شاید سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس تفریح سے دور کہیں کراچی میں ایک ادھورا سدھورا ادارہ، کتنی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یا شاید ایسا نہ ہو، وہ سچ مچ صرف عورت کو ہی دِق کر رہا ہو کیوں کہ عورت نے نہ اس کی انا کی تسکین کی اور نہ ہی مٹھائی پیش کی۔

حقیقت کیا تھی؟ عورت کا دل چاہا کہ فٹ پاتھ پر بیٹھے عامل منجم کے طوطے سے کارڈ منتخب کرا کے معلوم کر لے۔ اس وقت سچ تو یہ تھا کہ وہ اس ادارے سے کہیں بہت دور چلی جانا چاہتی تھی...... دور...... بہت دور...... مگر اسے ایک موہوم سا شبہ تھا کہ کوئی بھی جگہ اِدارے یا وزارت سے بہت دور نہیں ہے۔

فہمیدہ ریاض

شکر

"یہ انسولین تو بالکل بے کار چیز ہے۔" بڈھے نے اپنی بہو سے کہا جو اُس کے لیے نارنگی کے رس میں نمک کی چٹکی ملا رہی تھی۔

"بہت اچھی چیز ہے۔" بہو نے کہا۔ "بابا تم جلدی سے یہ پی جاؤ۔" اور اُس کے ہاتھ میں رس کا گلاس تھما دیا۔ بڈھا بستر کے سرہانے سے تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے رس کی ایک دو چسکیاں لیں اور مسکرایا۔ یہ سوچ کر کہ یہ رس پینا اس کے لیے سخت ممنوع تھا اور آج اچانک اس پر کچھ ایسی آفت ٹوٹی کہ اس کی بہو اِسے اپنے ہاتھ سے اورنج جوس میں ڈھیر سے برف کے مکعب ملا کر ایک لمبے گلاس میں پیش کر رہی تھی۔ یہ اس طرح تھا گویا جنت میں سب کچھ حلال ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ دِل میں محظوظ ہوا۔

اس کی بہو ڈاکٹر تھی اور ان کے محلے سے کافی دُور ایک اسپتال میں کام کرتی تھی۔ برسوں سے گولیوں کے ذریعے بڈھے کی ذیابیطس کو قابو میں رکھتے رکھتے اچانک اب اسے انسولین پر لانا پڑا تھا کیونکہ گولیوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور تب ہی یہ ہوا کہ شام کو نزدیکی پارک میں چہل قدمی کرتے کرتے بڈھے نے اتنی کمزوری محسوس کی کہ وہ بہ مشکل گھر پہنچ پایا۔ خوش قسمتی سے اس کی بہو اس وقت تک اسپتال سے واپس آ چکی تھی۔

"فوراً کچھ کھائیے۔" اس نے بڈھے سے کہا۔

بڈھے نے اپنے پرہیزی بسکٹوں کو ڈھونڈنے کے لیے طاقچوں پر نظر دوڑائی، لیکن اس کی بہو نے گلوکوز کے بسکٹ اس کے منہ میں ٹھونس دیے جو کچن کی میز پر سامنے ہی پڑے تھے۔

"آپ کے جسم میں شکر اچانک بہت کم ہو گئی ہے۔" اس نے بڈھے سے کہا۔ وہ سہارا

دے کر اسے اس کے کمرے تک لائی اور اسے بستر پر بٹھا کر اورنج جوس لینے باورچی خانے چلی گئی۔

بڈھے نے تین چار بسکٹ کھائے اور ان کے ذائقے کا پورا لطف لیا۔ ہفتے بھر سے بہو اسے صبح اور رات کے کھانے سے پہلے انسولین کا ٹیکا لگا رہی تھی۔ اب تک تو اسے اس نئی دوا سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بہو نے پہلے روز اس سے کہا تو تھا، اسے یاد آیا کہ بدن میں شکر اچانک کم ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں اسے فوراً کچھ کھا لینا چاہیے لیکن جب دو تین دن تک اسے یہ ضرورت نہیں پڑی تھی تو وہ اس بات کو بھول بھال گیا تھا اور تب ہی آج اس کی یہ حالت ہوگئی کہ پارک کی بنچ پر بیٹھا تو اُٹھ نہیں سکا۔ بنچ پر بیٹھے ایک آدمی نے سہارا دے کر اُٹھانا چاہا تو اس کی گردن میں حمائل کرنے کے لیے اسے بازو اُٹھانے میں پوری طاقت خرچ کرنی پڑی۔

''تو کیا...... یہ سب...... انسولین سے؟''

''ہوں۔'' بہو نے کہا۔ ''انسولین سے نہیں...... بتائی ہوئی خوراک وقت پر نہ کھانے سے۔'' وہ اپنے پیشے کی وفادار تھی اور ہر ایلوپیتھک طریقۂ علاج کا فوراً دفاع کرتی تھی۔

بڈھے نے باورچی خانے جاتی ہوئی بہو کو دیکھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ جاتے جاتے بہو دروازہ بند کر گئی۔

''انسولین۔ یہ ایسا علاج ہے جو بیماری سے زیادہ خطرناک ہے۔'' اس نے تنہائی کا فائدہ اُٹھا کر گویا اپنے آپ سے کہا۔

تب ہی دروازہ بھڑاک سے کھلا اور نور کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر بڈھے پر ڈالی پھر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میز پر رکھے ہوئے پیالے پر پڑی جس میں کافی آئس کیوب اب بھی موجود تھے۔

''پلیھ!'' نور نے اُلٹی سانس لے کر کہا اور اس سے پہلے کہ بوڑھا وہ پیالہ ہٹا سکتا، اس نے جھپ سے ہاتھ پیالے میں ڈال دیے اور دونوں ہاتھوں سے برف مُنھ میں ٹھونسنے کی کوشش کرنے لگا۔ برف کے باقی ٹکڑے اس نے فرش پر اوندھا دیے۔

''ہوں، ہوں، ہوں۔'' بوڑھے نے سرزنش کی۔ پھر بے بسی سے پکارا...... ''بہو!''

بہو اُلٹے پیروں واپس آئی۔ ''کیا ہوا بابا!'' گھبرائی آواز میں کہتی ہوئی...... وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ بوڑھے نے سوچا لیکن پریشان ہوگئی ہے۔ کیوں؟ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا۔ بہو نے اس

سے کہا تھا۔ ''کبھی کبھی کمزوری سے آدمی بے ہوش بھی ہو جاتا ہے۔'' وہ اس کی جیب میں ایک پرچہ رکھنا چاہتی تھی جس پر لکھا ہو۔ ''انسولین پر...... کمزوری کی صورت میں فوراً جوس پلائیں یا کوئی میٹھی چیز کھلا دیں۔'' لیکن بوڑھے نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ''تمہارا بس چلے تو یہ لکھ کر میری گردن میں لٹکا دو۔''

فرش پر ہر طرف برف کے ٹکڑے بکھرے اور نور کو دونوں ہاتھوں سے منہ میں برف ٹھونستے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ پھر چہرے کا تاثر سخت سرزنش میں بدلا۔ ''ہرگز نہیں۔'' اس نے ڈانٹ کر کہا اور نور کے ہاتھوں سے برف چھیننے لگی۔ ''کھانسی ہو جائے گی۔ بیمار ہو جائے گا۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''اوں اوں اوں...... تھاؤں دا، تھاؤں دا۔ میں پلیھ تھاؤں دا۔'' نور رونے اور چلّانے لگا۔

''اور اتنے گندے ہاتھ! چلو میں تمہیں نہلاتی ہوں۔'' وہ نور کو کمرے سے باہر لے جانے لگی۔ اتنی دیر میں وہ اپنے گندے پیر بڈھے کے سلیپروں میں پھنسا کر انہیں پہن چکا تھا۔ چھدری ٹانگیں کیے فرش پر چھپ چھپ کرتا وہ کسی بطخ کی طرح چل رہا تھا۔ جب سے اس نے چلنا شروع کیا تھا بڈھے کے چپل محفوظ نہیں رہے تھے۔ نور انہیں پہننے کا شوقین تھا۔ کتنی ہی بار جب وہ بستر سے اُترنے لگتا تو اس کے مومیائے پیر فرش پر چپل ڈھونڈتے رہ جاتے۔ اسے ننگے پاؤں دروازے تک جا کر پکارنا پڑتا۔

''ارے بھئی کوئی ہے۔ میرے سلیپر ڈھونڈ کر لاؤ۔''

وہ شدید کوفت سے ہاتھ مل کر بہو سے پوچھتا۔

''کیا اپنے جوتے بھی سب سے اُونچی شیلف پر رکھوں؟''

ان کے جانے کے بعد بوڑھے نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بستر کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے مومی پیروں کو دیکھنے لگا۔ جب سے نور نے چلنا سیکھا تھا اس کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اپنے چپٹے پیروں سے تھپ تھپ کی آوازیں نکالتا وہ ہر دروازہ تڑاق سے کھول کر کسی بھی کمرے میں جا گھستا اور کمرے کو تہہ و بالا کر دیتا۔ اس کے چہرے پر معصومیت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بوڑھے کو کبھی یہ عجیب سا احساس ہوتا کہ نور ایک بونا مرد ہے جو خشونت بھرا چہرہ لیے گھر بھر میں گھومتا پھرتا ہے۔ چلنے سے پہلے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ کئی بار گرا اور چوٹیں کھائیں مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

'' تم اس کو کچھ تمیز کیوں نہیں سکھاتیں۔'' بوڑھے نے بہو سے کہا تھا۔

'' سیکھ جائے گا تمیز۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔'' بہو نے کچھ غور کر کے تبصرہ کیا تھا۔

'' تعلیم یافتہ ہو کر بے جا لاڈ کر رہی ہو۔'' بوڑھے نے کہا تھا۔'' دو سال کا تو ہو گیا ہے...... بلکہ ڈھائی سال کا۔''

'' یہ کوئی عمر نہیں ہوتی۔'' بہو نے کہا تھا۔ مگر بڈھا جانتا تھا کہ نور بدتمیز تھا۔ وہ بوڑھے کے ہاتھ سے کوئی بھی چیز جھپٹ لیتا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گستاخی سے کہتا۔'' چھین لیا!''

اب گھر میں خاموشی چھائی تھی۔ بوڑھا چند لمحوں کی اس تنہائی اور خاموشی کا لطف لینا چاہتا تھا۔ کھڑکی کے پردے شام کی خنک ہوا میں لہرائے۔ باہر کسی اکیلی چڑیا کی الوداعی چہچہاہٹ سنائی دی۔ بوڑھے نے اس کی آخری آواز کان لگا کر سنی۔ '' چواٹ'' جیسی آواز۔ چوں چوں کی نہیں۔ اس آواز کو انگریزوں نے بہتر پکڑا۔ اس نے سوچا۔ انگریزی میں '' ٹواٹ'' کہتے ہیں۔ اس نے اپنے بستر کے ساتھ لگے شیلف پر سلیقے سے لگائی کتابوں پر نظر ڈالی جو وہ پڑھنا چاہتا تھا۔ نور میز دھکیلتا ہوا شیلف سے لگا دیتا اور میز پر چڑھ کر کتابوں تک پہنچ جاتا، ہر بار اسے بڑی مشکل سے ہٹایا جاتا۔'' کیا اب ہر طرف کٹہرا لگانا پڑے گا۔'' بوڑھے نے بہو سے کہا تھا۔

شام کی خاموشی میں گھر کا دروازہ چرچرایا۔ رات کو کھانا بنانے والی عورت آ گئی تھی۔ اب دن میں نور کو دیکھنے والی عیسائی عورت روما اپنے گھر لوٹ جائے گی۔ چولہے پر چائے کی کیتلی سنسنا رہی تھی۔ کھانے بنانے والی فاطمہ نے اسے آواز دی۔

'' سلام بابا...... چائے پیو گے؟'' وہ دودھ گرم کر کے چائے بنانے لگی۔ گھر میں اُبلتے دُودھ کی خوشبو پھیل گئی۔

'' ہاں...... نہیں...... اچھا پی لوں گا۔'' بوڑھے نے تذبذب سے کہا۔

بہو کے کمرے کا دروازہ بھڑاک سے کھلا اور ننگ دھڑنگ نور بھاگتا ہوا باہر آیا۔ ننگے بھاگتے ہوئے اس کی نونو بے تحاشا اُچھلتی تھی اس لیے وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بھاگتا تھا۔ بہو کپڑے ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے دوڑتی آئی اور اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے جانے لگی۔

'' کپڑے پہن لو، میرے لال، گڈ بوائے۔'' اس نے خبیث نور کی خوشامد کی۔ جب سے نور نے چلنا اور چلنے سے پہلے بھاگنے کی کوششیں شروع کی تھیں تب سے اس نے نونو پکڑ کر بھاگنے پر

اِکتفا نہیں کی تھی۔ وہ اپنی نونو کو صوفے سے کشن سے، بلکہ دیوار اور دروازے سے رگڑنے بھی لگا تھا۔ ساتھ ہی کھل کھلا کر ہنستا جاتا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بے حد خوش نظر آتا۔

''واہیات حرکت سیکھ رہا ہے۔'' بڈھے نے بہو کو تنبیہہ کی تھی۔ ''ہاتھ پر مارا کرو۔ پھر نہیں کرے گا۔''

''ہوں ...... ں۔'' بہو نے غور کیا تھا۔ یہ اس دَور سے نکل جائے گا۔ ''ابھی اس کی ایغو بن رہی ہے۔ روکوں گی تو برا اثر پڑے گا۔'' وہ اپنے خیال میں ماڈرن اور سائنسی خیال رکھنے والی عورت تھی۔ بڈھا چپ ہو رہا تھا۔ لیکن اس رگڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نونو سوج گئی۔ نور سوجی نونو کے ساتھ گھر بھر میں لنگڑاتا پھدکتا پھرا۔ بہو یہ دیکھ کر گھبرائی اور اسے اپنے ساتھ بچوں کے ڈاکٹر کو دکھانے اسپتال لے گئی۔

''ویزلین لگا دو۔ اب یہ خود سمجھ جائے گا۔ اِدھر اُدھر نہیں رگڑے گا اپنے آپ کو......'' بچوں کے ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا۔

''کوئی سیریس بات نہیں تھی۔'' بہو نے واپس آ کر اس سے کہا۔ ''آپ خواہ مخواہ اسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔''

''یہ چائلڈ مالیسٹر بن سکتا ہے۔'' بڈھے نے کہا۔ ''دوسرے بچوں کو اس سے محفوظ رکھنا پڑے گا۔'' لیکن بہو نے سنی اَن سنی کر دی۔

جب وہ خود کو رگڑتا تو اس کی طرف گردن پھیر کے کہتا۔ ''دیم ...... دیم!'' (گیم)

''یہ اچھا گیم نہیں ہے۔'' ایک بار اس نے سختی سے کہا تھا۔

''یہ اچھا دیم ہے۔'' نور نے حتمی انداز میں اعلان کیا، اس کی عادت بلکہ خصلت تھی کہ وہ ایسی ہر بات ضرور کرتا تھا جس سے اِسے منع کیا جائے۔ مثلاً وہ بڈھے کی عینک جھپٹ کر بھاگنے لگا تھا۔ وہ خود عینک لگا کر دیکھنے کی کوشش کرتا، عینک کو زبردستی چھینا بھی نہیں جا سکتا ورنہ وہ ٹوٹ جاتی۔ ہزار خوشامدوں کے بعد نور عینک بہت ناز اور غرور سے واپس کرتا۔ ورنہ اپنی ننھی آواز میں دُہرائے جاتا ''ے مِنی اے، مِنی اے۔'' (میری ہے۔)

بوڑھے کے کمرے کی ہر چیز گھر کی باقی اشیاء کی طرح ''مِنی'' یا ''مِنا'' ہو چکی تھی۔ پہلے تو وہ پوری بانہہ پھیلا کر بہت مکروہ انداز میں چیختا رہتا ''دو...... و ...... دو...... وا'' اور پھر کوئی بھی چیز چھین جھپٹ کر بھاگ جاتا۔ اب آپ گھر بھر میں اس کے پیچھے دوڑے پھرئیے۔ بڈھے کا سن اب

دوڑ بھاگ کا نہیں رہا تھا۔

ابھی وہ فرش پر رینگتا ہی تھا کہ ایک دن اُپنے کھلونوں سے کھیلتے، یا اس بہانے انہیں توڑتے ہوئے وہ بڈھے کی نقل کرتے ہوئے کھوں کھوں کر کے کھانسا تھا۔ پھر اکیلے بیٹھے بیٹھے ہنسا تھا۔ روما نے اس کی مصنوعی کھانسی اور کلکاری کی آواز سن کر مُنھ میں پلّو ٹھونس لیا تھا۔

''نونو! بری بات!'' اس نے سرزنش کی تھی۔ ''ناٹی بوائے!''

''تپ، تپ، تپ'' نور نے منہ پر اُنگلی رکھ کر روما کو ڈانٹا تھا۔ بڑوں کی طرح جلدی بولنے کی کوشش میں وہ پہلے تو مینڈک کی طرح ٹرانے لگتا اور پھر ناکام ہو کر سب کو چپ کرانے کی کوشش کرتا۔ گھر میں بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

فاطمہ بغیر شکر کی چائے اس کے لیے لے آئی۔

''بابا ٹھیک تو ہو۔'' اس نے کہا۔ اس وقت وہ عموماً ٹی وی دیکھتا تھا۔ آج بستر پر نیم دراز دیکھ کر فاطمہ نے پوچھا تھا۔ بڈھے کو نوکروں سے بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ دور کہیں مغرب کی اذان بلند ہو رہی تھی، کھڑکی میں جلتی بجھتی سی کوئی شے چمکنے لگی۔ بڈھے نے اپنی عینک کے شیشے صاف کر کے غور سے دیکھا، کھلی ہوئی کھڑکی میں شام کا پہلا تارا جھلملا رہا تھا۔

''یہ اچھا گیم نہیں ہے۔'' بڈھے کو یاد آیا۔ نور سے یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا تھا۔ بڑی بی تو رُخصت ہونے سے برسوں پہلے رُخصت ہی ہو گئی تھیں ایک طرح۔ انہوں نے مصلّی پکڑ لیا تھا۔ ان کی ہم عمر عورتیں انہیں ''صوفی'' کہنے لگی تھیں اور وہ؟ وہ خود......؟ اتنی لمبی زندگی میں کس قدر کم کوئی ایسا موقع آیا ہوگا۔ کالج لیکچرر کی زندگی ہوتی ہی کیسی ہے۔ شاید اب بدل گئی ہو۔ اس کے زمانے میں تو روکھی پھیکی تھی۔ سفید پوش اوسط طبقے کی احتیاط بھری زندگی جسے بزدلانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہاں ایک لڑکی بی اے پارٹ ٹو کی کلاس میں آئی تھی۔ انگریزی میں آنرز کر رہی تھی۔ اس ایک چھوٹی سی مہم جوئی پر بڑی بی نے کس قدر ہنگامہ کیا تھا۔ دونوں لڑکوں کو لے کر میکے جانے پر تیار ہو گئی تھیں۔

بڈھے کے ذہن میں گنی چنی یادیں تیرتی ہوئی اُتر رہی تھیں۔

یا پھر ایک دو بار......بس صرف ایک دو بار...... جب کبھی وہ کسی دُوسرے شہر گیا......

آبائی مکان پر بہن اور بہنوئی سے تنازع کیوں بڑھتا چلا گیا۔ اِسی مکان میں ان کا بچپن

بیتا تھا۔ اس کی بہن کا کہنا تھا کہ ایک دفعہ اس نے بہن کو جھولے سے گرا دیا تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک چھوٹا سا داغ آج بھی موجود تھا، اور اب، جب وقت گزرنے کے ساتھ اس کے ذہن میں سب سے پرانی یادیں زیادہ اُجاگر ہونے لگی تھیں تو اسے یاد آ رہا تھا کہ یہ سچ نہیں تھا۔ اس نے بہن کو نہیں گرایا تھا۔ رسّی کا جھولا شاید ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بہت سے حساب صاف کرنا چاہتا تھا۔

اس کے خفیف سے رعشہ زدہ ہاتھ میں چائے کی پیالی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

وہ بہت کچھ یاد کرنا چاہتا تھا۔ اپنی گزاری ہوئی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتا تھا۔ کوئی تھی صبح زندگی...... اور اب یہ اس کی شام زندگی تھی۔ ان پر غور کرنا چاہتا تھا وہ۔ لیکن ایسا تب ہی ممکن تھا جب اس کے سر پر دھڑا دھڑ شیلف سے کتابیں نہ گر رہی ہوں۔

بہو کے جاتے ہی نور گھر بھر میں ایک زلزلہ سا لے آتا۔ اُچھل کود، چھین جھپٹ، یا پھر خفگی آواز میں بک بک۔ ''اُٹھو...... بیٹھو۔ یہ مینا ہے۔ چھین لیا۔'' وہ جانوروں کی سی آوازیں نکالتا اور اسے شیر بن کر ڈرانے لگتا۔ ''ہا آ آ۔'' نور کس قدر برا اور بدصورت مُنھ بنا سکتا تھا! بڈھا دیکھ کر حیران رہ جاتا۔

''ہی لکس ای ول'' اس نے بہو سے کہا تھا۔

''بابا۔ نورالعین بالکل تمہاری شکل پر گیا ہے۔'' بہو کہتی۔ ''دیکھو تمہاری جیسی آنکھیں وہی ناک اور ہونٹ۔''

بڈھا چپ ہو رہتا۔ اخبار پڑھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ نور اخبار میں چھید کر دیتا اور اسے جھانک کر دیکھتا۔ ''بابا گندا بتہ ہے۔ بابا اچھائیں۔''

بہو نہا کر بالوں میں تولیہ لپیٹے کمرے سے باہر آئی۔ خوشبو کی ایک لکیر سی اس کے آگے آگے پھیلتی بڈھے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''بابا۔ اپنی بلڈ شوگر چیک کر لو۔ پھر میں تمہیں کھانا کھلاؤں گی۔ دو گھنٹے بعد پھر چیک کریں گے۔'' وہ گلوکو میٹر اس کے بستر کے ساتھ میز پر رکھ کر چلی گئی۔

اس کی شوگر پہلے بہو خود دیکھتی تھی۔ یہ اس کا اپنا اصرار تھا کہ وہ اپنے خون کی شکر کا خود معائنہ کیا کرے گا۔ وہ کسی کا مستقل احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ جب یہ صبح شام کا دستور ٹھہرا تو پھر وہ خود ہی کیوں نہ بوند بھر خون نکال کر دیکھ لے۔ اب ایسا بھی دوسروں پر کیا انحصار۔

کبھی کبھی چھوٹے والے کا فون آتا جو بیوی بچوں سمیت پانچ برس سے ہالینڈ جا بسا تھا۔

بڈھا زیادہ زور سے نہیں بول سکتا تھا۔ فون پر اِس کی بہو بات کرتی۔

''نہیں...... بیماری تو نہیں جائے گی۔ ہاں۔ یہ بوڑھے ہونے کا پروسیس ہے۔ ہاں ہاں۔ میڈیسن بہت ایڈوانسڈ ہوگئی ہے۔ تو ہم اِس پروسیس کو ڈِھیلے کرتے رہیں گے۔ بابا ٹھیک ہے۔ سب خیال رکھتے ہیں، چھوٹے......!''

''کیا بتا رہی تھیں؟'' وہ پوچھتا۔ وہ اخبار کے کاغذ کی طرح چرمرا گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنے ساتھ لمبے راستوں کے پار پھولوں بھرے گھنے درختوں کے پیچھے چھپے اپنے اسپتال لے جاتے ہوئے بہو اسے لمبا لیکچر پلانے لگتی۔ ہفتے میں دو بار وہ میڈیکل اسٹوڈنٹس کی کلاسیں لیتی تھی۔ اس کی باتیں سنتے سنتے بڈھے کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ وہ ایک چمڑے کا تھیلا ہے جس میں گوشت کے اعضا بھرے ہوئے ہیں۔ دل، کلیجی، پتہ، آنتیں...... اور خون...... ہاں خون بھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اِس میں شکر بھی ہو سکتی ہے!

بڈھے نے گلوکومیٹر کا سیاہ کیس کھولا۔ اس کی ایک جیب سے اسپرٹ میں بھیگا روئی کا ٹکڑا نکالا اور ہاتھ کی ایک اُنگلی کو صاف کر کے روئی کو میز پر رکھ دیا۔ کیس کی دوسری زپ کھول کر اس نے ٹیسٹنگ اسٹرپ نکالی اور میٹر میں لگا دی۔ پھر اس نے صاف کی ہوئی اُنگلی کو میٹر میں اُڑسی سوئی سے چھیدا کہ اتنے میں فرش پر زور سے کھٹ کھٹ کرتا نور اس کے کمرے میں گھس آیا۔ چہرے پر متانت اور ایک قسم کی خشونت لیے وہ اب ماں کی اُونچی ایڑی کے سینڈل پہن کر چلنے کی مشق کر رہا تھا۔

گلوکومیٹر دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ''دو...... و! دو!'' وہ پوری بانہہ پھیلا کر چلایا۔

خون کی ایک سرخ سرخ موٹی سی بوند بڈھے کی اُنگلی پر نمودار ہو رہی تھی۔ نور سینڈل اُتار کر کودتا اُچھلتا اس کے بستر پر چڑھ گیا اور میٹر چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہوں...... ہوں...... ہوں!'' بڈھا چیخا۔ اس نے خون کی بوند ٹیسٹنگ اسٹرپ پر لگانے کی کوشش کی لیکن نور اس کی گود میں کود پڑا۔ بوند بھر خون پتلی سی لکیر بناتا اُنگلی کی جڑ تک پہنچ گیا۔ اب ایک دوسری بوند اُبھر رہی تھی۔ خون دیکھ کر نور آنکھیں گول گول کر کے چلایا۔ ''توت لگ ئی بابا تو ہُو، ہو دیَ۔''

''بہو!'' بوڑھا بھرائی آواز میں چلایا۔

" کیا ہے بابا۔" باورچی خانے سے بہو کی آواز آئی۔ بڈھے کو باورچی خانے کے دروازے سے شب خوابی کے سرخ لباس میں اس کا شانہ نظر آیا۔

" اُٹھو، اُٹھو، اٹھو بابا۔ دو۔ مجھے دو۔ یہ مینا ہے۔ میں داکتل ہوں۔"

نور کہہ رہا تھا اور میٹر اس کے ہاتھ سے جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

" اب تو نہیں ہے ڈاکٹر...... ڈاکٹر کے بچے۔" بوڑھے نے بہ مشکل میٹر بچاتے ہوئے خون کی بوند اسٹرپ سے لگائی۔ میٹر سے سیٹی کی سی آواز آئی۔ بڈھے کی آنکھیں میٹر کی شفاف اسکرین پر گڑی تھیں۔ اپنے اُوپر چڑھے نور کی دھما چوکڑی میں اسے نظر ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسکرین پر کیا ہندسے نمودار ہو رہے ہیں۔ بالآخر اس نے پکار کر کہا۔

" سکسٹی...... ہاں سکسٹی ہی ہے۔"

اس نے میز پر اسپرٹ والی روئی ڈھونڈنے کی کوشش کی تا کہ اُنگلی کے باریک چھید کو روئی سے دَبا لے لیکن روئی تو نور کہیں پھینک چکا تھا۔

" روئی کہاں ہے۔" بڈھا بڑبڑایا۔

" لوئی لوئی۔" نور اس کی گود سے نیچے پھسل گیا۔ " یہ لئی" اس نے بستر کے نیچے سے روئی کا پھایا ڈھونڈ نکالا۔

بڈھے نے پھایا لے کر اُنگلی کو زور سے دبایا۔ اس دھینگا مشتی سے وہ ہانپنے لگا تھا۔

بابا دندا...... نہیں دیتا...... ہوں...... وں...... وں" نور نے بھیڑیئے کی طرح چھت کی طرف منہ اٹھا کر ایک بھی آنسو گرائے بغیر جھوٹا رونا شروع کیا۔ " ہوآں! ہو...... و...... آں۔"

بڈھے نے ایک لمبی سانس بھری اور ہونٹ بھینچ کر خباثت کے اس پتلے کی طرف دیکھا جو مُنھ بسورے اسے تک رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ اس ڈیڑھ فٹ کے فتنے کو دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے سینے میں برس ڈیڑھ برس سے پلتی کوئی شے آتش بازی کے انار کی طرح پھٹ گئی۔ پہلے وہ تھوڑا سا مسکرایا اور پھر نور کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بے تحاشا قہقہے لگا لگا کر ہنسنے لگا۔

" بابا ٹھیک ہو گیا۔" توے پر لپ جھپ روٹیاں ڈالتی فاطمہ نے برسوں میں کہیں آج اس کے قہقہوں کی آواز سن کر تعجب بھری خوشی سے کہا۔

بڈھے نے لمبا سانس لیا۔ اس نے بے یقینی سے انسولین کے انجکشن کو دیکھا جو سب سے

اُوپر کے شیلف پر اس کی بہو رکھ گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''اس بدمعاش کے ہوتے، کوئی ٹھیک سے بیمار بھی کیسے ہو سکتا ہے۔''

اس نے پھر ایک نظر نور پر ڈالی جو اپنے خیال میں اب بلی بن گیا تھا اور بڑے ناز نخرے سے ماؤں ماؤں کر رہا تھا۔ بڈھا پھر بہت زور سے ہنسا۔ ہنستے ہنستے اسے کھانسی ہونے لگی۔ ''ذرا پانی دینا'' اس نے کھانسی کے جھٹکوں میں کہا۔ بس اتنی ہی دیر لگی۔

جب بہو پانی کا گلاس لیے کمرے میں پہنچی تو بڈھا وہاں نہیں تھا حالانکہ بہت زیادہ ہنسنے سے اس کا چہرہ اب بھی سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی میز پر پڑا چشمہ نور نے اُٹھا لیا تھا اور اسے ناک پر ٹکائے غنغنا رہا تھا۔

''یہ مینا ہے...... مینا!''

باہر پھاٹک پر اس کے کام سے لوٹتے بیٹے کی گاڑی کا ہارن سنائی دے رہا تھا۔

فہمیدہ ریاض

ذلتّوں کے مارے لوگ

حال ہی میں دستوئیفسکی کا یہ ناول، جو اس کی ابتدائی، شاید دُوسری ناول ہے، اتفاق سے میرے ہاتھ لگی۔ ایک دوست کے کتابوں کے طاق میں اس پر میری نظر پڑی اور یہ سوچتے ہوئے بھی کہ میں اسے پہلے پڑھ چکی ہوں، میں نے اِسے اُٹھالیا اور گھر لے آئی۔

''ذلتوں کے مارے لوگ'' دراصل میں نے پہلے نہیں پڑھی تھی۔ اس کے بارے میں یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ اسی عنوان یا اس سے ملتے جلتے عنوان کی کئی کتابیں اُردو میں موجود ہیں جو سب تراجم پر مشتمل ہیں۔ گورکی کا ایک ڈرامہ بھی شاید اسی نام سے ترجمہ ہوا تھا اور پھر دی ریچڈ آف دی اَرتھ تو معروف کتاب ہے۔

اس کتاب میں میری بنیادی دلچسپی یہ بھی تھی کہ ظ۔ انصاری طویل مدت تک روس میں رہے تھے اور ناول کو انہوں نے براہ راست روسی سے ترجمہ کیا تھا۔ خیر ترجمے میں یوپی کی اُردو کے محاوروں کا مسلسل استعمال تو کھٹکتا ہے۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کردار پیٹر سبرگ کی جگہ کانپور یا آگرہ کے کسی مفلوک الحال محلے کے باسی ہیں۔ میری نظر میں ترجمے کی زبان ایسی ہونی چاہیے کہ جس دیس کی زبان میں اصل کہانی لکھی گئی ہو وہاں کی بو باس اور زبان کی سانس قاری کو محسوس ہوتی رہے۔ میں خود ترجمہ کرتے ہوئے یہی کوشش کرتی ہوں۔ نجیب محفوظ کی ناول ''افراح القبہ'' کا ترجمہ کرتے ہوئے میں برابر اصلی عربی ناول کا بھی مطالعہ کرتی رہی تھی حالانکہ عربی زبان سے میری واقفیت بس اتنی ہی ہے جتنی کسی بھی مسلمان کی بچپن میں قرآن شریف پڑھنے کے باعث ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اصل متن پڑھ پڑھ کر ترجمہ کرنے سے شاید کچھ فرق پڑا ہو کیونکہ دراصل وہ مصری عربیت جو زبان کے لحن میں رواں ہے، ناول کے کرداروں اور اس طرح خود کہانی کا اہم حصہ ہے

اور کرداروں اور واقعات کی سمت کے قطب نما کا کام کرتی ہے۔

''ذلتوں کے مارے لوگ'' جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا، مصنف کی اوّلین کتابوں میں سے ہے، گویا مصنف ابھی لکھنا سیکھ رہا تھا۔ یہ نومشقی ہے لیکن آہ! نومشقی بھی تو ایک دیوقامت ادیب کی ہے، اور اسی لیے ایک دو بار کتاب پر شروع سے آخر تک سرسری نظر ڈال کر میں نے اسے ابتداء سے پڑھنا شروع کیا اور اس کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالا۔

ناول کی کہانی ''راوی'' کے ذریعے بیان کی گئی ہے جو کہانی میں بھی ایک ناول نگار ہے۔ وہ کہانی کا کردار بھی ہے جو ہیروئن نتاشا سے بہت پاکیزہ عشق کرتا ہے۔ یہ کردار ناول میں بہت حد تک ''خیر'' کی علامت ہے۔

کہانی کا بافتہ پیچیدہ ہے جس میں متعدد کردار ہیں۔ نتاشا کے بوڑھے ماں باپ ایک طالع آزما اور حریص پرنس کی جائداد کے نگراں ہیں۔ پرنس اپنا بن ماں کا نوجوان بیٹا الیوشا قصبے میں نتاشا کے گھر رہنے کے لیے بھیجتا ہے اور ان دونوں میں عشق ہو جاتا ہے لیکن پرنس نتاشا کے ماں باپ پر غبن کا الزام لگا کر انہیں برطرف کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نتاشا اور الیوشا کی شادی کا سخت مخالف ہے۔ نتاشا کے والد اپنی توہین پر بہت جھلاتے ہیں لیکن نتاشا گھر چھوڑ کر الیوشا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اس طرح اس کے والد مزید ذلیل ہو جاتے ہیں (کیونکہ ان کی بیٹی بھاگ گئی۔ یہ ناول پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ لڑکیوں کا کسی کے ساتھ بھاگ جانا میرے بچپن کے زمانے میں اکثر سننے میں آتا تھا اور یہ بے انتہا ذلت کی بات تھی۔ لوگ مُنھ پر ہاتھ رکھ کر بتاتے تھے، ''فلاں کی لڑکی بھاگ گئی۔'' اب یہ سننے میں نہیں آتا۔ کم از کم بڑے شہروں میں تو نہیں۔ غالباً اب ماں باپ پسند کی شادی کو ماضی سے کچھ بڑھ کر قبول کرنے لگے ہیں۔ اگر وہ شدید مزاحمت کرتے ہیں تو متعدد این جی اوز چیونٹیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ یہ کسی قدر خوش گوار تبدیلی ہمارے سماج میں واقع ہوئی ہے! لیکن اُس دور میں یہ بے حد مذموم فعل گردانا جاتا تھا۔ ماں باپ بلکہ پورا خاندان کہیں مُنھ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ ان کی ناک کٹ جاتی تھی اور ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں سے محلے اور برادری میں لوگ ملنے جلنے سے پرہیز کرنے لگتے تھے کہ آمنا سامنا ہونے پر خواہ مخواہ شرمندگی ہوگی۔ لڑکی کے بہن بھائیوں کا پھر کہیں رشتہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ تو انیسویں صدی کے وسط تک روس میں بھی حالات اس سے ملتے جلتے

تھے)۔

وانیا (یعنی راوی) ایک ایسی کھولی میں رہتا ہے جہاں ایک بوڑھا کبھی رہا کرتا تھا جو مر گیا۔ بعد میں قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اکلوتی بیٹی بھی اس کو تنہا چھوڑ کر پرنس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ پرنس کے مجبور کرنے پر وہ باپ کی تمام جمع جتھا اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ پرنس نے تمام رقم اپنے قبضے میں لینے کے بعد اسے گھر سے نکال دیا جبکہ وہ حاملہ تھی۔ لیکن رقم حاصل کرنے کے لیے پرنس کو اس لڑکی سے شادی کرنی پڑی تھی۔ اس طرح لڑکی سے پیدا ہونے والی بچی ''نیلی'' اس کی جائز اولاد تھی لیکن وہ نہ کبھی اس سے ملا اور نہ اس کی خیر خبر لی۔ بارہ تیرہ برس کی اس لڑکی پر مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ پرنس کا بیٹا الیوشا ایک ایسا دلکش بیس سالہ نوجوان ہے جو کسی بچے کی طرح بھولا بھالا ہے اور ہمیشہ صرف سچ بولتا ہے۔ وہ نتاشا سے بے حد محبت کرتا ہے اور نتاشا سے شادی کرنے کے منصوبے بناتا ہے، لیکن ان منصوبوں پر کس طرح عمل کیا جائے، اس کے بارے میں اسے کوئی اندازہ نہیں۔ وہ ذہین ہے لیکن سمجھ داری سے عاری ہے۔

پرنس اپنے بیٹے الیوشا کی شادی ایک ایسی لڑکی کیترینا سے کرنا چاہتا ہے جس کے نام اس کا مرحوم باپ تیس لاکھ روبل چھوڑ گیا ہے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ اپنے احمق بیٹے کی شادی اسی لڑکی سے کر کے تیس لاکھ روبل اپنے تصرّف میں لے آئے گا۔ اس لیے وہ الیوشا کو اس لڑکی سے ملواتا ہے۔

نتاشا کی یہ نوجوان رقیب کیترینا خود ایسی بھولی بھالی، ذہین اور دلکش لڑکی ہے کہ الیوشا اس سے بھی شدید محبت کرنے لگتا ہے۔ پرانا عشق رفتہ رفتہ اس کے دِل سے کم ہوتا جا رہا ہے اور نتاشا کو اس کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن الیوشا کی وفاداریاں نتاشا ہی کے ساتھ ہیں۔ پرنس انتہائی مکاری سے بالآخر الیوشا کو نتاشا سے جدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ الیوشا کی دلی کیفیت بھانپ کر نتاشا بھی اس بات پر رضامند ہو جاتی ہے۔ نیلی کی زبانی یہ کہانی سن کر کہ کیونکہ اس کے نانا نے اس کی ماں کو معاف نہیں کیا تھا اسی لیے اس نے کسی طرح تڑپ تڑپ کر جان دی، نتاشا کے والدین پر بہت اثر ہوتا ہے اور وہ نتاشا کو معاف کر دیتے ہیں۔ ایک ہولناک دورہ پڑنے کے بعد نیلی مر جاتی ہے اور وانیا اور نتاشا ایک دوسرے کے ساتھ چین اور سکون کی زندگی گزارنے کے لیے بالآخر ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں۔

تو ناول کی اسٹوری لائن تو یہ ہے جو کھینچ تان کر بنایا ہوا ایک ناقابل یقین قسم کا قصہ ہے لیکن عیار دستوئیفسکی کا مقصد ہمیں کہانی سنانا ہوتا ہی کب ہے۔ وہ تو ہمیں ایک داخلی جہنم میں کشاں

کشاں لیے پھرتا ہے۔ اس کا اصل مقصد قاری کی اندرون ذات کے چیتھڑے اُڑانا ہوتا ہے اور اس میں وہ اس نومشقی کے ناول میں بھی اذیت ناک طور پر کامیاب ہے۔

ناول کے طویل مختصر پیش لفظ میں ظ۔ انصاری نے بالکل دُرست لکھا ہے کہ یہ ناول دراصل دستوئیفسکی کے آنے والے عظیم شہکاروں کا دروازہ ہے۔ اس میں ہمیں ان کرداروں کے اوّلین خط و خال نظر آتے ہیں جو بعد میں ''کرامازوف برادران''، ''جرم اور سزا'' اور ''ایڈیٹ'' جیسے شاہ کاروں میں اپنی تکمیل کو پہنچے، لیکن ظ کی نظر اس مخصوص فرق پر نہیں پڑی جو ''ذلتوں کے مارے لوگ'' اور بعد کی آنے والی ناولوں میں ہے۔ جو بات میں نے خاص طور پر محسوس کی وہ یہ ہے اس دور میں دستوئیفسکی کو انسان (ہر انسان) کی بنیادی اچھائی اور نیکی پر زیادہ پختہ یقین تھا۔

کہانی کا بنیادی کردار دراصل پرنس ہے۔ وہ مکمل بدی اور شر کا پیکر ہے۔ وہ لذتوں کا شیدائی ہے، بے حد دُنیا دار ہے، لیکن وہ نہایت ذہین، تعلیم یافتہ اور سمجھ دار بھی ہے۔ ایک طرح وہ انسانی ''عقل'' ہے، ایسی عقل جسے ہمارے صوفیاء نے ''ابلیسی'' قرار دیا۔ لیکن اس میں خیر بالکل مفقود نہیں ہے۔

یہ دو رُخی ہمیں پرنس کے کردار میں نظر آ سکتی ہے۔ مصنف ذکر کرتا ہے کہ نتاشا کے والد کے بارے میں اسے واقعی غلط فہمی ہوگئی تھی جس کی بنیاد پر اس نے اسے برطرف کیا۔ وہ مقدمہ جیت گیا اور نتاشا کے باپ کو رہی سہی جائداد فروخت کر کے دس ہزار روبل کا ہرجانہ دینا پڑا۔ تب تک پرنس کی غلط فہمی دُور ہوگئی تھی۔ پرنس اس رقم کے ساتھ عجیب سلوک کرتا ہے۔ پہلے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ رقم نتاشا کے باپ کو واپس کر دی جائے، لیکن اس کا باپ شدید طیش میں حقارت سے رقم کو ٹھکرا دیتا ہے تو پرنس اسے چندروز کے لیے جیل کی ہوا کھلا دیتا ہے۔ بعد میں پرنس کوشش کرتا ہے کہ الیوشا سے دستبردار ہونے کے صلے میں یہ رقم نتاشا کو دے دے لیکن نتاشا بھی یہ رقم اس کے مُنھ پر دے مارتی ہے تو وہ اسے بے حد توہین آمیز باتیں کہتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ وہ منصوبہ بنا رہا ہے کہ نتاشا کو ایک عیاش کاؤنٹ کی داشتہ بنا دیا جائے۔

''یہ کاؤنٹ آپ کے مفلوک الحال باپ کے بھی کام آئے گا'' وہ نتاشا سے کہتا ہے تاکہ وہ ذلت سے پاگل ہو جائے۔ ناول میں وانیا ایک جگہ پرنس سے ہرجانے کی اس رقم کے بارے میں پوچھتا ہے۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ رقم آپ کی ہے؟''

پرنس کہتا ہے کہ یہ رقم اسے عدالت نے دی ہے۔ اس لیے وہ اسے اپنی سمجھتا ہے۔
''لیکن آپ کا ضمیر کیا کہتا ہے؟'' وانیا پوچھتا ہے۔
اس سوال پر وہ بے حد چڑ جاتا ہے لیکن اس سنگ دل انسان کے پتھر کی کسی گہرائی میں وہ اس رقم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بلکہ اسے نتاشا کے خاندان کو دے دینے کی دو کوششیں کرتا ہے، لیکن یہ کوششیں وہ اپنے غلیظ طریقے سے ہی کرتا ہے جس میں اپنے ظلم اور زیادتی کے شکار مظلوموں کی اہانت کا پہلو نمایاں ہو، لیکن یہ حقیقت دبائے نہیں دبتی کہ پرنس دراصل اس رقم کو اپنی نہیں سمجھتا۔ تب کیا یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی؟ اور کیا ایسے شخص میں بھی جو بدی کی عمیق ترین گہرائی میں کیچڑ میں لوٹ رہا ہو اور جس کی سب سے بڑی تسکین نیکی کے ہر خیال اور عمل کا مضحکہ اُڑانے سے وابستہ ہو؟
پرنس وانیا سے کہتا ہے۔ ''میں اس قدر اُکتا چکا ہوں، اِن سب معصومیتوں سے، الیوشا کی ان پاک دامانیوں سے، شیلر کی سی شاعرانہ حرکتوں سے، ان بدبخت تعلقات کی بلندیوں سے...... کہ موقع ملے تو ان پر ٹوٹ پڑوں۔
مجھے یہ شوق بھی ہے کہ خود بھی ایسا جامہ پہن لوں، اسی انداز میں بات کروں اور پھر ایک دم ان پر کاری ضرب لگاؤں، ان کا منہ چڑاؤں اور عین اس وقت اپنی زبان نکال کر دکھاؤں جب اس کا امکان ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔''
''ہاں میں بھی سچ بول سکتا ہوں اور سچ کہوں گا کہ مجھے دولت سے، اثر و رسوخ سے، محبت ہے، اگر ہر انسان اپنے رازدارانہ خیالات کہہ دے جو وہ سب سے چھپاتا ہے، اپنے عزیز دوست کو بھی ان کی ہوا نہیں لگنے دیتا بلکہ خود اپنے دل میں اِن کا اقرار کرتے ہوئے گھبراتا ہے، تو دُنیا میں ایسا تعفن پھیل جائے کہ ہم سب کے دَم گھٹ جائیں۔ اِسی لیے ہماری سماجی عادات بہت خوب ہیں ، یعنی نیکی کا ذکر کیے جانا، اس میں اپنی حفاظت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور تسکین مدنظر ہے۔ اخلاق اور ہے کیا؟ یعنی وہی تسکین، یعنی تسکین کے پیش نظر ہی اخلاق کو وضع کیا گیا ہے......''
پرنس وانیا کو یہ ''لطیفہ'' بھی سناتا ہے کہ دماغی اسپتال کا ایک مریض ایسا تھا جو ننگ دھڑنگ ہو کر خود کو ایک برساتی میں لپیٹ لیتا تھا اور سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے کسی راہ گیر کے سامنے اچانک برساتی اُتار دیتا تھا گویا اپنی روح کی منظر کشائی کر رہا ہو یہ منظر بس لحہ بھر کا ہوتا تھا۔ اس کے بعد خود کو دوبارہ برساتی میں لپیٹ کر شاہانہ وقار سے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس گفتگو میں پرنس کہتا ہے۔
''سنو میرے عزیز! مجھے اب تک یقین ہے کہ زمین پر عیش و مسرت کے ساتھ رہنا ممکن

ہے۔ یہی عقیدہ بہترین عقیدہ ہے۔ اس کے بغیر آدمی بے مسرت زندگی بھی بسر نہیں کرسکتا۔ سوائے اس کے کیا دھرا ہے کہ آدمی زہر گلے سے اُتار لے۔ ایک شخص نے یہ بھی کیا تھا۔ وہ فلسفہ بگھارتا رہتا تھا یہاں تک کہ ہر شے کو تباہ کر کے رکھ دیا اور انسان کے قدرتی فریضوں کے جواز تک کو مٹا دیا۔ پھر آخر میں کیا رہا؟ کچھ نہیں۔ پھر اس نے اعلان کر دیا کہ زندگی میں بہترین شے زہر ہلال ہے۔''

''میں کسی فرض شناسی یا ذمہ داری کو اس وقت مانتا ہوں جب دیکھ لوں کہ اس سے مجھے فیض پہنچے گا۔ میرے سامنے کوئی آدرش نہیں ہیں۔ نہ مجھے ان کی تمنا ہے اور نہ کوئی ضرورت نظر آتی ہے۔ آدمی ان کے بغیر بھی بڑی خوش و خرم زندگی گزار سکتا ہے۔'' اور آپ ان الفاظ کی ممکنہ سچائی پر لرزتے ہیں اور کمزوری سے بدبداتے ہیں کہ ''دوسری طرف، آدرشوں کے بغیر تو غالباً تہذیب و تمدن ممکن ہی نہ ہوتے۔'' اور یہ بھی کہ کیا بدبخت دستوئیفسکی زبان نکال کر ہمارا منہ چڑا رہا ہے؟ پرنس کہتا ہے۔

''آپ آدرش کی تمنا میں ہیں؟ اعلیٰ صفات کی آرزو میں تڑپتے ہیں، لیکن میں کیا کروں کہ اس حقیقت سے آنکھ نہیں چرا سکتا کہ تمام انسانی اوصاف کی گھٹی میں انتہائی شدید قسم کی خود پسندی پڑی ہے۔ کوئی چیز جتنی پاک اور پاکیزہ ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ اس میں خود پسندی ہوتی ہے۔'' وہ کہتا ہے۔

''میں خوش ہوں کہ زہر ہلاہل کے بغیر کام چلا سکتا ہوں۔ سب سے بڑھ کر جو چیز مجھے پسند ہے وہ ہیں عورتیں، خفیہ اور دَر پردہ عیاشیاں! جتنی انوکھی اور اُچھوتی ہوں اتنا ہی خوب، بلکہ ان میں اگر تھوڑی فحاشی شامل ہو تو لذّت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہا ہا ہا۔ یہ سن کر آپ کے چہرے سے میرے لیے کتنی نفرت برس رہی ہے۔''

''بجا فرمایا۔'' وانیا نفرت سے کہتا ہے۔

خیر فرض کیا آپ حق بجانب ہی سہی، لیکن ذرا سوچیے تو۔ ذرا سی فحاشی زہر ہلاہل سے تو بہتر ہے...... ہے نا؟''

یہ پڑھ کر قاری ہنس پڑتا ہے۔ بہر حال وہ اکیسویں صدی کے اوائل میں بیٹھا ہے، لیکن کیا دستوئیفسکی بھی یہ لکھ کر نیکیوں اور قربانیوں کو ہر قیمت پر ترجیح دینے پر ہنس رہا تھا؟ کیا اس کی زندگی بھر کی مسیحانہ کاوش محض تعفن کو نہ پھیلنے دینے کی کوشش تھی کہ انسان کی اصلیت آشکار کرنے کی صورت میں خود انسان کا ''دَم گھٹ جائے گا؟''

نہیں...... یقیناً ایسا نہیں تھا، کیونکہ وانیا اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے۔

''نہیں نہیں، زہر ہلاہل بہتر ہے۔'' لیکن پرنس کہتا ہے۔

''مجھ جیسے بہت لوگ ہیں دُنیا میں، اور ہم واقعی مزے میں ہیں۔ ہم کبھی نہیں مٹ سکتے۔ ہم جاندار اور پائدار ہیں۔ ٹھوس اور مستحکم ...... کبھی آپ کے دماغ میں یہ بات آئی کہ فطرت خود ہماری حفاظت کرتی ہے۔ ہی، ہی، ہی......''

پرنس نیلی کی ماں کے لیے کہتا ہے۔ ''وہ رقم میں نے اس سے چھینی نہیں تھی۔ اس نے اپنی خوشی سے مجھے دی تھی۔ اس طرح وہ میری ہو چکی تھی۔ پھر بھی علیحدگی کے وقت اگر آپ کہتے ہیں کہ مجھے وہ رقم واپس دے دینی چاہئے تھی تو ذرا سوچئے کہ اتنی بڑی رقم ایک دَم میرے ہاتھ کیونکر آ سکتی تھی؟ اس پر وہ چیخ چلا رہی تھی کہ جاؤ وہ رقم میں نے ہمیں بخش دی۔ میں نے بھی سوچا کہ رقم واپس کر کے خواہ مخواہ اسے کیوں رنجیدہ کروں۔ یقین کیجئے میرے دوست کہ ستم زدگی میں واقعی ایک اُونچے درجے کی لذّت میسر ہوتی ہے کہ آدمی اپنی طور پر بجا سوچ کہ نہیں بلند و برتر ہوں اور مجھے پورا حق ہے کہ میں ستم ڈھانے والے کو پاجی اور کمینہ کہہ کر کوسے جاؤں۔''

''بعد میں شاید اس عورت کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہ رہا ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خوش ہوگی۔ اسی لیے میں نے وہ رقم اسے کبھی واپس نہ دی...... کسی شخص میں دریا دلی کے آثار جس قدر نمایاں ہوں گے اتنا ہی اس کی ذات میں نہایت، گھناؤنے قسم کی خود پرستی بڑے پیمانے پر ہوگی۔''

سچ، سچ، سچ!! افسوس کہ یہ سب سچ ہے۔ پھر بھی ...... پھر بھی پرنس سے بحث کی جا سکتی تھی (جو اس ناول میں وانیا نے نہیں کی)۔ اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ جب کہ وہ کھلے دل و دماغ سے اور ایک بے عصیاں انداز میں کہتا ہے کہ ''ساری دُنیا میرے لیے بنی ہے۔'' تو پھر خود کو پسند کرنے کو وہ گھناؤنا کس بنیاد پر کہہ سکتا ہے؟ نیکی کے کام سے، دریا دِلی سے، اگر انسان خود کو سراہنے لگنے کی احمقانہ تسکین حاصل کرتا ہے تو کم از کم اس سے دوسروں کو بھی تو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر بیہودہ بحث ہوگی اور یہ کم از کم ''کس درجہ قابل رحم اور حقیر ہے۔ بدبخت دستوئیفسکی ہمارے مُنھ پر تڑاتڑ طمانچے مارتا چلا جاتا ہے۔

پرنس سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اس کا یہ خیال کہ ظلم اور زیادتی کا شکار ظالم کو صرف حقیر سمجھنے پر مطمئن ہو جاتا ہے، غلط ہے۔ کم از کم نیلی کی حد تک یہ بات واضح ہے کہ وہ اس پر مطمئن نہیں۔ وہ اسے سزا دینا چاہتی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ نارسائی کے باعث وہ سزا دینے سے معذور

ہے، لیکن چند لمحوں میں اس سے روبرو ہونے پر وہ اپنے کمزور سے، بچکانہ ہاتھوں سے اس کا چہرہ کھسوٹ ڈاتی ہے اور اس پر ایک جنگلی جانور کی طرح حملہ آور ہوتی ہے، لیکن وہ پرنس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔

پرنس سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ خود پرستی کو گھناؤنا سمجھتا ہے تو اس کی ضد یعنی ''پاکیزہ'' کو حقیقی گردانتا ہے اور ایک مسخ آرزو اس کے گندے خیالات کی تہہ میں زندہ ہے کہ کاش کچھ حقیقی معنوں میں پاکیزہ بھی ہوتا جو خود غرضی سے پاک ہوتا تو آخر یہ آرزو کیا ہے؟ اور وہ اس کی تفہیم کیونکر کرسکتا ہے؟

دستوئیفسکی نے ''سزا'' کی اہمیت، بحیثیت ایک جرم کو دھو دینے والے علاج کے اپنے عظیم ناول ''جرم و سزا'' میں متشکل کی ہے۔ لیکن سزا زیادتی کے شکار کی جانب سے نہیں بلکہ سماج کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اسی طرح سزا سے ذاتی انتقام کا کانٹا نکل جاتا ہے۔ وہ غیر ذاتی اور معروضی بن جاتی ہے اور ایک تھیراپی کا کام کرسکتی ہے۔ کیا واقعی؟ بگڑے ہوئے سماجوں میں تو ایسا ممکن ہی نہیں۔ افسوس، شاید یہ ہمارے پیارے عیسائی مصنف کی خوش فہمی ہی تھی۔ یا نہیں! کون کہہ سکتا ہے۔ مثلاً آپ پاکستان کے کسی جیل خانے میں جائیں تو بمشکل اس تاثر کے ساتھ واپس آئیں گے کہ یہاں سزا مجرم کی بیمار رُوح کے لیے تھیراپی کا کام کر رہی ہے۔ دستوئیفسکی کی یہ بلند خیالی...... جس میں حیرت انگیز سچائی موجود ہے، ہر فرد یا ہر سماج پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ غالباً...... وہ اپنی بات بہت سے عناصر کے درست ہونے پر انحصار کر کے کہہ رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ منصف واقعی غیر جانبدار ہوں اور سچائی کی تلاش میں ہوں اور پولیس آفیسر واقعی مجرم کو تلاش کرتے ہوں، لیکن اگر سب ہی رشوت خور ہوں یعنی پرنس کے قبضے میں آچکے ہوں تو پھر کہاں کا جرم اور کیسی سزا!

خیال آتا ہے کہ اس پر دستوئیفسکی یہ کہتا کہ اگر تمام معاشرہ اس گھناؤنی حد تک مجرم ہے تو پھر تمام مجرم افراد درحقیقت معصوم ہیں اور شاید سب کو بتسمہ دینے دوڑ پڑتا۔ ''ابھی نہیں حضت! یہ آپ کا جبہ بھی اُتار لیں گے''، ہم کہتے مگر وہ کہاں کسی کی سننے والا تھا۔ کم بخت کو اپنے موقف پر کسی قدر پختہ یقین تھا۔ گویا وہ اپنے ایقان پر انسانی رُوح کے عمیق ترین مشاہدے اور ناقابل نفی ثبوتوں کے بعد پہنچا ہو۔

ان کرداروں کا اندرونی نقشہ قابل غور ہے۔

حرص و ہوس کے پتلے پرنس نے دو اولادیں پیدا کی ہیں۔ الیوشا، جو مجسم صداقت ہے اور

نیک ہے۔ دُنیاداری سے وہ قطعی بے بہرہ ہے، ساتھ ہی اپنے اعلیٰ خیالات کو عملی جامہ پہنانے سے بالکل قاصر ہے۔ وہ اپنے باپ کے ظلم اور زیادتی کو اکثر نظرانداز کرتا رہتا ہے۔ ساتھ ہی یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ اس کا باپ اسے وثیقہ دینے میں کمی نہیں کرے گا۔ (گو ''نیکی'' دراصل ''شر'' کے وثیقے پر ہی زندہ ہے)۔ ساتھ ہی یہ بے حد نیک اور صادق الیوشا متلوّن مزاج بھی ہے۔ اس کی پسندیدگی ڈھل مل سی ہے۔ یہ پرانی محبت سے اُکتا کر نئے حسن پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اس کی نیکی اور اعلیٰ خیالی پرنس کے سامنے بے بس ہیں۔

پرنس کی دُوسری اولاد ''نیلی'' ہے۔ دُبلی پتلی، کمزور، زرد رو، بیمار، لیکن ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ آہن وفولاد سے بنا ہوا ہے۔ اپنی مظلومیت کو اس نے اپنی داخلی قوّت میں تبدیل کرلیا ہے۔ نیلی وہ ہے جو معاف نہیں کرتی۔ وہ اپنے اُوپر ڈھائے جانے والے ہولناک ظلم کے لیے عفو و درگذر سے کام لینے کو مسترد کرتی ہے۔ (یعنی حضرت عیسیٰ کا کہنا نہیں مانتی) لیکن وہ کس قدر دلکش ہے! اس کی سیاہ آنکھیں ہمیشہ چمکتی رہتی ہیں۔ اس کے ترشے ہوئے لبوں پر ایک افتخار ہے۔ وہ ظلم سے اور ظلم کرنے والے سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ دونوں نے پرنس کو معاف نہیں کیا، لیکن اس بے پناہ طیش کا نتیجہ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں نکلا کہ دونوں بے کسی کی موت مر گئیں۔ یہ طیش اور نفرت پرنس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

اس طرح گمبھیر بدی کی دونوں اولادیں، الیوشا کی شرافت، اعلیٰ خیالی اور محبت، اور نیلی کی بدی سے شدید نفرت، اس کا طیش، دونوں بے بس ہیں۔

نتاشا سمجھدار لڑکی ہے اور بات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ پرنس کی عیاری اور مکاری پر اسے کھری کھری سناتی ہے۔ اس کے اوصاف اعلیٰ ہیں۔ وہ الیوشا کی بنیادی نیکی اور صداقت سے بہت گہری محبت کرتی ہے اور اسی لیے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ مجبور ہوتی ہے الیوشا کے دل کے تلون کے ہاتھوں، جس پر اس کا اختیار نہیں۔ بالآخر وہ الیوشا سے دست بردار ہو جاتی ہے۔

نتاشا ناول میں ''عقل'' کے ایسے پیکر کے طور پر اُبھرتی ہے جو ''عقل نکو'' ہے، جو ابلیسی نہیں، نیک ہے، لیکن آہ کہ متلون دل (الیوشا کے دل) کے آگے اس کی کچھ پیش نہیں چلتی۔ وہ لبوں پر ایک مغموم تبسم لیے اسے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ الیوشا کی مستقل مزاجی اور اعلیٰ ظرفی پر اس کے تلوّن کے حاوی ہو جانے میں پرنس کی منصوبہ بندی اور عیاری کا بھی ہاتھ ہے۔ اس طرح دل کے تلوّن اور شر کے پوشیدہ امتزاج کے سامنے یہ عقل نکو بھی بے بس ہے، حالانکہ اس کے لیے الیوشا پھر

بھی پیار کے قابل ہے اور ہمیشہ رہے گا، کیونکہ وہ ہے ہی اتنا بھولا بھالا، اتنا پیارا، ہمیشہ سچ بتانے والا شخص!

رہے وانیا تو پرنس ان کے لیے کہتا ہے "آپ بھی خوب ہیں۔ الیوشا آپ کی منگیتر کو لے اُڑا اور آپ ہیں کہ دونوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ یہ تو بڑی شرم کی بات ہے۔"

اس ناول میں وانیا، یعنی مجسم خیر و نیکی، پادری نہیں ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ خود حضرت عیسیٰ ہے۔ یہ ہر شخص کی رُوح کی گہرائیوں میں جھانک لیتے اور سب کو تسلی دیتے ہیں۔ صرف پرنس کے لیے وہ محبت کا اظہار نہیں کرتے اور نہ اسے تسلی دیتے ہیں۔

"ذلتوں کے مارے لوگ" نفس انسانی کی اس جان لیوا کش مکش کا ڈرامہ ہے جو پوری کتاب پر محیط ہے۔

ساتھ ہی ایک اور مشاہدہ کرنے پر قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے ناول کے تمام کردار Passive ہیں۔ وہ سب مفعول محض ہیں۔ صرف پرنس ہے جو فعال اور متحرک ہے۔ وہ منصوبہ بندی کرتا ہے، انہیں عملی جامہ پہناتا ہے، دوسرے کرداروں پر کڑی نظر رکھتا ہے، کبھی انہیں چھوٹ دیتا ہے اور کبھی ان کا راستہ مسدود کر دیتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ شوق اس بات کا ہے کہ وانیا (حضرت عیسیٰ یا روح عیسائیت) کو اپنی سطح تک گھسیٹ لائے۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر گپ شپ کرے۔ اس سے دوستی گانٹھ لے۔ بس اس کاوش میں وہ ناکام رہتا ہے۔ دستوئیفسکی کی دوسری تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی انسان کی پہیلی ہے۔ بقول قرآن شریف، یعنی اگر اس کی تطبیق کریں تو وانیا پرنس کا راز ہے۔ لیکن کیا پرنس بھی، نعوذ باللہ، وانیا کا راز ہوسکتا ہے؟

دستوئیفسکی ایسا نہیں سوچتے۔ تمام کرداروں میں صرف وانیا ہی ہے جو پرنس پر کسی قسم کا انحصار نہیں کرتا۔ وہ ازخود پرنس پر بس اس حد تک اثر انداز ہوسکتا ہے کہ اپنی سازش اور عیاری کے ذریعے وہ نتاشا کو ازخود الیوشا کو ترک کرنے پر آمادہ کرے (یعنی عقل نکو، متلون دل سے ممتا بھری محبت تو کرے لیکن اس کو اپنا واحد رفیق بنانے کا خیال ترک کر دے اور حضرت عیسیٰ کے ساتھ چل دے!)

ناول میں یہ نتاشا کا مقسوم نہیں، صرف امکان ہے۔ ناول کا آخری جملہ، جب کہ وہ نیلی کو دفنانے کے بعد باغ میں سہ پہر کی سنہری دھوپ میں کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے ہیں، تب ان کی نگاہیں کہتی ہیں۔

''ہم ایک دُوسرے کے ساتھ چین کی زندگی گزار سکتے تھے۔''

اوہو ہو! کیا دماغ، کیا دل، کیا انسان گزر گیا، ڈیڑھ دو سو برس پہلے!

نیکی کی تہہ میں خود پرستی پر ہمارے صوفیائے کرام نے بھی بہت غور وخوض کیا۔ یہ سوال ابتدا ہی سے ان کے سامنے منڈلاتا رہا ہے۔ اگر دستوئیفسکی صوفیا کے ملفوظات پڑھتا تو ششدر رہ جاتا۔ مگر مجھے ایسا کوئی سراغ نہیں ملا ہے کہ دستوئیفسکی نے صوفیاء کو پڑھا ہو۔ گو طالسطائی کی ''جنگ اور امن'' میں روسی فری میسنوں کا حوالہ ملتا ہے جن کا اہل تصوّف سے ایک مسخ سا رشتہ یقیناً تھا۔

اگر دستوئیفسکی مسلمان ہوتا؟ شاید اس کا پڑا ہو جاتا، نہیں نہیں بھئی، مسلمانوں میں بڑے حیرت انگیز شاندار کردار اُبھرے ہیں، ان سوالوں سے اُلجھنے والے، اور وہ بھی دستوئیفسکی سے صدیوں پہلے۔ اس ریگزار میں اس کے قدم اوّلیں نہ تھے۔ مسلمان ہوتا تو وہ رومی اور حلاج کے پائے کا صوفی ہوتا اور شاہ عنایت شہید کی طرح زمین کسانوں میں بانٹ کر غاصب فوجوں سے جہاد کرتا۔ روسیت سے (جو اس ناول میں بھی چھائی ہوئی ہے) تو خیر وہ فوراً نکل آتا۔ تب وہ شعوری طور پر بھی کائناتی انسان ہوتا۔

لیکن پھر...... دستوئیفسکی کہاں ہوتا؟ دُنیا کا اَدب اس کی عیسائی تصنیفات کے بغیر اسی قدر قلاش ہے جتنا کہ حلاج و رومی کی اسلامی شاعری کے بغیر۔

اور میں؟ آخر میں کیوں خواہی نخواہی دستوئیفسکی کی چیستان میں گھس پڑتی ہوں؟ آہ، لیکن حیران کن بات تو یہی ہے میرے عزیز قاری کہ میں تو نہ جانے کب سے ان ہی سوالوں سے جوجھتی رہی ہوں، تب سے جب میں ابھی ایک نوعمر لڑکی تھی...... جانے کیوں؟ بس شاید کچھ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔

اب نہ وہ زمانہ رہا اور نہ وہ جواں سال لڑکی، مگر نوعمری میں سچ اور جھوٹ اور نیکی اور بدی اور خدا و رُس انسان کے اس چکّر میں اپنے سر پٹخنے کی یادگار ایک نظم باقی ہے جو میں نے بائیس تیئس برس کی عمر میں لکھی تھی اور ''بدن دریدہ'' میں شامل ہے۔ اس کا عنوان ہے ''آڈن کے نام'' اور نظم کچھ یوں ہے۔

یہ سچ ہے مرے فلسفی، میرے شاعر
جو تم نے کہا ہے
وہ وقت آ گیا ہے

کہ دُنیا کے جھوٹے، فریبی معلم کا جبہ پکڑ کر
نئے لوگ کہہ دیں
کتابیں بدل دو
یہ جھوٹی کتابیں جو ہم کو پڑھاتے چلے آ رہے ہو
کتابیں جو کہتی ہیں دُنیا میں سچ جیتتا ہے
یہ سب کذب و بیہودہ گوئی مٹا دو
حقیقت جدا ہے
یہی ہے حقیقت
کہ دُنیا میں جھوٹ اور سچ کی ہمیشہ ہوئی جنگ
اور جھوٹ جیتا
کہ طاقت ہے برحق
کہ سچ ہارتا ہے
کہ شیطان نیکی کے احمق خدا سے بڑا ہے

......☆......

تب تک میں نے دستوئیفسکی وغیرہ خاک نہ سمجھا تھا۔ بس از خود دماغ میں ایسے ہی خیال گھومتے رہتے تھے۔ اس نظم کا دلچسپ قصہ یہ ہے کہ اصل نظم میں چند سطریں اور بھی تھیں۔ وہ مجھے اب یاد نہیں لیکن ان کا مطلب کچھ یہ نکلتا تھا کہ لیکن پھر بھی میں ان لوگوں کے لیے آنسو بہاتی رہوں گی جو سچ کی اور کمزوروں کی حمایت کریں گے۔

میں ان دنوں لندن میں رہتی تھی۔ یہ نظم میں نے ساقی فاروقی کو سنائی تو اس نے شدید اصرار کیا کہ نظم کو وہیں ختم کر دو جہاں شایع ہونے والی نظم ختم ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ اس طرح تاثر زوردار رہے گا اور تم ان جذباتی سطروں سے نظم کو کمزور بنا رہی ہو۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ اس کا کہا مان کر اور زوردار تاثر کے چکر میں آ کر میں نے اپنے اصلی خیالات کی نفی کی۔ وہ سطریں تو حذف ہو گئیں لیکن رہی تو میں اسی قبیل کی، جیسے کہ دستوئیفسکی کے چیلے چانٹے ہوتے ہیں۔ پس تو واہے گرو کا خالصہ اور واہے گرو کی فتح!

الطاف فاطمہ

کوئے ملامت

(۱)

دھماکہ، خودکش حملے، ہلاکتیں۔۔۔

یہ وہ الفاظ اور ان سے پیدا ہونے والی آوازیں وہ آوازیں ہیں جن کو سننے کے ہمارے کان عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو ہمارے بچے ان سے مانوس ہو چلے ہیں۔ وجہ یہ کہ اب نومولود کانوں کو بھی پہلی پہلی آواز اذان سے پہلے ہی دھماکوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اذیت وکرب میں ڈوبی آہوں اور کراہوں کی صدائیں پہنچ چکی ہوتی ہیں۔

سو مذکورہ بالا الفاظ ٹھوس حقیقت کا جامہ پہن کر ہماری روزمرہ زندگی کی معمولات میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور اب ہم پر ان آوازوں یا ان کی اطلاعات پر کوئی تعجب انگیز حیرت اور تاسف ہوتا ہے نہ ہمارے معمولات میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جب بحریہ ٹریننگ اسکول کے دھماکے نے میرے چھوٹے سے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں ہلا دیے اس وقت میں بڑے سکون سے اپنے معمول کے کاموں میں مصروف رہی۔ خبر کی تصدیق کے لیے ٹی وی کھول کر دیکھا تو وہی معمول کا دیکھا بھالا سماں وہی گرتی اور ڈھیتی ہوئی عمارت کا ملبہ، سریے، اینٹوں، پتھروں کے ڈھیر۔ خون آلود مردہ اور زندہ جسموں کے درمیان، میڈیائی نمائندوں کی لعنتوں پھٹکاروں، لعن طعن کے طوق اپنے گلوں میں ڈالے سیکیورٹی اور پولیس کے بوکھلائے ہوئے، ہر الزام اور پھٹکاروں کے مسلسل تیروں سے بے نیاز اہل کار۔ ادھر سے ادھر دوڑتے بھاگتے ہوئے اور پھر کسی نامعلوم گوشے سے آنے والی فائرنگ کی زد میں آ کر خود بھی مردہ اور مجروح جسموں کی صف میں شامل ہوئے۔ اکا دکا اہل کار۔۔ ابھی کچھ دیر بلکہ لمحوں سے قبل زندہ انسانوں کی شکل میں چلتے پھرتے انسان میتوں اور

زخمیوں میں تبدیل ہوکر گھسیٹ گھسیٹ کر اسٹریچروں پر ڈالے جا رہے ہیں۔ اہل کاروں کی نااہلی، غفلتوں اور ناقص کارکردگی پر لعنتوں اور پھٹکاروں کی مزید بوچھار نشریاتی چینلوں سے چارسو پھیل رہی ہے۔ اب اکادکا فوجی وردیاں بھی ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتی نظر آ رہی ہیں۔ لو مزید لعنتی اور ناکردہ کار منظر میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ بھی ہر قسم کی لعنتوں کی پروا کیے بغیر دوڑ بھاگ میں شامل ہو چکے ہیں۔ میں یہ سب کچھ چپ چاپ اپنی جگہ پر دیکھتی اپنی طرف سے کسی خیال یا تبصرے کا اضافہ کیے بغیر۔ اس خودکش حملے یا دھماکے کے بعد بھی جتنے حملے یا دھماکے ہوتے رہے ان کی رپورٹوں اور آنکھوں دیکھے حال کو اسی مخصوص بے حسی اور بے گانگی سے دیکھتی اور اپنے روزمرہ کے معمول و دستور میں مصروف رہتی۔ البتہ یہ خیال ضرور آتا کہ کیا یہ سچ ہے کہ وقت پڑے پر بیچارے اور درماندہ لوگوں کی دست گیری کے لیے ہاتھ بڑھانے والے ناکارہ بندے اور ان کے سارے ادارے یعنی انسٹی ٹیوشنز، ناکارہ بے سود اور بے جا ئیں اور ان کو ختم کر دینا ہی بہتر ہو۔ واضح رہے یہ فقرہ بھی بریکٹ میں سوچا ہے۔ بھئی اب کیا کیا جائے ہم لوگ ایسے ہی ہیں۔ یقین نہ آئے تو من موہن سنگھ صاحب سے پوچھ لیجیے کہ وہ گاہے گاہے ہمیں یاد دلاتے رہتے ہیں، تمہارے سارے انسٹی ٹیوشنز اور سب کے سب لوگ نکمے اور بے کار لوگ ہوئے بھلا ایک کام تو کر نہ سکے ممبئی (بھئی یہ بمبئی کو ممبئی نہ کہنے میں کیا حرج ہے) حملوں کے سلسلے میں اپنی کارکردگی پر اپنے گریبان میں جھانکو! کیا کیا اب تک اگر تم پر خودکش حملے ہو رہے ہیں تو ہوا کریں۔ ہمارا حکم تو بجا لانا ضرور تھا اور نہیں تو اب آگے تم جانو! کہ ہم کیا کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ یا پھر دور کیوں جائیے امریکا سے پوچھ لیں (ہاں پہلے تو ڈھکے چھپے لفظوں میں سُپر پاور ایک سُپر پاور کے نام سے اشارۃً بات ہوتی تھی پر اب تو جب وہ سُپر پاور ہماری رگ گلو سے بھی زیادہ نزدیک رہنے لگی ہے تو کھلم کھلا اسی طرح نام لیا جائے گا جیسے اللہ میاں کا نام ہر کردہ اور ناکردہ معاملے میں لیا جاتا ہے) ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ امریکا سے بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی بار ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اے ناقص لوگو! ٹھیک ہے ہم تمہاری منشا کے بغیر ڈرون حملے کر رہے ہیں اور کافی ہلاکتیں اور تباہی بھی ہو رہی ہے پر تم کیا کر رہے ہو۔ اسامہ کدھر ہے اور فلاں فلاں کدھر ہے، تم کو کچھ آتا ہو تو پتہ لگاؤ گے نا۔ اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال کر اس کے پھن سے پکڑ کر باہر نکال لاؤ۔۔۔ تو پھر ٹھیک ہے ہماری بھی حالت اسکول کے اس بچے کی سی ہو رہی ہے کہ جس کا ذہن اپنی کند ذہنی اور نالائقی کا سن سن کر اتنا منفی ہو جاتا ہے کہ سوال سو فی صد درست کر لینے کے بعد بھی وہ اپنی جگہ سے

اٹھ کر استاد کی ڈیسک تک نہیں جاتا۔ کیوں کہ وہ جان چکا ہے کہ وہ نکما اور نااہل ہے، کچھ بھی اچھا نہیں کر سکتا۔ سوال کیے جا رہے ہیں، درست جواب بھی آ رہے ہیں لیکن ہم خود اپنے گلوں میں ہمہ وقت لعنتوں کے طوق ڈالے ہوئے اپنے کام سے کام رکھنے کی اُن تھک کوششوں میں مصروف ہیں اور کچھ نہیں تو ایک صاحب ہفتے میں ایک دن ٹی وی پر بیٹھ کر پہلے دردمند لہجہ میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے آئے دن یاد دلاتے ہیں کہ ایک نہایت روادار اور کھلے ذہن والے ملک اور قوم کا بے تعصب اور جینیس کارٹونسٹ، اس کے بنائے کارٹون اس کی اپنی خباثت اور تعصب کا نتیجہ نہیں بلکہ ہماری کوتاہیوں اور بداعمالیوں کی سزا ہے اور اس قبیح فصل کے خلاف جہاد کی ذمہ داری ہم پر اور صرف ہم پر عائد ہوتی ہے۔ کوئی اور ہوا ہو یا نہ پر میں حیران اور کنفیوز ہوتی ہوں کہ اللہ نے تو اپنے پاک کلام میں ہمارے پیغمبر کو بار بار تسلی دی اور شانت رہنے کا حکم دیا ہے کہ پریشان نہ ہو۔ یہ تو پیغمبروں کی نشانی رہی ہے کہ تم سے پہلے کے تمام پیغمبروں کو ظلم وستم توہین اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اور انہوں نے صبر کیا کہ اللہ بہتر انتقام لینے والا ہے۔ سو اب کیا ہم پر لازم نہیں کہ صبر وتحمل سے کام لیں۔ اور یہ بھی طے ہے کہ ہم تو کوئے ملامت کے باسی ہیں۔ ہمارے سب ادارے اسٹیبلشمنٹ فوج، پولیس، ایجنسیاں اور ساری پبلک انتہائی ناقص بلکہ بدترین ایسا لگتا ہے ہم سب کے سب کا فرقۂ ملامتیہ سے تعلق ہے۔ جب ہی تو چپ چاپ سب کی سنتے اور اپنے کام سے لگے رہتے ہیں۔ خیر اب اتنا سوچنا بھی کوئی مناسب بات نہیں۔ سو میں تمام واقعات اور واردات کو لاتعلقی اور بیگانگی سے دیکھتے ہوئے اپنے کام سے کام رکھتی تھی پر اب جب کوئی خودکش دھماکہ ہوتا ہے اور جب امدادی ٹیموں کی طرف سے اعلان ہوتا کہ اس کی ٹانگ مل گئی ہے، دھڑ مل گیا ہے۔ جب بھی سننے کی حد تک رونگٹے کھڑے ہو کر واپس اپنی جگہ پر برقرار ہو جاتے۔ مگر اب کچھ عرصے سے یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی اعلان ہوتا ہے کہ سر مل گیا ہے ہاں ہاں بالکل سر ہی تو ہے۔۔۔ تو مجھے عجیب سی فکر سی لاحق ہو جاتی ہے۔ ایک نوخیز اور بے خطا سی معصوم صورت والا سر، بجل اور خوبصورت نین نقش سے سجا ہوا خاک وخون میں لتھڑا ہوا جائے واردات کے ہولناک ماحول اور ملبے کے دوران ادھر سے ادھر لڑھکتا ہوا۔ کہیں یہ وہی تو نہیں اللہ کرے یہ اس کا سر نہ ہو۔ بلا ارادہ ہی اندر سے دعا ابھرنے لگتی ہے۔ رات کو سونے لیٹو تو بھی وہ سر بار بار آنکھوں میں گھومتا ہے۔ میرے اندر یہ تبدیلی اس کے جانے کے بعد سے آئی ہے۔ اس سے پہلے ایسا کچھ نہ ہوتا تھا۔

(۲)

مینا باز میرے پاس اس وقت آیا جبؔ میری بینائی بڑی تیزی سے زائل ہو رہی تھی، بلکہ ایک طرح سے زائل ہو چکی تھی۔ بس ایک رمق پر ہی گزارا ہو رہا تھا۔ میرا پرانا ملازم وفات پا چکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد جن نئے ملازموں سے واسطہ پڑا تو اس کے بعد میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہزار دقّت اور مجبوری کے باوجود کوئی نیا وینچر نہیں کرنا۔ معاف کیجیے اس قسم کی تجرباتی حرکت یا عمل کے لیے venture سے زیادہ مناسب اور موزوں لفظ میرے ذہن میں موجود نہیں۔ اچھا اپنے طور پر تو میں نے طے کر لیا تھا کہ اب اپنی مدد آپ کے سہارے کام چلانا ہے اور کام اچھا خاصا چل پڑا تھا۔ مگر انسان اپنے چاہنے والوں کا کیا کرے کہ چین سے بیٹھتے ہیں نہ چین لیتے ہیں۔ سمجھا سمجھا کر تھک جاؤ کہ بھئی کوئی مشکل نہیں، اچھا خاصا کام چل رہا ہے۔ وقت گزر ہی رہا ہے مگر سنتا کون ہے۔ خود آ آ کر مدد کر رہے ہیں، کہیں کھانے پکا پکا کر فریج میں ڈھیر کر رہے ہیں۔ ہم منع کر رہے ہیں۔ ڈانٹ رہے ہیں کہ بھئی اطمینان رکھو۔ ہم آسانی سے جل کر مرنے والے نہیں ہیں۔ ایک صاحب کا کہنا تھا کہ دن میں رات میں جب بھی خیال آتا ہے کہ پھپّو اپنا ناشتہ یا کھانا چولہے کے پاس کھڑی بنا رہی ہیں، میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ دن کو خیال آئے تو دھیان بھٹکتا ہے۔ اپنا کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی پریشانی سے نجات پانے کا حل انہوں نے مینا باز کی شکل میں تلاش کر لیا۔ اب ایک لمبا چوڑا فون آ جاتا ہے اور لڑکا میرے کان کھانے لگتا ہے۔ 'مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی جب یہ خیال آتا ہے آپ چولہے کے پاس کھڑی ہیں۔ ابلتا ہوا پانی چائے دانی میں ڈال رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو خدانخواستہ۔۔۔ مارے وہم کے اس مُنھ سے جل جانے کا لفظ نہیں نکل رہا ہے۔ بس آپ میری بات سن لیں۔ میں آپ کے پاس ایک لڑکا بھیج رہا ہوں۔ ''لڑکا وہ کھانا بنانا جانتا ہے۔ کتنا بڑا ہے؟'' ''کوئی پندرہ سولہ سال کا ہے کم از کم وہ آپ کے ساتھ تو کھڑا ہو کر مدد کر دے گا۔'' ''اچھا! پھر ہے کہاں کا رہنے والا؟'' ''خیبر ایجنسی کا۔'' ''ارے بھئی وہ تو خطرناک علاقہ ہے رہنے دو۔'' ''میری بات سنیں وہ خطرناک علاقہ نہیں وہاں تو بڑے نیک اور باوفا لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا ایک کیریکٹر ہوتا ہے۔'' ''وہ تو ٹھیک ہے مجھے پتہ ہے وہاں کے لوگوں کو تو لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چوکیداری کے لیے رکھا کرتے تھے۔ پر اب ان سے ڈر لگتا ہے۔'' ''آپ اس سے نہ ڈریں۔ یتیم بچہ ہے ہماری یونٹ کے آدمی کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ اتنا شریف اور نیک بخت جوان ہے۔ بھائی کی طرف سے پریشان ہے۔ اسکول سے بھاگ نکلا ہے۔

دوستوں کے بہکائے میں آ کر ایسا نہ وہ کہ غلط ہاتھوں میں پڑ جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس علاقے ہی سے دور چلا جائے۔۔۔ اچھا بس میں اس کو بھجوا رہا ہوں آپ اس کو رکھ لیں۔ میرے Peace of mind کے لیے۔ میں آپ کے لیے بہت ڈسٹرب رہتا ہوں۔۔۔'' اچھا بھئی تمہارے Peace of mind کے لیے اپنی توبہ اور پکا ارادہ توڑنا پڑے گا۔ بھئی یہ سب لڑکے ہر وقت نرغے میں رکھتے ہیں۔ ان کی محبت اپنے ارادے ہر پر force ہو رہے ہیں۔ چلو یہ بھی سہی! تمہاری خوشی اور سکونِ دل کی خاطر! میں نے ہتھیار ڈال دیے! پھر ایک فون آتا ہے۔

''لڑکا روانہ ہوگیا ہے کل شام سات بجے اسٹیشن پر کسی کو بھیج دیں آزادی چوک پر یہاں سے ہم دونوں کو موبائل پر ہدایتیں دیتے رہیں گے۔''

اب میں حیران پریشان نومبر کی اس سرد شام کو سات بجے کون جائے گا اس مہمانِ خصوصی کو لینے۔ میں پھر بڑبڑا رہی ہوں اس دن اتفاق سے مراد کا ڈے آف تھا۔ اس کے کان میں بڑبڑاہٹ پڑی ہے تو اس نے فوراً اپنی خدمات پیش کردی ہیں۔ ''نانو میں چلا جاتا ہوں۔'' ''اچھا بیٹا جاؤ۔ اللہ کی حفاظت میں دیا۔'' ہم کتنے بزدل ہوتے جا رہے ہیں؟ میں سوچتی ہوں۔۔۔ وہ خوش ہے رات کو گیارہ بجے جب میں آفس سے آ کر گھنٹی بجاؤں گا تو ان کو ٹٹول ٹٹول کر آ کر دروازہ کھولنا نہیں پڑے گا۔ وہ صاحب جو آ رہے ہیں کھول دیا کریں گے۔ تو اور کیا، دو سے کوئی تیسرا تو ہوگا۔

(۳)

تو وہ لڑکا یعنی مینا باز۔ خیبر ایجنسی کے مہمند قبیلے کا کم سن لڑکا۔ واقعی بچہ ہی تو ہے۔ مگر ہمارے اِس طرف کے پندرہ سولہ سال کے لڑکوں سے کہیں زیادہ صحت مند ہاتھ پیر، سرخ و سفید رنگ۔ تیکھے اور شستہ خدوخال۔ صاف ستھرا۔ کندھے پر صرف ایک چادر پڑی ہوئی۔ آتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ صاف ستھرا ہاتھ۔ کٹے ہوئے ناخون۔ میں نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بیٹا تمہارا نام کیا ہے۔ مینا باز! ڈٹی ہوئی خود اعتمادی سے بھرپور آواز۔ تم کھانا کھاؤ۔ ہم نے کھانا کھا لیا ہے سر! اچھا تو چائے پی لو۔ چائے بھی پی لی ہے سر! ہم کو جانماز ملے گا؟ ہاں کیوں نہیں۔ ''مراد بیٹا مینا باز کو اوپر کمرہ اور غسل خانہ دکھا دو۔ وہاں جانماز بھی ہے۔'' نماز پڑھ کر وہ پھر آ گیا ہے۔ ''اچھا پھر ہم کو کام بتاؤ۔'' ''اب تم اوپر جا کر آرام کرو۔ صبح اٹھ کر کام بتائیں گے۔'' وہ اوپر چڑھ گیا۔ صبح اٹھ کر آیا تو اس سے پوچھا کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

''نہیں سر ٹھیک جگہ ہے۔'' اس طرح سے مینا باز نے اپنی پہلے دن کی ملازمت کا آغاز کیا۔

''اب ہم کو بولے گا سر کہ کیا کام کرنا ہے اس ٹائم؟'' ''ناشتہ بنے گا ہمارے لیے تم ہمارے ساتھ کچن میں چلو۔'' (اب ہم باورچی خانہ کہیں تو کوئی سمجھتا نہیں)۔

''مراد صاحب ناشتہ نہیں کرے گا؟'' ''وہ کرے گا پر وہ گیارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کر کے آفس جائے گا۔'' ''تو کیا میں دوبار ناشتہ بناؤں گا؟''

آواز پر وحشت تھی۔ ''نہیں بھئی ناشتہ میں بناؤں گی۔ تم میری مدد کرنا۔''

''تو مراد صاحب نماز نہیں پڑھتا؟'' ''پڑھتا ہے۔ اٹھ کر نہا کر قضا پڑھ لیتا ہے۔''

دو دن بعد اس کے بھائی کا فون آیا۔

''سر لڑکا پہنچ گیا؟''

''ہاں بھئی پہنچ گیا۔''

''سر ٹھیک ٹھاک لگا۔ ابھی کام سیکھ جائے گا۔ سر اس کا خیال رکھنا۔ ابھی ناسمجھ ہے۔'' وہ اس کے بارے میں بے تاب اور پریشان سا تھا۔

''فکر نہ کرو۔ ٹھہرو میں تم سے اس کی بات کروا دیتی ہوں۔''

''پہلے آپ میری بات سن لو۔ پھر بات کرواؤ۔''

''ہاں بولو!'' میں مختصر بات کرنا چاہ رہی تھی۔

''سر اس کو بازار بہت زیادہ دور نہ بھیجنا۔ نیا شہر ہے۔ ابھی اس کو کوئی راستہ ماستہ نہیں پتہ۔ کہیں گم نہ ہو جائے۔ سر ہمارا یتیم بھائی ہے۔ آپ اُس کا خیال رکھنا۔ آپ اُس کو پڑھا دیا کرو تو بڑی مہربانی ہوگی یہ سات جماعت میں چڑھا تھا۔ پھر دوستوں کے ساتھ اسکول سے بھاگ گیا۔ سر! ابھی اس نے پورا قرآن بھی نہیں ختم کیا۔ آپ پڑھا دو گے۔''

''ہاں ہاں تم فکر نہ کرو۔ بازار بہت قریب ہے۔ مسجد بھی ساتھ ہے۔''

''آپ کا مہربانی ہوگی۔ اس کو گھر پر ہی نماز پڑھنے کا بولو۔ سائیکل بالکل نہ دینا۔''

''تم اطمینان رکھو میرے گھر میں سائیکل نہیں ہے۔ لو یہ بینا باز سے بات کرو۔''

دونوں طرف سے غل غل۔ خوچہ جیسی آوازوں میں بات ہوگئی۔ جلد ہی اس نے فون رکھ دیا۔

ایک بات میں نے محسوس کی کہ اس کی پرورش ایک ضابطے کے تحت ہوئی ہے۔ صبح اٹھ کر نہانا، نماز پڑھ کر نیچے آنا، ناشتہ بنانے میں میری مدد کرنا، صبح آ کر سلام علیکم کرنا نہ بھولنا۔ اگر اذان کی آواز نہ سنوں تو مجھے بتانا۔ آپ نماز پڑھو، اذان ہوگیا۔ ابھی ہم بھی پڑھے گا۔ دو دن بعد اس نے

کہا۔ ’’سر ابھی ہم خود تمہارا ناشتہ بنائے گا ہم کو سمجھ آ گیا۔ مراد صاحب کا ناشتہ بھی ہم تیار کرے گا۔‘‘

بڑا سکون سا ہو گیا تھا اس کے آنے سے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا تم مجھ کو اخبار پڑھ کر سناؤ۔ تم نے اسکول میں پڑھا تو ہے۔

ہاں۔ لاؤ۔ بڑی خوشی سے اس نے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اٹک اٹک کر بمشکل۔ تو میں نے کہا مینا باز تم ٹھیک نہیں پڑھتے۔۔۔ بہت کمزور ہے تمہاری اردو بھی۔

’’ہاں تو تم ٹھیک کرواؤ۔‘‘ جیسے حکم دے رہا ہو۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ہاں ٹھیک ہے پھر تم دس بجے تک فارغ ہو جاتے ہو۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ پڑھائی کر لیا کرو۔

’’مگر سر! تمہارا تو نظر نہیں۔ تم ہم کو کیسے پڑھائے گا۔‘‘

’’تم دیکھنا کیسے پڑھائے گا۔‘‘ پڑھائی شروع ہو گئی تو وہ بڑی باقاعدگی سے کتابیں لے کر بیٹھتا۔ جس دن میں نے اس کو خوش خطی کے لیے الفاظ لکھ کر دیے تو وہ ایک دم بولا۔ ’’تم بولتا تھا ہم کو نظر نہیں آتا مگر تم کو نظر آتا ہے۔‘‘ ’’نہیں مینا باز مجھے نظر نہیں آتا اگر آتا۔ پر لکھ سکتی ہوں اگر کوئی دیکھ کر بتاتا رہے کہ سیدھی لائن پر لکھا ہے۔‘‘

اب اس نے اپنے پورے دن کے کاموں کا ایک ٹائم ٹیبل بنا لیا تھا۔ صبح اٹھنا، غسل کر کے نماز پڑھنا، اس کے بعد ناشتہ بنانا، بازار سے سبزی وغیرہ لانا اور دس بجے فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ بڑا اچھا مگر مغرور ذہن تھا۔ ایک روز میں نے کہا ’’مینا باز تم صبح اٹھتے ہو، نماز کے بعد قرآن بھی پڑھ لیا کرو۔‘‘

بڑی ندامت سے بولا، ’’قرآن تو ہم نے پڑھا نہیں۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’بس یار دوست بولتا تھا کیا کرنا جب بڑے ہو جائیں گے تو ہم کو خود ہی پڑھنا آ جائے گا۔ نہ خود پڑھا نہ ہم کو پڑھنے دیا۔‘‘

’’غلط بولتا تھا۔‘‘

’’ہاں ہم کو بھی لگتا ہے کہ غلط بولتا تھا۔‘‘ مغرور ہونے کے باوجود اس میں معصومیت تھی۔

’’اچھا اب تم ہم کو پڑھاؤ۔‘‘

’’نہیں میں کہاں پڑھاؤں گی بغیر دیکھے۔ ایسا کرتے ہیں کہ ایک دو مہینے بعد جب تم اردو صاف پڑھنے لگو گے تو میں تم کو قاری صاحب کے پاس لے جاؤں گی۔ ان سے پڑھ لینا۔‘‘

"اچھا ٹھیک ہے۔"

اس کا بھائی چار پانچ دن بعد اس کو فون کرتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا ہمارا بھائی تم کو بات کرے گا۔

اس کے بھائی نے بہت ہی شکر گزاری کا اظہار کیا۔ کہنے لگا، "سر آپ کی مہربانی آپ اس کو پڑھاتے ہو۔ اس کو انگریزی بھی پڑھا دیں تو اچھا ہو اگر اس کی انگریزی ٹھیک ہو جائے تو میں اس کو میٹرک کا امتحان دلواؤں گا۔"

"دیکھو بھئی میں کوشش کروں گی۔ انگریزی تو اس کو بالکل ہی نہیں آتی۔"

"سر آپ کی مہربانی ہوگی۔ یہ دس پاس کرلے تو میں اس کو آرمی میں کروانا چاہتا ہوں۔۔ بس اس کو باہر گھومنے نہ دیں۔ زمانہ خراب ہے۔"

اگلے دن اس نے اسی حاکمانہ انداز میں مجھ کو حکم دیا۔ "اب تم ہم کو انگریزی پڑھاؤ۔" سو ان کی انگلش کی تعلیم کا آغاز بھی ہوگیا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے سارے کام انجام دیتا اور اپنے بھائی کی ہدایت کے مطابق بازار سے بھی فوراً واپس آجاتا۔ گھڑی دیکھ پڑھنے بیٹھتا تھا۔ انگریزی میں چل پڑا تھا۔ بڑا سکون آگیا تھا۔ خصوصاً یوں کہ رات کو گیارہ بجے مراد کی گاڑی آتی۔ دروازہ کھولتا اور اس کو کھانا گرم کر کے کھلاتا۔ تھوڑا بہت پڑھ جانے کی وجہ سے اب بل آتا تو وہ پہلے بل پڑھتا اور پھر مجھے دیتا۔ ایک دن بڑے تاسف اور ہمدردی سے بولا، "یہ تم کو اتنا زیادہ بل بھیجتا ہے بجلی پانی کا۔ آپ دے دیتے ہو۔" "بالکل دینا تو پڑتا ہے۔" "مت دو۔" اس نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں کہا۔ "کیسے نہ دیں۔ اگر دیں گے نہیں تو بجلی کاٹ دیں گے ہماری۔" "کیسے کاٹ دے گا۔ ہم تو نہیں دیتے۔ بجلی گیس کا بل۔" "پھر تمہاری بجلی گیس کٹ جائے۔" "کاٹ نہیں سکتا بجلی ہمارے مالاکنڈ کا ہے۔ بجلی کاٹے گا تو ہم سارا بجلی کا کھمبا اکھاڑ دے گا۔" میں نے ایک گھنٹہ اس کو گیس، بجلی اور پانی کے بلوں کی ادائیگی کی ضرورت اور افادیت پر لیکچر دے کر اس کے دماغ میں گھسانے کی کوشش کی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہی کہے گیا، لوٹتا ہے پبلک کو اور کراچی کو ہمارا بجلی دیتا ہے اور ہم دینے نہیں دے گا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ "ہم سمجھتا تھا شہر کا لوگ امیر ہوتا ہے۔ پر تم لوگ تو ہم سے زیادہ غریب ہے۔ بجلی، گیس، پانی کا بل بھرے ہو، سبزی مہنگی، مہنگا گوشت، انڈہ سب کچھ خریدتے ہو۔" "تو کیا تم مفت لاتے ہو سبزی گوشت؟"

"ہمارے گھر کے ساتھ زمین ہوتا ہے تھوڑا ہم اس میں سبزی لگاتا۔ گائے، بکری، مرغی

پالتا۔ اندہ لیتا۔'' سن کر بڑا رشک آیا کیا سکون کی زندگی ہے۔ اور ایک ہم لوگ ہیں کہ ہمارے نخرے ہی کم نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے وہ بھی ضروری ہے۔ بس نہیں چلتا ہے دنیا بھر کی آسائشیں اپنے گھر میں بھر لیں پھر بھی چین نہیں پڑتا۔ شہر میں تو جھگیوں کے مکینوں کا بھی وی سی آر، ویڈیو، واشنگ مشینوں اور ایئر کنڈیشنوں، گیس ہیٹروں کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ بس چھوٹی چادر ہے اور پیر ہیں کہ لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی زبان سے اللہ کا شکر تو نکلتا نہیں۔ گلے شکوے اور دہائیاں ہی دہائیاں اس موضوع پر بات کرنا بے سود تھا۔ یہ بہت راسخ خیالات اور متصب طبیعت کے لوگ ہیں۔ خاموشی سے اس کو پڑھانے لگی۔ اس کی پروگریس تسلی بخش تھی اور رویہ بھی اس لیے کہ اس کا بھائی ہفتہ دس دن بعد اس کو فون کرتا۔ ہر بار پوچھتا تم خوش ہو۔ کوئی تکلیف تو نہیں۔ پھر وہ اس کو دل لگا کر کام سیکھنے اور پڑھائی کرنے کی ہدایت دیتا۔ مجھ سے بھی بات کرتا۔ بس آپ اس کا خیال رکھیں ہر کسی سے ملنے نہ دینا۔ اس کو پڑھا دیا کریں۔

(۴)

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اٹھائی۔ ایک اجنبی سی آواز تھی۔ ''مینا باز سے بات کراؤ۔''

''تم کون ہو؟''

''اس کو بولو جمرود سے اس کا فون ہے۔''

''مینا باز تمہارا فون ہے۔'' وہ باورچی خانے میں کام کر رہا تھا۔

فوراً آیا فون اٹھایا اور ایک دم دغا دغا۔ خا خا شروع ہوگئی۔ خوب ہنس ہنس کر بات کی۔ اتنا تو میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ اپنے مخاطب کو اپنی پڑھائی اور ملازمت کے علاوہ یہ خوش خبری بھی سنا رہا تھا کہ دس پاس کر لوں گا تو بھائی مجھے آرمی میں کروا دے گا۔ اس نے فون بند کیا تو میں نے سوال کیا، جمرود سے کس کا فون آیا ہے۔ وہ کہنے لگا ''بھائی ہے ہمارا۔''

''مگر وہ بھائی تو تمہارا تربت سے فون کرتا ہے۔''

''دوست بھی تو بھائی ہوتا ہے۔''

''اس کو تمہارا فون نمبر کیسے ملا؟''

''ہاں ہم نے اس کو پوچھا تھا بولا وہ ہماری ماں کے پاس گیا تھا۔ ماں سے معلوم کیا۔''

''تمہاری ماں کو میرا فون نمبر کس نے دیا؟''

''جب میں آرہا تھا تو میں اس کو آپ کا نمبر دے کر آیا۔''

(۵)

اس فون کے چند روز بعد اس کے بھائی نے فون کیا تو میں نے اس کو بتایا کہ جمرود سے کسی نے اس کو فون کیا تھا۔ کہہ رہا ہے کہ میرا دوست ہے۔ وہ پریشان سا ہو کر بولا۔

''کوئی دوست موست نہیں۔ اب اس کا فون آئے تو اس کو مت دینا۔ اچھا آپ اس کو بلا کر بات کرواؤ۔''

''اُن کی بات تو میری سمجھ میں کیا آتی مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے باز پرس کر رہا ہے اور یہ نادم سا ہو کر جواب دے رہا ہے۔ بات ختم کر کے اس نے ایک بار پھر مجھ سے بات کی۔

''سر! میڈم یہ مینا باز پڑھائی کرتا ہے۔ آپ کو پریشان تو نہیں کرتا۔''

''ہاں بس ٹھیک ہی ہے۔ پڑھائی کر رہا ہے اب تو انگلش میں بھی چل پڑا ہے۔''

''مہربانی میڈم سر! اس کو صرف میرا فون دیا کریں۔ باقی کسی اور کا فون ہرگز نہ دیں۔''

اس دن مجھے خیال آیا یہ کیا سر! سر! کہا کرتا ہے۔ کیوں نہ مجھے میڈم کہا کرے سو میں نے اس سے کہا'' مینا باز سر تو مرد افسروں کو کہا جاتا ہے تم مجھے سر نہ کہا کرو۔''

''پڑھانے والوں کو ہم اسکول میں سر بولتے تھے۔''

''وہ مرد پڑھانے والے کو بولتے ہیں۔ پڑھانے والیوں کو مس یا میڈم بولتے ہیں۔''

''میں آپ کو میڈم بولوں؟'' ایسا لگا جیسے اُسے میڈم کہنے پر اعتراض ہو پھر بولا'' اگر میں آپ کو باجی بولوں گا تو برا تو نہیں مانو گی۔''

''ہاں بالکل باجی کہا کرو۔'' اب وہ مجھے باقاعدہ باجی کہنے لگا۔ اردو تو اس کی پہلے ہی خاصی تھی۔ اب وہ انگریزی بھی خاصے شوق اور توجہ سے سیکھ رہا تھا۔ اس کے آنے سے خاصہ سکون ہو گیا تھا۔ ایک یہ سچ بولتا تھا۔ بازار سے بہت جلد لوٹ آتا تھا۔ سبزی، گوشت یا پھل جو بھی لاتا اچھا اور صحیح نرخ پر لاتا۔ سب سے بڑھ کر حساب لکھ کر دینے لگا۔ میں ایک بات بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ اس عادات اور طور طریق میں بڑی شستگی اور وہ شائستگی تھی جو عام طور پر یہاں ملازمت کے لیے آنے والے نوعمر لڑکوں میں نہیں پائی جاتی۔ دراصل اس کی نشست و برخواست اور عادات و اطوار پر قدیم مسلم ایشیائی تہذیبی طرز عمل اور ورثے کی گہری چھاپ تھی۔ مثلاً اس نے آتے ہی

طہارت کے لیے لوٹے اور جانماز کا سوال کیا۔ صبح خیزی۔ نماز کی پابندی کے علاوہ جمعہ کے دن کا خاص اہتمام جمعہ کی نماز کے علاوہ ہر نماز کے بعد سلام کرنا۔ کھانا کھاتے وقت بھی وہ مخصوص مسلم تہذیب وتمدن کا نمائندہ ہی نظر آتا۔ مختصر یہ کہ اس کے طور وطریق میں کوئی اصلاح طلب بات موجود نہ تھی۔ بجز لب و لہجے میں نرمی کے باوجود احساس برتری اور پندار کے جو اس کے نسلی اور علاقائی امتیاز کی مجبوری ہی کہی جاسکتی ہے۔

شاگرد کی حیثیت سے مجھے اس کی ایک بات بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ ہر بات کو سر جھکا کر قبول کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا بہت چون و چرا کے بعد ہی کسی کلیے کو قبول کرتا۔ جب مجھے اخبار پڑھ کر سناتا تو محض عبارت پڑھ کر ہی سنانے پر اکتفا نہ کرتا بلکہ متن کے بارے میں کئی سوال کرتا، جو مجھے بہت اچھا لگتا۔ بیدار مغز شاگرد بھی استاد کے لیے ایک نعمت ہی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنے اندر بھری ہوئی علم و دانش کے ملغوبے کو اس کے اندر انڈیل کر خیالات کے نرغے سے نجات تو حاصل کرلیتا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً اس کے سوالوں کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کرتی۔ جس دن اس نے سری لنکا میں ایک تامل خود کش حملہ آور لڑکی کی گرفتاری اور اس کے انکشافات پر طویل مضمون پڑھ کر سنایا تو اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کردی۔ دماغ چاٹ گیا۔ اپنی استطاعت اور معلومات کے مطابق اپنی حد بھر میں اس کے سوالات کے جواب دیتی رہی۔ آخر میں وہ اس بات سے بہت فکر مند ہوا کہ کچھ ملک اپنے دشمن یا ناپسندیدہ ملکوں میں ایسے خریدے ہوئے کرائے کے قاتل داخل کردیتا ہے جو بے خبری میں آکر ایک خود کش حملے سے ہزاروں جانوں کو خاک وخون میں ملا کر خود اپنی جان سے جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں اس نے کہا یہ ہمارے ملک میں جو حملے ہوتے ہیں۔ اس کا سادہ اور معصوم ذہن بہت آزردہ اور الجھا سا تھا۔ میں نے اپنی حد تک اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

(۶)

پھر اس جمرود والے فون کے بعد آنے والے جمعہ کو ایسا ہوا کہ حسب معمول نماز کے فوراً بعد آنے کے بجائے دیر تک واپس نہ آیا۔ چونکہ وہ کھانا ہمارے ہی ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا تو کچھ دیر انتظار کے بعد مراد نے بتایا اس کو مسجد میں کوئی آدمی ملا تھا وہ اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ہم کھانا کھا بھی چکے پھر بھی وہ نہ آیا۔ کوئی تین بجے کے بعد وہ آیا۔ ’’ارے بھئی آج تم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ہم تو سمجھے تم بھاگ گئے۔‘‘

"باجی ہم کو اپنا پڑوس مل گیا تھا۔ اُس سے بات کر رہا تھا۔"

"پڑوس! پڑوس کیا ہوتا ہے؟" میرا خیال تھا یہ اس کی زبان کا کوئی لفظ ہے۔

"پڑوس! آپ پڑوس نہیں جانتا۔ وہ کون ہوتا ہے جو اپنے گھر کے نزدیک رہتا ہے۔"

"اچھا۔ اچھا! پڑوسی۔" مگر وہ اس کا پڑوسی ہرگز نہ تھا۔

یہ اس کا پہلا جھوٹ تھا جو اس نے یہاں آنے کے بعد بولا تھا۔ شام کی چائے دے کر وہ پھر بغیر بتائے ہوئے غائب ہوگیا اور دو ڈھائی گھنٹے گزرنے کے بعد آیا۔ یہ اس کی پہلی خلاف ورزی تھی۔ میں نے اس سے بڑی سنجیدگی سے بات کی اور اس سے کہا کہ "تم بغیر بتائے اس طرح کیوں گئے۔ غلط بات ہے۔"

شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا، "غلطی تو ہوگئی مگر وہ آدمی مجھ کو اپنی جگہ دکھانے لے گیا تھا۔"

"کیوں؟ اس کی جگہ کہاں ہے؟"

"وہ جو ڈاکٹر لوگ کا اسپتال ہے یہاں آپ کے گھر کے پیچھے تو ہے۔"

"اچھا وہ کلینک میں کام کرتا ہے۔ کیا کام کرتا ہے؟"

"کلینک کے ساتھ والا گھر ہے۔ اپنا کام کرتا ہے۔"

"کلینک کے ساتھ والا گھر؟ مگر وہ تو ایک ویران کھنڈر کوٹھی ہے کیا وہ اس میں چوکیدار لگ گیا ہے؟"

"ہم کو نہیں معلوم۔ بولتا ہے میرا اپنا کام ہے۔"

مجھے حیرت تھی یہ تو بڑی پراسراری جگہ ہے۔ ہمیشہ سے چند سال پہلے سننے میں آیا تھا اس میں چڑیلیں آگئی ہیں۔ رات بھر چھما چھم رقص کی آوازیں، گھونگھروؤں کی باج سنائی دیتی تھی۔ پھر وہ پکڑی گئی تھیں، تب سے چوکیدار رہ رہا تھا۔ اس نے اس کے احاطے میں سبزیوں اور پھولوں کی کاشت کی ہوئی تھی۔ پھر ایک دن سننے میں آیا کہ اس کی جوان اور خوبصورت لڑکی اپنی شادی سے دو دن پہلے غسل خانے میں مری ہوئی پائی گئی۔ سارا جسم چوٹوں کے نشانوں سے نیلا ہوا پڑا تھا۔ آس پاس کے کوارٹروں میں رہنے والوں نے یک زبان ہو کر کہہ دیا یہاں جنات کا اثر ہے۔ سو کسی نے اچانک موت کی تفتیش کے بارے بھی نہیں سوچا۔ اور اب یہ کون یہاں آبسا ہے۔ "ارے اس کے بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔" میں نے پوچھا۔ کہنے لگا، "کوئی ساتھ نہیں اکیلا ہی ہے۔"

اس بات کے تین دن بعد وہ ایک صبح بازار سے آیا تو اس نے سبزی میز پر ڈالی اور کہنے لگا

کہ آج کا دن جو کام لینا ہے آپ لے لو۔ رات کو ہمارا حساب کر دینا۔ دو ہفتہ کا پیسے دے کر۔ ہم کل اپنے گھر جائے گا۔"

"کیوں بھئی، یہ بیٹھے بٹھائے ایک دن میں کیا ہو گیا جو تم چلے جاؤ گے۔"

"کچھ نہیں باجی۔ یہاں ہمارا دل نہیں لگتا۔ اب دیکھو مراد صاحب بھی کراچی جا رہا ہے۔"

"اس کی تو پوسٹنگ ہوگئی ہے وہاں۔"

اتفاقاً اسی وقت اس کے بھائی کا فون آ گیا۔ میں نے اٹھایا اور اس سے کہا مینا باز یہ کہہ رہا ہے۔ "ہائیں کیوں؟" "ابھی بازار سے آ کر اس نے مجھ سے یہ بات کی ہے۔"

"آپ اس کو فون دیں میں پوچھتا ہوں۔"

اس کے بھائی نے اس کو خوب ڈانٹا۔ وہ سر جھکائے کھڑا بولتا رہا۔

اس کے بھائی نے مجھ سے بات کی۔ "سر آپ اس کا کوئی حساب مت کرو۔ میں نے اس کو بولا ہے کہ جب مجھے چھٹی ملے گی اور جب گھر جاؤں گا تو اس کو بلاؤں گا۔ ابھی آپ اس کو پڑھائیں اور کام لیں۔ گھر جا کر کیا کرے گا آوارہ ہی تو پھرے گا۔"

منہ پھلائے ہوئے گیا، کتابیں لے کر میز پر پہنچیں۔ اچھا تو پھر پڑھاؤ۔ کچھ دن اور گزر گئے۔ وہ آدمی آتا بیل بجاتا اور اس کو ساتھ لے جاتا۔ اتنا غنیمت تھا کہ بتا کر جاتا۔ کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ ایک دن اس نے انگریزی کی کتاب سامنے سے ہٹائی اور کہنے لگا۔ پڑھائی سے کیا مل جاتا ہے۔ اپنا دماغ خراب ہوتا ہے۔

میں اس کی بات سن کر حیران نہیں ہوئی۔ مجھے کئی دن سے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آدمی جو اس کو مسجد میں ملا ہے ٹھیک آدمی نہیں ہے اور ضرور اس کا تعلق جمرود والے ٹیلیفون سے ہے اور یہ اس کو یہاں سے اکھاڑنا چاہتا ہے۔ اب اس سے بحث کرنا فضول ہے۔ اس روز وہ آدمی اس کو بلانے نہ آیا۔ دوسرے روز وہ ہر روز کے مطابق کام سے فارغ ہو کر کتاب کھول کر میرے سامنے بیٹھا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"مینا باز تم کہتے ہو پڑھائی سے دماغ خراب ہوتا ہے تو کاہے کو پڑھنے بیٹھ گئے آج۔"

"وہ جو ہمارا بائی ہے، اس کا حکم ہے پڑھو۔ پڑھو۔ دماغ خراب کرو۔"

"بات سنو وہ تمہاری بھلائی چاہتا ہے۔ تم پڑھ لکھ جاؤ گے تو عزت کی ملازمت ملے گی۔ گھروں میں ملازمت سے تو اچھی ہوگی۔ وہ تمہاری زندگی بنانا چاہتا ہے۔"

" کیا اچھی ہوگی! وہ پہلے اپنی زندگی تو بنا لے۔ فوج کی نوکری نے اس کو کیا دے دیا۔ ابھی اپنا ذاتی گھر تو بنا نہیں سکا اور کون سا اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھا رہا ہے۔ ایک آدمی بغیر پڑھے اتنی شاندار کوٹھی میں رہ سکتا ہے، اُس کے بچے بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر اسکول جاتے ہیں تو کس واسطے پڑھ کر دماغ خراب کرنا۔" اس کے لہجے میں اپنے بھائی کے لیے تعلیم اور شرافت کی زندگی کے لیے اتنی حقارت تھی کہ میں لرز کر رہ گئی۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ برین واشنگ کتنا مؤثر حربہ ہوسکتا ہے۔ اس آدمی نے چار پانچ دن ہی میں اس کی کایا پلٹ دی ہے۔ پھر بھی پوچھا وہ کون سا طریقہ ہے جس سے اَن پڑھ آدمی شاندار کوٹھیوں، لمبی لمبی کاروں کا مالک بن سکتا ہے۔ پھر بھی بچہ تھا اور اچھی پختہ طریقے پر برین واشنگ نہ ہوئی تھی ایک دم اکڑ کر بولا، بالکل! کیوں نہیں اگر ایک پاؤ ہیروئن بیچو تو کتنا پیسہ ملتا ہے ور جو برابر یہ کام کرتا ہے اس کا پورا خاندان عیش کرتا ہے۔"

" مگر یہ جرم ہے اس طرح پیسہ کمانا تو حرام ہے۔"

" باجی آپ بھی سمجھتے ہو۔ اس طرح پیسہ کمانا حرام ہے۔"

" اور کون بولتا ہے؟"

" ہمارا ابائی اور اس کی طرح کا کم عقل لوگ۔ جرم کیوں ہوگیا۔"

" تم ہزاروں آدمیوں کی زندگی خراب کرو گے، ان کے خاندانوں کو بچوں کو برباد کرو گے تو یہ کوئی حلال روزی تو نہ ہوئی۔"

" اگر ایک بندہ نہیں بیچے گا تو وہ کسی اور سے خرید لے گا۔ خریدنے والے کا قصور ہے اور یہ بات ہے کہ ہیروئن سے کتنی دوائیں تیار ہوتی ہیں۔ بیماروں کی خدمت ہوتی ہے۔ ثواب بھی تو ہوتا ہے۔"

اس کی اس بات سے مجھے احساس ہوا کہ اس کو قائل کرنا آسان نہیں۔ جو بھی اس کے دماغ میں یہ باتیں ڈال رہا ہے وہ کوئی بڑا ماہر ہے اس کام کا۔ سو میں نے خاموشی اختیار کی اور خاموشی سے اس کے اندر آنے والی تبدیلیوں کو نوٹ کرنا شروع کیا۔ ایک بات تو یہ نوٹ کی اس نے نماز کی پابندی رفتہ رفتہ ختم کرنا شروع کردی ہے۔ اگر میں اس کو یاد دلاتی کہ تم نے اس وقت کی نماز نہیں پڑھی تو وہ بڑی ترش روئی سے جواب دیتا کوئی بات نہیں۔ اگر کسی وقت نہیں پڑھی تو کیا ہوگا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مراد کے جانے کے بعد سے وہ رات کو بہت دیر سے واپس آنے لگا ہے۔ صبح دیر سے اٹھتا ہے اس کو بلانے کے لیے جو گھنٹی لگی تھی وہ اس نے قصداً خراب کردی تھی۔ ایک روز وہ

ناشتہ بنانے تقریباً دس بجے نیچے آیا۔ میں نے اس سے کہا، ”بیٹا تم جانتے ہو مجھے ناشتہ سویرے کرنے کی عادت ہے۔ آج تم دس بجے نیچے آئے ہو۔ رات کو بھی تم اتنی دیر باہر رہے۔“ بغیر کسی ندامت کے ڈھٹائی سے بولا، ”ہاں اپنے پڑوس کے پاس دیر ہوگئی تھی۔ دوسرے لڑکے بھی آئے تھے۔“

اس کے لہجہ سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سمجھانے یا برا بھلا کہنے پر اپنی ڈگر سے ہٹنے والا نہیں۔ اس لیے میں خاموش ہوگئی کہ اُس کے بھائی کا فون آئے گا تو میں اس کو بتاؤں گی۔ اپنی مجبوری کے تحت میں اس سے بحث کرنے اور قائل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ اس کا بھائی اکسرسائز اسکیم پر گیا ہوا تھا اس لیے فون بھی نہ کر سکا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اگلے دن وہ وقت پر آیا۔ ناشتہ دیا، ناشتے کے دوران میں نے اس سے پوچھا، ”تم نے آج کل نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ تم آئے تھے تو بڑی باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ اب کیا بات ہوگئی؟“

نماز پڑھ کر ہی تو کام نہیں ہوتا بخشش کے لیے اور بھی کام کر سکتا ہے بندی۔ شہید ہو کر بھی تو آدمی سیدھا جنت میں جا سکتا ہے۔“

”نماز جنت کے لیے یا بخشش کے لیے نہیں پڑھی جاتی ہے یہ تو اپنے پیدا کرنے والے رب العالمین کا شکریہ اطاعت کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور کیا کچھ نہیں دیا۔ ہم اس کی نعمتوں کا شمار بھی نہیں کر سکتے۔ جنت، دوزخ ہمارا مسئلہ نہیں ہمارا مسئلہ اس کی حمد و ثنا ہے۔“

میری اس بات کو سن کر حسب عادت کوئی بحث یا جرح نہیں کی بلکہ خاموشی سے ٹل گیا۔ روز کی طرح سب کام انجام دے کر کئی دن بعد اپنی کتابیں لا کر میز پر رکھ کر بولا ابھی ہم کتاب لے آیا تم ہم کو پڑھا دو۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی تذبذب اور کشمکش سے گزر رہا ہے۔ اس کا نوعمر ذہن کسی الجھن کا شکار ہے۔ صبح جو گستاخی اور ڈھٹائی اس کے لہجے میں نمایاں تھی وہ اب معدوم ہو چکی تھی۔ بڑی پسپائی اور ندامت تھی۔ سو میں نے آگے کچھ کہے بغیر اس کی کتاب کھولی اور پڑھانا شروع کیا۔ اس کا سبق سن کر چند الفاظ لکھوائے کہ ان کے جملے بنا کر دو۔۔۔

(۷)

انتہائی بے دلی سے کام کرتے کرتے اس نے کاپی بند کر دی اور اچانک ہی سوال کر دیا۔ ”آپ ہم کو یہ بتاؤ کہ خود کش حملہ کیسے غلط ہے۔“ ”اب ہم تم کو کیا بتائے بالکل غلط اور گناہِ عظیم ہے۔“ میں نے کہا تو وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ کتاب بند کی۔ ”گناہِ عظیم! وہ کس طرح۔ جہاد کو آپ

لوگ گناہِ عظیم بولتا۔"

"تو اور کیا بے خطا بے قصور لوگوں کو بے خبری میں مارنا۔ ان کے بچوں کو یتیم کرنا اور پھر خود حرام موت مرنا۔ اپنے ماں باپ کا کلیجہ پاش پاش کرنا کہاں کا جہاد ہے؟" "حرام موت کیسے ہوتا ہے۔ خودکش حملہ کرنے والا شہید ہوتا ہے۔"

"شہید! توبہ کرو۔ ایک وقت میں انجانے میں ہزاروں کو بے خبری میں مارنے والا شہید نہیں ہوسکتا۔ خودکشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔"

"کیوں حرام ہے؟" وہ پھر بیٹھ گیا۔ "ہم کو بتاؤ یہ کیا بات ہوئی؟" وہ بہت ہی چکرایا ہوا کنفیوز معلوم ہو رہا تھا۔

"اس لیے کہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے تم کو پیدا کیا ہے۔ تمہاری زندگی اور موت کا اختیار مجھے ہے پھر تم کون ہوتے ہو اپنی جان کو بلا وجہ تلف کرنے والے۔ اچھا میری بات سنو، دیکھو ابھی تم بچے ہو ایسی باتوں میں اپنا سر نہ کھپاؤ۔ کوئی کام سیکھو، پڑھو لکھو اب جاؤ جا کر تھوڑا آرام کرو۔"

وہ چپ چاپ اٹھ کر اوپر چلا گیا۔ اگلے تین دن وہ پہلے کی طرح اپنا سب کام بڑی ذمہ داری سے کرتا رہا۔ ایک دن گھنٹی بجی۔ وہ باہر دیکھنے گیا۔ واپس آ کر کہا، "ہم کو بلانے آیا ہے۔"

"کون آیا ہے؟" "ایک اور لڑکا ہمارے پڑوس نے بھیجا ہے ہم ابھی اس کی بات سن کر آتا ہے۔" وہ گیا تھا تو چولہے پر ہانڈی چڑھی تھی اس نے چولہا دھیما کیا اور چلا گیا۔ اس کو گئے گئے اتنی دیر ہوگئی کہ سالن جلنے کی بو آئی۔ جا کر دیکھا تو جل کر کوئلہ ہوچکی تھی۔ بھوک بھی لگی تھی۔ اپنی بے بسی پر دکھ بھی ہوا، غصہ بھی آیا۔ خیال تھا کہ شاید وہ چلا گیا اب نہ آئے گا۔ چولہا بند کر کے بیٹھ رہی۔ کوئی تین بجے کے بعد وہ آیا۔ ویسے تو جان میں جان آئی۔ "بھئی کہاں غائب ہوجاتے ہو۔ ہم نے اب تک کھانا نہیں کھایا۔ تم مجھ کو بول کر بھی نہیں گئے۔ سب کچھ جل گیا۔" وہ کچھ نادم سا ہوا۔

"اچھا اب میں بنا دیتا ہوں۔" "کیا بناؤ گے ہانڈی تو جل کر کوئلہ ہوگئی۔ اب تم ایسا کرو چائے بنا دو۔ ایک انڈا تل دو۔ روٹی سے کھالیں گے۔"

چائے بنائی، اپنے اور میرے لیے انڈا تلا، روٹی بنائی۔

جب وہ کھانا کھانے میز پر بیٹھا تو میں نے کہا۔

"مینا باز تم کو اس کام کی تنخواہ دیتی ہوں۔ کوئی فالتو کام نہیں لیتی اور تم کام کے وقت سیر و تفریح کو نکل جاتے ہو۔ یہ کوئی انصاف کی بات ہے۔"

ایک دم ہی شرمندہ سی آواز میں بے اختیار اس کے مُنھ سے نکلا، ''غلط بات ہے۔ مگر ہمارا میٹنگ پڑ گیا تھا۔ مجبوری آ گئی۔''

''میٹنگ'' کے لفظ پر میں چونک گئی۔

''میٹنگ! مینا باز تم کس کے ساتھ میٹنگ کر رہے تھے؟''

''ہمارا پڑوس تھا۔ وہ لڑکا تھا۔ اور تین لڑکا اور تھا۔''

''وہ لڑکے کون تھے؟ تم ان کو جانتے تھے؟''

''ہم کو معلوم نہیں۔ ہماری ملاقات پڑوس نے کروائی۔ وہ کسی مارکیٹ کی دکانوں پر کام کرتے ہیں۔''

''کب سے تمہاری ملاقات ہو رہی ہے؟''

''کوئی دو ہفتہ پہلے جب ہم رات کو اس سے ملنے جاتا تھا۔ جب سے ہم سب کو چائے شائے پلاتا ہے۔ گپ شپ لگاتا ہے۔''

''اور سگریٹ بھی پلاتا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔

مجھے احساس تھا کہ اب اس کو مزید نصیحت یا روک ٹوک کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ ویسے ہی بڑے پختہ مغز لوگ ہوتے ہیں ایک دم Thick headed۔ اس لیے میں نے اس کو سگریٹ نوشی یا میٹنگوں کے خلاف کوئی لیکچر دینا مناسب نہ سمجھا۔

(۸)

شعبان کے آخری ہفتے میں اس نے پھر سے منشیات اور خودکش حملوں کے جواز کے بارے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ میں کبھی اس کی بات سن کر ٹال جاتی۔ اس خیال سے کہ سمجھانے بجھانے سے مخالفت کا جذبہ زیادہ شدت پکڑے گا۔ پر ایسا لگتا تھا کہ اس کو جو کوئی بھی یہ باتیں سکھا رہا ہے وہ اس کو ہضم نہیں ہو پا رہی ہیں۔ اس کے دل کو نہیں لگ رہی ہیں اور اس کا ذہن قبول نہیں کر پا رہا ہے۔ وہ بار بار مجھے چھیڑ کر استفسار کرنا چاہتا ہے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ جیسے کیا صحیح ہے کیا غلط ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اس کے بس میں نہ ہو اور اس سلسلے میں وہ ان تمام باتوں کا جو اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے ٹھونسی جا رہی تھیں جواز تلاش کرنا چاہتا ہو۔

ایک روز اخبار سناتے سناتے ایک خبر ادھوری چھوڑ کر اس نے بغیر مخاطب ہوئے میری

طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''باجی اب تم بتاؤ غریب آدمی اچھی زندگی کیسے حاصل کرے۔ اگر کوئی اپنے خاندان کو اچھی زندگی دینے کی خاطر کچھ لاکھ روپیہ اپنی جان دے کر لے لیتا ہے تو وہ حرام موت کیسے ہوجاتی ہے۔ غریب آدمی کیا کرے؟''

''غریب آدمی پڑھے لکھے کوئی کام اور ہنر سیکھے۔ جائز طریقے سے محنت اور حلال کی کمائی میں گزر بسر کرے۔ یہی زندگی بنانے کا آسان طریقہ ہے اور عقل مندی ہے۔''

وہ طنزیہ ہنسا ''ہاں جیسے ہمارا بے وقوف بھائی اپنی زندگی بنا رہا ہے اور میری زندگی بنانے کے خیال میں ہے۔''

اس کی بات اور جس بھائی کو باپ کے برابر سمجھتا تھا اتنے تحقیر آمیز بات کرتے سن کر بڑا دکھ ہوا۔ آج مجھے اپنے شک پر یقین ہوگیا کہ یہ لڑکا کسی عام آدمی کے چنگل میں نہیں پھنسا ہے بلکہ ہماری نسل کشی کے کسی خاص منصوبے کے تحت ان بھولے بھالے بے علم و ہنر لڑکوں کو ورغلانے پر مامور کوئی بڑا فلسفیانہ ذہن مامور ہے جو بڑے نفسیاتی طریقے سے کام کر رہا ہے اور بڑے طریقے سے بتدریج ان کے ذہنی غسل کے مراحل طے کر رہا ہے۔۔۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ جو لڑکا مینا باز ہے وہ اس کی دلیلوں اور ہر فلسفے کو پوری طرح ہضم نہیں کر پا رہا ہے۔ اپنی ذہانت اور سوال اور حجت کرنے والی عادت کی وجہ سے اس طرح آنکھ بند کرے جیسے گل برگ مین مارکیٹ کے کباب پراٹھے کی دکان پر کام کرنے والا لڑکا، یا پتھر کاٹنے والا سبز آنکھوں اور بھورے بالوں والا لڑکا، ایاز ہوٹل میں برتن دھونے والا جبار، اس کی ہر بات پر آنکھ بند کرکے یقین کر لیتے ہیں۔

(۹)

اب آپ ہی انصاف کریں کہ ایسی باتوں پر بندے کو غصہ آئے کہ نہ آئے ایک یہ کہ اگلوں نے ہماری زمینوں کو اپنی شکار گاہیں سمجھ رکھا ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کو کس کس طرح شکار کرنے کے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ اب یہ فرعون کے زمانے والے فرسودہ طور وطریق تو نہیں۔ اور پھر وہ فرعون ایک گھامڑ بدعقل شخص نکلا کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اٹھا کر بنی اسرائیل کے نومولود لڑکوں کو دھڑا دھڑ قتل کروانا شروع کر دیا اور ایک اس زمانے کے سلیس اور نفاست پسند لوگ ہیں کہ خود ہمارے ہی بچوں کو ان کے اپنے ہاتھوں سے قتل کروا رہے ہیں۔ خودکش حملے، برین واشنگ سے ان کے کچے ذہنوں میں زہر بلکہ بارود بھر رہے ہیں۔ ہر قسم کی تخریب کاری کا ایک جواز دے کر اپنے ہی اداروں اپنی ہی اقدار اور تاریخ سے نفرت اور انتقامی جذبوں کی آگ دہکا رہے ہیں۔ اچھا خیر، وہ

تو فرعون تھا جو نسل کشی کے بھونڈے طریقے برت کر تاریخ میں اپنا نام ایک گالی بنا کر لکھوا گیا۔ مگر یہ آج کے انسان دوست ادارے قائم کرنے والے، کس کس بھیس اور روپ میں انسانیت دوستی اور خدمت خلق کے نام پر کیا کر رہے ہیں۔ ویسے ذہن اتنا الجھا ہوا اتنا کنفیوز ہے کہ یہ بھی نہیں پتہ چل رہا ہے کہ جو کچھ سوچ اور سمجھ رہی ہوں اس میں کوئی وزن اور حقیقت بھی ہے۔ جب آدمی کو کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ نہیں ہو پاتا تو وہ الجھ الجھ کر جا و بے جا باتوں پر شک، وہم و گماں ہی کا سہارا لیتا ہے مجھے بھی اس وقت بے جا طور پر اس مشن اسکول پر بھی غصہ آ رہا ہے جو سیالکوٹ میں چترال کی نوعمر اور نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اس کو یہ باور کرا رہا ہے کہ تمہارا تعلق پاکستان یا ایشیا سے نہیں بلکہ یونان اور مشرقی یورپ سے ہے۔ برزنگی کے مُنھ سے یہ بات سن کر اس وقت تو ذرا بھی غصہ نہ آیا تھا۔ بلکہ یہی سوچا تھا کہ انتھروپالجی کا یہی تو کام اور مقصد ہے کہ ہر بات کی جڑ اور بنیاد کے متعلق معلومات فراہم کرے۔ سب کو باخبر رکھے جا و بے جا طور خصوصاً ہم جیسے لوگوں کے جن بڑوں کو جن کے ہاتھوں میں بزعم خود ہمارے مقدرات کی باگ ڈور ہوتی ہے اور وہ اتنے بے خبر ہوتے ہیں کہ کیا کہیے ان کو تو بس ایک ہی کام آتا ہے بیان دیا یا اپنے مخالفوں کی عیب جوئی، ملامتیں۔ ایسے میں ان کو پتہ ہی نہیں چلتا ہماری ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے۔ غصے اور بوکھلاہٹ میں ایسا ہی تو ہوتا ہے کہ آدمی کا دماغ بھٹکا بھٹکا رہتا ہے وہ کبھی کسی پر اور کبھی کسی اور پر اپنا غصہ نکالتا۔ مجھے بھی اس وقت اس لڑکے مینا باز کے اندر تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں یا ذہنی غسل کے اثرات نے بوکھلا دیا ہے۔ یہ تبدیلیاں اور اثرات اتنے گہرے اور پختہ ہیں کہ میرے لیے ان کو اس کے ذہن سے نکالنا اور حرف غلط کی طرح مٹا دینا ممکن نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ اب میں پسپائی اختیار کر کے ہتھیار ڈال چکی ہوں۔

(۱۰)

بقر عید میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ اس نے دس دن پہلے سے اپنا شیڈیول سنانا شروع کر دیا تھا۔ ''ابھی ہم گھر جائے گا۔ بڑا عید کے لیے۔''

''تمہارے بھائی نے تو بولا تھا کہ تم عید پر چھٹی نہ کرنا۔ اب تم جانے کا کہہ رہے ہو۔''

''اس کو بولنے دو ہم عید پر گھر نہیں جائے گا تو ہمارا گائے کون کاٹے گا قربانی کا۔'' آواز میں خاصی گستاخی اور خودسری تھی۔

''اچھا جاؤ گے تو واپس کب تک آؤ گے؟''

''ابھی بول نہیں سکتا۔ وہاں جا کر فیصلہ ہوگا ہم کو واپس آنا ہے یا اُدھر رہنا ہے۔'' میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کا بھائی اور میرا برخوردار کچھ بھی کہے میں اس کو روکوں گی نہیں۔ وہ باتوں باتوں میں کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ نہ بھائی کی پرواہ کرتا ہے نہ اس کے افسر کی۔ اب میں نے ٹھیکہ تو لیا نہیں تھا اس کی اصلاح کا اس کی حفاظت کا بلکہ اب تو اس کی باتوں اور لاپرائی سے کوفت ہونے لگی تھی۔ کبھی ہنڈیا جلا دی کبھی دودھ اُبل گیا، کئی کئی گھنٹے غائب رہتا۔ میں نے اس کا حساب کر دیا۔ ایک ہفتے پہلے ہی پورے مہینہ کی تنخواہ دی تو کہنے لگا ابھی آپ کا ہفتہ باقی ہے تم ایک ہفتہ کا پیسہ کم دو۔ نہیں بھئی تم رکھو اور سمجھنا یہ تمہاری عیدی ہے۔

اگلے دن اس نے بازار جانے کی چھٹی لی۔ دوپہر کے بعد وہ ایک سفری بیگ اور جوگر لے آیا۔ بہت اعلیٰ درجے کا بیگ تھا۔ مجھے لا کر دکھایا۔ پھر اوپر جا کر اپنی پیکنگ کی۔ رات کو پہلے کی طرح کھانا تیار کر کے بڑے قاعدے سے کھلایا۔ بہت صبح اٹھ کر ناشتہ بنایا۔ پھر اوپر جا کر اپنا بیگ اٹھا کر لایا۔ ''آپ ہمارا بیگ دیکھ لو، اور وہ سوئٹر جو آپ نے دیا تھا۔ وہ شرٹ بھی۔''

''ارے ہم کسی کا سامان وامان نہیں دیکھتے اور سوئٹر تمہارے لیے خریدا تھا تمہارا ہے۔''

کچھ دیر وہ چپ کھڑا رہا۔ پھر بولا، ''باجی ایک بات بولو اگر ہم واپس آیا کبھی تو تم ہم کو نوکری دے دے گا۔''

''میرا تو جی یہی چاہتا ہے کہ تم ہمارے پاس رہو۔ مگر یہ سوچو میں خود اپنا کام کیسے کروں گی۔ مجھے اتنا کم نظر آتا ہے۔ اگر تمہارے بعد کوئی دوسرا ملازم رکھوں گی تو پھر اس کو کیسے نکال کر تمہیں رکھوں گی۔ اگر ہفتہ بھر کی بات ہوتی تو کام چلا لیتی اتنے۔''

پھر وہ جاتے جاتے رکا اور بولا ''باجی! ہمارا غلطی معاف کر دینا۔''

''کیا غلطی؟ کس بات کی معافی؟'' میں نے پوچھا۔

''باجی آپ نے ہم کو بہت پیار سے رکھا اور ہم نے آپ کو بہت پریشان کیا ہے۔ اس بات کا افسوس ہے۔ ہمارا غلطی معاف کرو۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا تم ہمارے بچے ہو۔ بچے پریشان بھی کرتے ہیں بلکہ ہم سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو تم ہم کو معاف کر دینا۔''

''نہیں باجی!'' آواز بھرائی ہوئی اور گلوگیر تھی ''تم نے ہم کو کئی۔۔۔''

اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ ''اگر میں پھر آؤں آپ کے پاس تو۔۔۔''

"جب آؤ گے تو دیکھا جائے گا۔" اس نے بیگ اٹھایا اور بے دلی سے بولا، "اچھا اب میں چلوں۔" "ہاں جاؤ۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ دیکھو اس صحبت میں نہ پڑنا جس سے بچا کے تمہارے بھائی نے میرے پاس بھیجا تھا۔ اگر ممکن ہو تو پھر اسکول میں داخل ہو جانا۔"

بھاری قدموں وہ بیگ کندھے سے لٹکائے باہر نکل گیا میں دروازہ بند کر رہی تھی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ بار بار مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہو۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے عید سے پہلے ہی مجھے اس کی جگہ ایک لڑکی مل گئی جیسے تیسے کام چل پڑا۔

(۱۱)

عید کے تقریباً آٹھ دن بعد اس کے بھائی نے فون کیا۔

"سر مینا باز سے بات کرنا ہے۔"

"ہائیں مینا باز سے۔ تم کہاں سے بول رہے ہو۔"

"سر میں آج ہی گھر پہنچا ہوں۔ مینا باز کو بولو اس کا فون ہے۔"

"مگر مینا باز تو عید سے ایک ہفتہ پہلے گھر چلا گیا۔"

"کیا سر! کیا! گھر چلا گیا۔ میں نے تو بولا تھا آپ اس کو چھٹی نہ دیں۔ اس کو بھی بولا تھا۔ وہ گھر تو آیا ہی نہیں۔" وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

"بھئی اس نے مجھ کو بہت پریشان کیا۔ اتنا عاجز کر دیا تو میں نے اس کا حساب کر کے چھٹی دے دی۔ دراصل جب سے اس کا پڑوسی ملا تھا۔ وہ عجیب عجیب طرح کی باتیں کرتا تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔ اچھا خدا کرے پہنچ جائے۔" مجھے واقعی بڑی ندامت اور رنج تھا۔ کاش میں مضبوطی سے اس کو روک کر رکھتی۔ مگر مجھے خوف سا آنے لگا تھا۔

"اچھا سر۔ اس کا اور ہمارا قسمت۔" اس کی آواز میں گہرے ملال اور آنسوؤں کی نمی کی آمیزش تھی۔

ایک ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ میری بینائی بحال ہو چکی تھی۔ ایک دن اس کا فون آ گیا۔

"باجی میں مینا باز بول رہا ہوں۔"

"ارے تم کہاں تھے۔ گھر کیوں نہیں گئے تھے عید پر؟"

میری بات کا جواب دیے بغیر اس نے سوال کیا۔

''باجی اگر میں آ جاؤں تو تم میرا نوکری دو گے؟'' آواز میں افسردگی تھی۔ میں سناٹے میں آ گئی۔ کیسے دے دوں گی دل میں یہی خیال آیا ابھی لاہور میں وقفے وقفے سے دو خودکش حملے تو ہو چکے تھے۔

''نہیں مینا باز! وہ جو تمہارا پڑوس ہے مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ وہ پھر تم کو کام نہیں کرنے دے گا۔''

ایک لفظ کہے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

اس دن کے بعد سے کتنے تواتر سے حملے ہوتے رہے ہیں اور ہر واردات کے بعد ایک سر کی بازیابی کی خبر سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ آنسوؤں سے میری آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ اگرچہ بنی ہوئی آنکھ میں آنسو نہیں آنا چاہیے۔ خرابی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں کہ ہر سر کی بازیابی کی خبر پر میری نظروں میں وہی نوخیز، خود اعتمادی اور پندار سے بھرپور چہرہ گھومنے لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوں کہ میں نے اس روز اس کے سوال کا مثبت جواب کیوں نہ دیا۔ شاید وہ اس کے اور میرے حق میں بہتر ہوتا کہ میں اپنے ضمیر کی ملامتوں کے کرب سے بچ جاتی۔ اور پھر میں اپنے آپ کو یہ سوچ کر مطمئن کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہوں کہ ضروری تھوڑا ہی ہے کہ یہ بازیاب ہونے والا وہی سر ہو۔ پر یہ ایک ہی سر کا معاملہ تو نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہاں وہی کہانی والا سات سر والا اژدھا ہے جو ہمارے ملک کے گوشے گوشے میں گھوم رہا ہے جس کا ایک سر کاٹو تو اس کی جگہ دوسرا سر نمودار ہو جاتا ہے اور وہ کہانی والا اژدھا تو ایک بنی سنوری حسین لڑکی لے جاتا تھا۔ پر یہ کیسا اژدھا ہے جو ایک ہی ہلّے میں سینکڑوں سر لے کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔

اصل بات تو ہماری ہے۔ کیا یہ ہماری خطا نہیں کہ ایک بات دیکھتے ہیں۔ سراسر سمجھتے ہیں۔ اپنی بے نیازی اور بے گانگی سے اس سات سر والے اژدھے کو صرف نظر کی پناہ گاہیں فراہم کرتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ کیا مجھ پر لازم نہ تھا کہ میں مینا باز کے پڑوس (پڑوسی) کا سنجیدگی اور اسی سختی سے نوٹس لیتی جس سنجیدگی اور سختی کا مظاہرہ ان ملکوں والے جو انسانیت دوستی اور احترام آدمیت کا دعویٰ کرتے ہیں، عملی طور پر کرتے ہیں۔ مگر میں ایسا کیوں کروں کہ ہم تو کوئے ملامت کے باسی ہیں۔ ہم تو دوسروں کو الزام دینے اور مذمتیں کر کے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کیا ہم پر لازم نہیں آتا کہ ہم خود اپنے ہاتھوں پر اپنا خون تلاش کریں۔

رضیہ فصیح احمد

خوشبو

میرا کمرہ دادا دادی کے کمرے کے برابر تھا۔ میں دونوں کی آوازوں میں اکثر ایسے مکالمے سنا کرتا تھا۔

یہ کیسی خوشبو ہے؟

فرانسیسی ہے، اچھی ہے نا۔ مجھے چیختی دھاڑتی خوشبوئیں اچھی نہیں لگتیں۔ بڑی نے بھیجی ہے۔

نام کیا ہے؟

فرانسیسی نام ہے، دیکھ لو، مجھ سے کیا پڑھا جائے گا!

چھوڑو، یہ بتاؤ، کہاں چلیں یہ فرانسیسی خوشبو لگا کر!

ذرا ربیعہ کے گھر جا رہی ہوں۔ اس نے بلایا ہے۔ بیلا کی شادی کے سلسلے میں کچھ مشورہ کرنا ہے۔

وہاں وہ بھی تو ہوں گے!

کون؟

وہ جو خوشبوؤں کے شوقین ہیں۔

کون آخر!

وہ الو کا پٹھا جو تصویروں کے پیچھے گھٹیا شعر لکھتا ہے۔ سنا ہے خوشبوؤں کا شوقین ہے۔

کیوں کسی کو الو کا پٹھا کہتے ہو؟

بہت برا لگا یہ بات سن کر۔

بری لگی یہ بات کہ میرا شوہر اتنا گر جائے کہ کسی شریف آدمی کو یوں کہے۔

اور وہ اونچا ہے جو دوسری عورتوں کی تصویروں کے پیچھے عاشقانہ شعر لکھے۔
کبھی کسی سے سن کر بے خیالی میں لکھ دیا ہوگا۔ شعر بھی گھٹیا نہیں تھا، اچھا خاصا تھا۔
شعر یاد ہے اب تک؟
ہاں۔
یادیں بھی ہیں خوشبوئیں بھی ہیں، شعر وشاعری بھی ہے، اچھی بے خیالی ہے!
اگر جان بوجھ کر لکھا تو میری جان کیوں کھاتے ہو۔ چلو چل کر دو دو ہاتھ کرلو۔
تم تو خوشبو لگا کر جاؤ اور میں دو دو ہاتھ کرلوں!
دادی نانی ہوں اب تو شک وشبے چھوڑ دو۔
تم بھی خوشبوئیں لگانی چھوڑ دو۔
تمہیں معلوم ہے آج سے نہیں ہمیشہ سے مجھے خوشبوؤں کا شوق ہے اس لیے بچیاں بے چاری بھیج دیتی ہیں۔
تو اب انہیں منع کردو۔
ارے ارے یہ خوشبو کی شیشی لے کر کہاں چلے، کیا کروگے اس کا۔
کموڈ میں بہاؤں گا اور کیا کروں گا۔
ارے دروازہ تو کھولو۔ خوشبو تو میری بیٹی نے بھیجی تھی۔
سب بہہ گئی تمہاری فرانسیسی خوشبو، لو یہ سنبھالو خالی شیشی، جس کو چاہو تحفے میں دے دو۔
یہ تو بزدلی ہے، کمہار پر بس نہیں چلا تو گدھیا کے کان اینٹھنے لگے۔ اگر میں بڑی کو لکھ دوں کہ تم نے خوشبو کا کیا کیا تو کیا کروگے؟
لکھ کر دیکھو پھر بتاؤں گا۔

....

آج کہاں چلیں خوشبو لگا کے؟
پوتے کے اسکول میں ڈرامہ ہے۔ وہ لے جارہا ہے۔ تم سے بھی تو کہا تھا، تم نے منع کردیا۔ امیر خوش ہوجاتا۔
میں ایسی بیکار چیزیں نہیں دیکھتا، نہ مجھے بہانوں بہانوں سے باہر جانے کا شوق ہے۔
تمہیں بہانوں کی کیا ضرورت ہے۔ جب جی چاہے، جہاں جی چاہے بغیر بتائے جانے

کے لیے آزاد ہو۔

تو؟

تو کیا، اور میں کیا کہہ سکتی ہوں۔

مگر میں کہہ سکتا ہوں اور پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم طرح طرح کی خوشبوئیں لگا کر جانا چھوڑ دو۔

ورنہ؟

ورنہ بہت کچھ۔

دادی آیئے نا دیر ہو رہی ہے، میں نے کہا۔

اندر آؤ بیٹے اور دادی کا ہاتھ پکڑ کر لے چلو۔

آپ تو اچھی بھلی چل سکتی ہیں دادی۔

ہاں۔۔مگر کبھی کبھی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے بیٹے۔

اور میں ان کے کمرے میں جا کر ہاتھ تھام کر انہیں باہر لایا۔

میں بڑا ہو گیا تھا اور دادی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ جب وہ مریں تو کفن میں لپٹی کافور میں بسی یوں لگتی تھیں جیسے سو رہی ہوں، مگر سوتے میں ہلکے ہلکے مسکرا رہی ہوں۔

دادا دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کیوں چلیں مجھے چھوڑ کے، کہاں چلیں کفن پہن کے، خوشبو لگا کے۔۔۔

مجھے لگا جیسے دادی کی مسکراہٹ دادا کے اس سوال کا جواب ہو۔

نکہت حسن

لیب کوٹ

''جلدی سونے اور جلدی اٹھنے'' والے معقولے پر قطعی عمل نہ کرنے والی بچی ہما کل رات جلدی سو بھی گئی تھی اور صبح جلدی اٹھ بھی گئی۔ اس کی ماں کے لیے یہ بات چونکا دینے والی تھی۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی آدھی کھلی ہوئی آنکھوں سے ہما کو دیکھ رہی تھی۔ ہما اپنے کپڑوں کی الماری کھولے کھڑی تھی۔ اس کی پشت ماں کی طرف تھی۔ تاہم اس کی ماں کو آج اس کی پشت پر بھی چمک دار آنکھیں ہنستی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ماں نے اپنی نیند سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے اس کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

''کیا بات ہے! آج تم اتنی جلدی کیسے اٹھ گئیں؟''

''بس یوں ہی'' اس نے پشت پھیرے پھیرے جواب دیا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' وہ اکثر رات کو زیادہ کھا لیتی تھی اور بدہضمی کا شکار رہتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ ویسے ہی کھڑے کھڑے بولی۔

''پھر کیا بات ہے؟ کیا پیریڈس؟''

''اوں ہنھ!'' اس نے اپنا چہرہ ماں کی طرف موڑ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ماں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ برابر میں اس کے باپ سو رہے تھے۔ ہما سنِ بلوغت کو ابھی کچھ دن پہلے ہی پہنچی تھی اور ایسی ساری باتیں جن کا تعلق ان مخصوص ایّام سے تھا مردوں کے سامنے کرنے سے گریز کرتی تھی۔

موسم اچانک ہی بدلا تھا۔ پچھلے دو ہفتوں کی بارش نے زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ شہر

میں پھیلی ہوئی غلاظتیں، کوڑے کے ڈھیر، سمندری ہواؤں کے ساتھ ملے جلے بدبوؤں کے بھبکے، مچھروں اور مکھیوں کے یلغار، سڑکوں پر جگہ جگہ اُبلتے ہوئے گٹر اور ان سے نکلتی ہوئی غلاظت۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس لیے جمع داروں کی قطاریں۔ سڑکوں پر پھیلے ہوئے پانی میں دھنسی ہوئی گاڑیوں کو نکالنے والے مزدور لڑکوں اور مردوں کی ٹولیاں جو گاڑیوں کو اپنا پورا زور لگا کر نکال کم رہے تھے اور دھنسا زیادہ رہے تھے۔ بے روزگاری کے دور میں روزگار کا یہ وسیلہ ان کے لیے غیبی مدد تھا۔ ''روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔''

اسکول بند تھے اور بچے اپنی نیلی پیلی چھتریاں لے کر سڑکوں پر نکل آئے تھے اور مستقل بھیگ رہے تھے اور زیادہ بارش ہونے کی آوازیں لگا رہے تھے۔

ہما اپنی سرخ اور سبز دھاریوں والی چھتری لگائے اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے بچے جوں جوں بارش ہونے کی دہائی ڈالتے ہما کے سختی سے بند ہونٹ اور زیادہ بند ہوجاتے اور وہ دل ہی دل میں اللہ میاں سے بارش رکنے کی دعا کرتی۔

گھر کے اندر بار بار ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور ہما کو ہر بار بالکونی سے ہٹ کر اندر جانا پڑتا تھا۔

''ہلو! ہاں ارم، بولو، میں ہما بول رہی ہوں۔ نہیں، کہاں یار، کہاں خریدا ہے، شام کو ابو لائیں گے۔ نہیں، لبرٹی سے۔ مجھے معلوم ہے یار۔ ہاں نوٹس بورڈ پڑھا تھا۔ پتا ہے مجھے۔ مسٹر سرفراز۔ بغیر کوٹ کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گزری والا۔ معلوم ہے۔ پر ابو۔ وہ لبرٹی۔''

بادل گرجنے کی آواز سن کر ہما نے ٹیلی فون بند کردیا۔ کمرے سے اپنی چھتری اٹھائی اور پھر بالکونی میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ ہونے والی بارش اتنی شدید تھی کہ عمارتیں تک ہلی جا رہی تھیں۔ گھروں کے دروازے زور زور سے کھل رہے تھے اور بند ہورہے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر فضا میں پھیلے ہوئے شور میں مزید اضافہ کررہے تھے۔ بچے خوش تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ہما کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چھتری مستقل ہل رہی تھی۔ وہ اپنے سر پر ایک پُرشور سائبان تانے ان بچوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی جو اپنے شور میں اس کی آواز کو اللہ میاں تک پہنچنے نہیں دے رہے تھے۔ تیز بارش اور کالے سیاہ بادلوں نے ہر چیز کو دھندلا دیا تھا۔ چاروں طرف سیاہی مائل گہرا سرمئی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ آسمان سے برستے ہوئے سیاہ دھوئیں کے بادلوں میں کہیں دور سے ایک سفید گاڑی پانی میں تیرتی ہوئی نظر آئی۔ ہما کو تھوڑی سی امید بندھی۔

لیکن فوراً ہی وہ چمکتی ہوئی گاڑی سڑک پر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہوگئی۔ اس کے اسکول کی سفید عمارت بھی جو اس کے گھر کے سامنے واقع تھی، اس اندھیرے میں گم ہوگئی تھی۔ وہ بالکونی میں کھڑی بھیگے ہوئے جسم اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اس عمارت کو تلاش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی سڑک پر نظریں گاڑے اس چھوٹی سی سفید گاڑی کو بھی ڈھونڈ رہی تھی جو مقررہ وقت پر روز آجاتی تھی۔ اس کے باپ کی سوزوکی۔

ہما ساتویں کلاس میں تھی۔ سامنے والے اسکول میں داخل لیے ہوئے ہما کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ مسز حق کے ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھتی تھی۔ مسز حق نے وہ اسکول اپنے گھر میں ہی کھول رکھا تھا۔ موجودہ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد ہما کو پہلی نظر میں ہر چیز بہت بڑی لگی۔ میلوں پھیلی ہوئی ایک بہت بڑی سہ منزلہ عمارت۔ لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے، لحیم شحیم استاد اور استانیاں۔ بڑے بڑے کمرے، کھیل کے میدان، کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری، بڑی سی سائنس کی تجربہ گاہ جو بجائے خود عجائبات کی دنیا تھی۔ ہما اپنی کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ لیکن اس کو اس بات کا غم تھا کہ وہ ابھی تک ساتویں کلاس میں ہی تھی۔ جب کہ لیبارٹری میں آٹھویں کلاس کے طلباء جاتے تھے اور لیبارٹری میں جانے کے لیے لیب کوٹ (سفید رنگ کا) پہننا ضروری تھا۔ دراصل اس کو لیب کوٹ پہننے کی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ جلد از جلد آٹھویں کلاس میں پہنچ جائے۔

سائنس لیبارٹری سے متعلق کئی باتیں ایسی تھیں جو اس کے لیے نہایت سحر آفریں تھیں۔ مثلاً لیبارٹری کا مسحور کن ماحول، لیبارٹری سے نکلتی ہوئی اسپرٹ لیمپ اور مختلف تیزابوں، الکحل، امونیا وغیرہ سے نکلتے ہوئے بھپکے۔ لیکن جو بات اس کے لیے نہایت پرکشش تھی وہ سفید لیب کوٹ، جس کو پہن کر بڑی کلاس کی لڑکیاں لیبارٹری میں کام کرتی تھیں۔

یہ عجیب و غریب بات تھی کہ اس کو وہ تمام خوشبوئیں اچھی لگتی تھیں جن کو عام طور سے ناپسند کیا جاتا تھا۔ مثلاً لہسن اور پیاز کی بگھار کی مہک۔ جلتے ہوئے کوئلے پر ڈالے گئے گھی کے 'دوگھار' کی خوشبو، زمین پر بکھرے ہوئے پتوں اور کہر کے ابسے پن کی مہک، پیٹرول اور پینٹ کی بو، اُبلتے ہوئے دودھ اور گرم کافی کی پیالی کا اروما، باسمتی چاول کے اُبلنے کی مہک۔ وہ ان سب خوشبوؤں کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔

اس کو اس بات کی بھی بے حد خوشی تھی کہ بڑے اسکول میں داخلہ لینے کے بعد وہ بتدریج

بڑی ہو رہی تھی۔ اسکرٹ بلاؤز کی جگہ شلوار قمیض نے لے لی تھی۔ اب گزشتہ چند ماہ سے اس کے کندھوں کے ساتھ سفید کلف دار دوپٹہ بھی وی کی شکل میں پڑا اس کے بڑے پن کی گواہی دینے لگا تھا۔ وہ پہلے ہی دن پُر اعتماد قدموں سے عمارت کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ تیسری منزل پر پہنچ کر جس کمرے پر اس کی نظر پڑی وہ سائنس کی تجربہ گاہ تھی۔

سامنے دیوار پر ایک انسانی پنجر لٹکا ہوا تھا۔ ہما کو جھرجھری سی آئی۔ فطرتاً ہما ایک ڈرپوک بچی تھی۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اب ایک بڑے اسکول کی بڑی طالبہ ہے، اس نے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر شیشوں میں سے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔

کمرے کے اندر ایک شیلف میں انسانوں اور جانوروں کے مختلف سائز کی چھوٹی بڑی کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ بہت سی ہڈیاں گڈمڈ کی ہوئی تھیں۔ لمبی، چھوٹی، گول، چوکور، بیضوی اور تکونی۔ برابر میں بہت سے دانت، داڑھیں حتیٰ کہ پوری بتیسیاں منہ کھولے پڑی تھیں۔ ہما کو اپنے جبڑے میں لگے ہوئے ان آہنی تاروں کا خیال آیا جو اس نے اپنے آگے آتے ہوئے دانتوں کو پیچھے کروانے کے لے ابھی ایک سال پہلے ڈاکٹر باجوا سے لگوائے تھے۔ اس نے کھڑے کھڑے اپنے دانتوں کو چھو کر دیکھا۔ اس کے دانت مع آہنی تاروں کے اس کے جبڑے میں سختی سے جمے ہوئے تھے۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد اس نے گھوم کر کمرے کا باہر ہی باہر سے چاروں طرف سے جائزہ لینا شروع کیا۔

کمرہ مختلف سائز کی چھوٹی بڑی میزوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیشے کے بڑے بڑے سلینڈر، بنسن برنرز، اسٹینڈ، بیکر، مختلف سائز اور مختلف شکلوں کے جار اور ٹیسٹ ٹیوبز، تیزاب کی بوتلیں اور چمچے۔ مقناطیس کی چھوٹی بڑی قسمیں، شیشوں کے جاروں میں پڑے ہوئے پھول اور ان کے بدلتے ہوئے رنگ۔ لکڑی کے ڈبوں میں سر اٹھائے ہوئے ننھے منے پودے۔ ہما نے اپنی ابتدائی سائنس کی کتابوں میں ان سب چیزوں کے بارے میں پڑھا بھی تھا اور تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ لیکن اس وقت اس سائنس کی تجربہ گاہ کے سامنے اپنی آنکھوں سے ان کی اصل شکل وصورت اور ہیئت میں دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ چیزوں پر سے نظر ہٹی تو ان میزوں پر جا کر اٹک گئی جہاں چند طلبا اور طالبات سفید کوٹ پہنے ہوئے اسٹینڈوں پر جھکے ہوئے مختلف تجربات کرنے میں مصروف تھے۔ سر آئزک نیوٹن، آئنسٹائن، میڈم کیوری، ڈاکٹر عبدالسلام۔ ہما بھوکی بلی کی طرح للچائی نظروں سے ان کو دیکھتی رہی۔ اس کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ یہی تو اس کی خواہش تھی اور یہی سب کچھ

کرنے کے لیے اس کا دل سالوں سے مچل رہا تھا۔ سفید کوٹ پہنے ہوئے۔ سائنس کی تجربہ گاہ میں جلتے ہوئے لیمپ کی نیلی پیلی روشنی میں اس نے بارہا خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ کو کسی سائنسدان کے روپ میں دیکھا تھا۔

خدا خدا کرکے وہ آٹھویں جماعت میں آئی تھی۔ پہلی مرتبہ لیب میں جانے کے لیے پیر کا دن مقرر ہوا تھا۔ مع ایک عدد سفید کوٹ کے۔ ہما بہت خوش تھی۔ لٹمس پیپر کے بدلتے ہوئے رنگ، مقناطیسی کشش، لاتعداد کیمیاوی عمل، گیس اور رقیق کی مختلف شکلیں، برف پگھلنا اور پانی بن جانا اور پھر گیس میں تبدیل ہوجانا، یہ اور اس سے ملتے جلتے اور بہت سے تجربات اب وہ خود کرکے دیکھ سکے گی۔ لیب کوٹ میں ملبوس اسٹینڈ پر جھکا ہوا اس کا سراپا بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور وہ خوشی سے ناچنے لگتی تھی۔

اس کا کوٹ لبرٹی اسٹور سے شام کو اس کے باپ کو لے کر آنا تھا۔ ہما بالکونی میں کھڑی ان کا انتظار کررہی تھی۔ موسم کی تبدیلی نے اس کے چھوٹے سے ذہن میں ہل چل سی مچادی تھی۔ وہ جو پورے ہفتے لیب جانے کے خیال میں مگن رہی تھی، اندیشوں سے بھرا دل لیے کبھی سڑک کو اور کبھی آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

لبرٹی اسٹور کے متعلق اس کو معلوم تھا کہ وہ شہر کا قدیم ترین اسٹور ہے جو صدر کے نام نہاد بازار کی ایک بوسیدہ عمارت کی دوسری منزل پر واقع ہے۔ اس کے تعلیمی کیریئر میں اس اسٹور کو بہت دخل تھا۔ کافی عرصہ پہلے صدر کا یہ علاقہ خوف ناک آگ کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ سارا بازار جل کر راکھ ہوگیا۔ اس وقت اسٹور کے مالک مسٹر ویلوز اسٹور کی سیڑھیوں پر کھڑے بقول شخصے بانسری بجارہے تھے۔ وہ عمارت جس پر یہ اسٹور تھا معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ مسٹر ویلوز کو ایک پائی کا بھی نقصان نہیں ہوا تھا۔ یہ قصہ ہما کے والد نے بہت مرتبہ سنایا تھا۔ بقول والد صاحب یہ مسٹر ویلوز کی دیانت داری کا انعام تھا جو غیب سے انہیں ملا تھا۔ اسٹور تک پہنچنے کے لیے جن سیڑھیوں سے گزرنا پڑتا تھا، وہ پان کی پیکوں سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ اندر چھت تک لگی ہوئی دیمک خوردہ الماریاں دھول سے اٹی ہوئی تھیں۔ یہ الماریاں شہر بھر کے اسکولوں کے یونیفارمز، جوتے، موزے، ٹائی اور تمام اسٹیشنری سے بھری ہوئی تھیں۔ سامان کی زیادتی کی وجہ سے الماریوں کے پٹ چوپٹ کھلے رہتے تھے اور جن کو بند کرنے کی ضرورت نہ مالک اور نہ ملازمین نے کبھی محسوس کی۔ الماریوں میں بہت سے کیڑے مکوڑوں نے اپنے گھر بنا رکھے تھے۔ اسٹور کے درمیان میں ایک بڑی سی

پرانی وضع کی میز پر بیٹھے ہوئے فادر کرسمس سے ملتے جلتے اسٹور کے مالک مسٹر ویلوز اور اسٹور میں سست رفتاری سے چلتے ہوئے چھوٹے بڑے سانٹا کلوز نما سیلز مین۔ یہ اسٹور کم کسی راہب کی خانقاہ زیادہ لگتا تھا۔ جہاں نہ دکاندار کو بیچنے سے دل چسپی تھی اور نہ خریدار کو خریدنے سے۔ ہما کے والد ہی شاید اس اسٹور کے واحد خریدار تھے جو برسوں سے یہیں سے خریداری کر رہے تھے۔ جہاں اچھے موسم میں بھی جانا مشکل تھا۔ کہاں طوفانِ بادو باراں —

آسمان سے مستقل برستا ہوا پانی اور رات کی سیاہی جوں جوں بڑھ رہی تھی، ہما کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اندیشوں سے بھرا دل لیے بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس اندھیرے میں بھی بہت سی تصویریں اور آوازیں اسے دکھائی اور سنائی دے رہی تھیں۔ اسکول کی تجربہ گاہ میں سفید لیب کوٹ پہنے ہوئے، ٹیسٹ ٹیوب ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اسٹینڈ پر جھکی ہوئی اس کی ہم جماعت لڑکیاں۔ تجربہ گاہ کی دھندلی روشنی میں بنسن برنرز کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں سے ان کے خوشی سے جگمگاتے چہرے۔ تیزاب، اسپرٹ اور گیس کی ملی جلی خوشبو۔ کلورین میں پڑے ہوئے پھولوں کے تبدیل ہوتے ہوئے رنگ۔

سر سرفراز اور ان کی بھاری بھر کم آواز:

''بغیر لیب کوٹ کے تجربہ گاہ میں داخلہ ممنوع ہے۔''

ہما نے دھندلی آنکھوں سے پھر سڑک کو دیکھا۔ سونی سنسان سڑک پر دور دور بھی کسی گاڑی کا نشان نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی بارش جیسے قطرے زمین پر گرنا شروع ہو گئے۔

وہ بالکونی سے ہٹ آئی اور اندر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

جلدی سونے اور جلدی اٹھنے والے مقولے پر قطعی عمل نہ کرنے والی بچی ہما اس رات جلدی سو بھی گئی تھی اور صبح جلدی اٹھ بھی گئی۔ صبح حسب معمول اسکول جانے کے لیے اس نے اپنے کپڑوں کی الماری کھولی۔ ہینگر پر لٹکی ہوئی اس کی اسکول یونیفارم کے ساتھ ایک سفید زین کا چمک دار لیب کوٹ بھی لٹکا ہوا تھا۔

تصدق سہیل

پچھل پیری

اس رات سردی یک دم بڑھ گئی تھی۔ وہ جب پارٹی چھوڑ کر گھر پہنچا تو سیڑھیوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میز نائن فلور کے دروازے سے پہلے جو ڈیڑھ گز لمبی خالی جگہ تھی، وہاں کالے کپڑے پہنے کوئی لڑکی چھپی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے اس نے منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ بولا۔ ''یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے اور یہاں کسی کو کھڑے ہونے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میں کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر رکنے کی اجازت دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں باہر رک جاتی مگر سردی کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ جگہ آپ کے لیے بھی درست نہیں۔ آپ دوسروں کا نہیں تو اپنا ہی خیال کریں۔'' پھر جیسے اس نے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سب کچھ سمجھ لیا۔ ''کافی دیر لگی آپ کو سمجھتے ہوئے۔ اس کا پتہ تو آپ کو میری آنکھوں پر ایک نظر ڈالتے ہی چل جانا چاہیے تھا۔ چلیے اب اپنے پچھل پیری کو جاتے جاتے ایک کپ چائے کا ہی پلا دیجئے تاکہ وہ اس سرد رات میں گھر جاتے جاتے کانپتے ہوئے مر ہی نہ جائے۔''

''نہیں تم ان چڑیلوں میں سے نہیں ہو جو سردی لگنے سے مرجایا کرتیں ہیں۔''

ماؤں وہ جنگلی بلی کی طرح غرائی۔ وہ اس کے لیے چائے بنانے لگا۔

وہ بستر پر چڑھ کر ایسے بیٹھ گئی جیسے وہ اسے مدتوں سے جانتی ہو۔ پھر وہ دونوں چائے پیتے ہوئے کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اسے اب کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کب اور کیسے سو گئے تھے۔ اس کے کپڑوں کی چھوٹی سے ڈھیری بستر کے پر ایک طرف رکھی تھی وہ اس سے قریب ہی

عریاں لیٹی ہوئی تھی وہ کافی دیر تک اس کے عریاں جسم کو دیکھتا رہا پھر بھی جب دل نہ بھرا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی لمبی ٹانگوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں بالکل کھول دیں جس کی وجہ سے تمام جسم عریاں ہو گیا۔ اب وہ پانی سے باہر گری ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا تپتا ہوا جسم اس کے جسم پر رکھ دیا تو وہ اسے لے کر چمٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب ان کی آنکھ کھلی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ وہاں تو سوا سرہانوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔

خواب تھا کیا۔ وہ سوچنے لگا۔

کوئی تھا تو ضرور...... کالی کالی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بتا رہی تھیں دروازہ اندر سے بند تھا۔ گئی تو کہاں گئی۔ وہ دیوانہ وار خالی کمروں میں ڈھونڈنے لگا چڑیل ہی نکلی ناں آخر...... وہ غصے میں بڑبڑایا تو کسی نے سامنے دیوار سے تصویر اتار کر اس کے قدموں میں غصے سے زور سے دے ماری۔ ''میں اسی طرح تمہاری تصویریں توڑتی رہوں گی جب تک تم میرا جانگیہ واپس نہیں کرو گے۔''

''کہاں ہو تم...... میں نے کیا کرنی ہے تمہاری چڈی...... میں چیخا۔

''مجھے کیا پتہ۔ کوئی جادو ٹونا کرنا ہوگا مجھ پر......'' یہ سن کر وہ یکدم تپ گئی۔ اب اس کا چہرہ لحہ بہ لحہ رنگ بدل رہا تھا۔

اب پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا وہ واقعی چڑیل تھی۔ اس کے جسم کے مختلف حصّوں میں سے مختلف قسم کی خوشبوئیں آتی تھیں جو خوشی اور غصے کی حالت میں اور بھی دل کش، دل فریب اور نشیلی ہو جاتیں۔ ''اب پتہ چلا تمہیں کہ میں کون ہوں۔ میں عورت ہی نہیں ہوں۔''

''تم بہت کچھ ہو۔'' وہ بولا۔

اس کی دوستی کے فائدے بھی تھے اور نقصان بھی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ بغیر بتائے جب جی چاہتا وارد ہو جاتی اور جب بھی چاہتا چلی جاتی۔ آپ کو ہاں یا ناں کرنے کا کوئی حق نہ تھا گھروں کی چابیاں یا تالے اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتے تھے یہ سب چیزیں بے معنی تھیں یہ سب چیزیں اس کی نظر پڑتے ہی کھل جاتیں۔

انہیں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی جب کبھی بھی وہ ملتے تو ایسے لگتا جیسے وہ پہلی دوسری بار ہی ملے ہوں۔ نہ تو کبھی اس کے آنے کی خوشی ہوتی اور نہ ہی جانے کا افسوس۔ وہ اس کے جانے پر دوسروں کی طرح یاد نہیں کرتا تھا۔ ویسے بھی اب اسے دیکھے ہوئے

ایک سال سے اوپر ہو چکا تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ گرمیاں شروع ہو چکیں تھیں اور وہ کراچی چھوڑ کر چند ماہ کے لیے گرمیاں گزارنے یورپ آ گیا تھا کہ ایک دن دوپہر کے وقت آکسفورڈ اسٹریٹ پر گھومتے ہوئے اسے سامنے سے آتے ہوئے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ ارے تم! وہ اس زور سے چیخی کہ چلتے چلتے مسافر رک گئے۔

''کیوں تم آ سکتی ہو تو میں نہیں آ سکتا کیا۔ ہماری ہوائی سروس تمہاری ایسی ایسی اچھی نہ سہی پھر بھی ہم پہنچ ہی جاتے ہیں۔''

میں موسم بہار میں گھومنے والے بھونروں کی خوشبوئیں اکٹھی کرنے آتی ہوں تا کہ مجھے چند روز اور جینے کی مہلت مل جائے۔''

اس دفعہ تم بھی ٹھیک جگہ پر ہو مگر دوسروں کو چوسنے کے خیال میں خود ہی چُس کر نہ رہ جانا۔ یہ سب بھنورے جنہیں تم چوسنے کے لئے آئی ہوئی ہو وہ سیر کرنے کے بہانے تمہارے لیے آئے ہوئے ہیں۔ یہی نظامِ قدرت ہے۔

اس سال ہم یورپ کی سنہری دھوپ میں رچی ہوئی ٹھنڈی دل کش نیلے ساحلی ساحلوں پر دن رات گھومتے پھرتے رہے۔ دو تین مہینے اسی مزے لوٹتے گزر گئے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو وہ قریب ہی بستر پر ننگی لیٹی سو رہی تھی۔ مجھے یہ عیش و عشرت کی زندگی بہت ہی پسند آنے لگی تھی کہ وہ یک دم غائب ہوگئی کہاں گئی کچھ پتہ نہ تھا۔ بیگم صاحبہ صبح کی فلائٹ سے اسپین چلی گئی ہیں وہ شاید ابیزا چلی گئی تھی چند روز بعد میں بھی کسی دوسرے جزیرے کو چل دیا۔

''تم بھی ایسا نہیں کرو گے تو دوسرے لوگوں کی طرح مر جاؤ گے۔'' اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا۔ ''اسی طرح تو لوگ بڈھے ہو ہو کر مر جاتے ہیں۔''

''تو تم نے بھی کبھی نہ مرنے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ بڑھاپا آئے گا تو تم بھی چلتی بنو گی۔''

''ابھی تک تو نہیں مری ہوں۔''

''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔'' وہ بولا تھا۔

''اتنی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو۔''

''ساڑھے پانچ سو سال کی ہوں میں۔ اور ہاں تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔ مجھے پتہ ہے تمہیں اپنی عمر کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ ڈھائی سو سال سے کم تم بھی نہیں ہو۔''

کراچی میں آنے کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ

کر مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھی ویسے اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے میرے اردگرد گھوم پھر کر یہ ضرور بتاتی رہی کہ وہ مجھ سے دور نہیں۔ میں اب بھی تمہارے قریب ہوں۔

جب بھی میں لوگوں سے باتیں کر رہا ہوتا خوش بو کا جھونکا ہمارے درمیان سے گزر جاتا اور لوگ کہتے کتنی اچھی خوش بو آرہی ہے۔ باغ کی کوئی کھڑکی کھلی ہوئی یا پھر کسی نے خوش بو لگائی ہوئی ہے میں سمجھ گیا تھا اس لیے دو قدم لوگوں سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا آہستہ سے آواز آئی نیلے کپڑوں والی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ زیادہ انتظار مت کرو۔ وہ پھنسنے والی ہے۔ سیدھی بات کرنا اور لے جانا۔'' میں نے دیکھا وہ لڑکی اب میرے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ ''چائے پینے چلیں۔'' میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی کہا۔

''ٹھیک ہے،'' وہ بولی اور میرے ساتھ ساتھ ہو لی۔ ہم کافی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

''بہت پسند ہیں آپ کو۔'' اس نے بار بار مجھے اپنی چھاتیوں کو دیکھتے دیکھ کر کہا۔

''بہت خوبصورت ہیں اور بار بار کھلے گلے سے مجھے جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہیں۔ مجبور ہوں۔''

''تو انہیں کسی ایسے جگہ لے جائیں جہاں آپ انہیں اطمینان سے دیکھ سکیں۔''

وہ اسے اپنے فلیٹ میں لے آیا جہاں پہنچ کر اس نے اپنا بلاوز اتار کر ایک طرف رکھ دیا تو وہ انہیں چوم چوم کر ان کی بلائیں لینے لگا۔

''پتلی خوب صورت شلوار سے جھانک جھانک کر اس کی ٹانگیں اس کے احساسات پر جادو جگا رہی تھیں۔ وہ بھانپ گئی آہستہ سے شلوار اتار کر ایک طرف رکھ دی اور اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ تمہاری چال......

اس نے ایک لمحہ کھلی ہوئی ٹانگوں کی طرف دیکھ کر غور کیا۔ اپنے سیدھے کھلے ہوئے پھیلے ہوئے ہاتھ کو آگے بڑھا کر ٹانگوں کے درمیان انچ بھر اوپر کو ابھرے ہوئے بالوں پر جما کر رکھ دیا۔ اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔

تمام کمرہ خوشبوؤں سے بھر گیا۔

''مجھے نشہ سا چڑھ گیا ہے۔'' وہ اس سے لپٹتے ہوئے بولا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو بستر پر اکیلا سویا ہوا تھا۔ سرہانے کے نیچے ایک خط رکھا تھا جو پچھل پیری کا لکھا ہوا تھا۔

''جا رہی ہوں اور تمہاری محبوبہ کو بھی لے جا رہی ہوں۔ ''محبوبہ'' اس لیے لکھا ہے کہ اس بے وقوف کو سچ مچ میں تم سے عشق ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس کو تمہارے پاس چھوڑ جاتی۔ مگر یہ اتنی اچھی ہے کہ میں اس کو تمہارے ساتھ چھوڑنا گناہ سمجھوں گی۔ اگر کبھی اس کا عشق کا بھوت اتر گیا تو میں ضرور تمہارے پاس لے آؤں گی۔''

ڈاکٹر فاطمہ حسن

وزیر مر گیا ہے، وزیر زندہ ہے

خبر آئی ہے کہ وزیر مر گیا ہے۔ خبر لانے والا بھی وزیر ہے۔ میں عجب کشمکش میں ہوں۔ وزیر کو مرا ہوا تسلیم کر لوں۔ اس بساط کو الٹ دوں جس پر بڑی مہارت سے میں نے وزیر کو بچائے رکھا ہے۔ کھیل کا اختتام کروں یا اسے جاری رکھوں۔ زندگی کی بساط پر تقدیر ہمیں جن مہروں میں الجھا دیتی ہے، ان میں سے ایک یہ وزیر بھی ہے۔ میں یہاں جبر اور قدر کے مسئلے میں الجھے بغیر اس قصے کو سیدھے سبھاؤ پیش کرنے لگی ہوں کہ مجھے خود بھی اس الجھاوے سے نکلنے کا راستہ چاہیئے۔

وزیر میرا نائب قاصد ہے۔ یا شاید نائب قاصد تھا۔ وقت اور حالات کبھی صحیح اور غلط کو اس طرح گڈ مڈ کر دیتے ہیں کہ کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ وزیر ایک وجود تھا۔ یہاں پھر ایک سوالیہ نشان آ جاتا ہے کہ اگر وہ ایک وجود تھا تو جو سامنے موجود ہے وہ کون ہے؟ میں یادداشت کا سہارا لیتی ہوں اب سے بیس سال قبل جب میں اس دفتر میں آئی تھی تو مجھے جو نائب قاصد ملا تھا اس کا نام وزیر تھا۔ اس وقت میں بہت ہنسی تھی کہ ہمارے ادارے کا سربراہ بھی ایک وزیر تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ نائب قاصد وزیر کو دفتر میں کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا تھا ”دوسرے وزیر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اور سب ہنس دیے تھے۔ بہر حال چند روز میں ہی مجھے علم ہو گیا کہ وزیر کیوں قابل قبول نہیں تھا۔ وہ نہ پاگل تھا۔ نہ نارمل۔ کبھی بالکل ٹھیک کام کرتا۔ کبھی بالکل غلط۔ بات کرو تو کبھی سمجھ لیتا کبھی غائب دماغ ہو جاتا۔ کسی روز صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہایا دھویا آفس آتا کسی روز یوں لگتا جیسے بستر سے اٹھ کر آ گیا ہو۔ کبھی وہ قبول صورت رہا ہوگا۔ اب چہرے پر پریشانی کی دھول اڑتی نظر آتی تھی۔ ویسے اس میں کوئی بری عادت نہیں تھی۔ بہت مسکین اور سعادت مند تھا۔ کسی سے الجھتا بھی نہیں۔ جو کچھ کہو سن لیتا لیکن آگے کیا کرے گا۔ بالکل غیر یقینی تھا۔ میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ گزشتہ آٹھ سال سے اس دفتر میں کام کر رہا ہے۔ شادی شدہ اور پانچ بچے ہیں۔ اس کی بیوی بھی اسی ادارے کے ایک ہسپتال میں آیا ہے۔ مجھے اس کی پریشان حالی کا سبب معلوم نہیں ہو سکا۔ بظاہر کوئی ایسا مسئلہ نظر نہیں آتا تھا جسے حل کرنے کی تدبیر کی جاتی میں نے اور دفتر والوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب مجھے کچھ کچھ یاد آتا جارہا ہے۔ ایک دن خلاف معمول وہ میری میز کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کچھ چاہیئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ چھٹی کے لیے درخواست کرے گا۔ لیکن اس نے اپنے الجھے الجھے انداز میں جو کچھ کہا اس کے معنی یہ نکلتے تھے کہ اس کی بیوی کی ہسپتال میں رات کی ڈیوٹی ہے۔ میں متعلقہ افسران سے بات کرکے اسے دن میں تبدیل کروادوں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے اسے اطمینان دلا دیا کہ میں اس کی بیوی کی نائٹ شفٹ کو ڈے شفٹ میں کرنے کے لیے کہہ دوں گی۔ اگلے دن جب میں نے اسپتال کے انچارج سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ عورت خود اپنی مرضی سے رات کی ڈیوٹی کررہی ہے۔ وہ صبح کی شفٹ میں جانا ہی نہیں چاہتی۔ ''آپ چاہیں تو خود اس سے پوچھ لیں۔'' انچارج نے کہا۔ میں نے اپنی تشفی کے لیے جب اس کی بیوی سے بات کی تو اس نے بتایا کہ بچے چھوٹے ہیں، دولڑکیاں اور تین لڑکے ہیں صبح انہیں اسکول بھیجنا ہوتا ہے۔ واپس آ کر گھر پر اکیلے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے رات کی ڈیوٹی کرتی ہوں کہ رات کو ان کا باپ گھر پر ہوتا ہے۔ بات معقول تھی۔ میں نے دفتر کے ساتھیوں سے بھی اس سلسلے میں مشورہ لیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے بھی بیوی کے ٹرانسفر کے لیے کوشش کرچکا ہے بلکہ یہاں تک کہتا رہا ہے کہ اگر رات کی شفٹ ختم نہیں ہوتی تو وہ نوکری چھوڑ دے۔ بھلا ایسی اچھی اور پرانی نوکری کون چھوڑتا ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بچوں کی تعلیم کے اخراجات کیا ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟ پتہ چلا کہ وہ بیوی کے کردار کی طرف سے شک وشبہ میں مبتلا ہے۔ خالصتاً ہمارے یہاں کا سماجی روّیہ۔ گھر میں فاقے ہوں، جہالت اور بیماری پھیلے مگر عورت چہاردیواری میں بیٹھی جھیلتی رہے۔ باہر قدم نکالتے ہی اس کا کردار مشکوک ہوجاتا ہے۔ ان کی نظروں بھی جو خود عورتوں کے ساتھ نوکری کررہے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وزیر تو خود ایک عورت کا ماتحت ملازم ہے۔ کیا اسے کبھی احساس ہوا کہ وہ باس کے حکم کی تعمیل کررہا ہے؟ یا عورت کے حکم کی؟ وزیر اس قسم کے سوال قطعی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ سو میں نے اسے بہت نرمی اور ہمدردی سے سمجھایا کہ اس کی بیوی کا رات کی شفٹ میں کام کرنا اس کی مجبوری ہے۔ وہ اپنے گھریلو حالات کو دیکھے۔ بیوی نوکری پر چلی جائے گی تو بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہوگا؟ اگر یہ مسئلہ حل ہوجائے تو اس کی بیوی کا دن کی شفٹ میں تبادلہ کروادوں گی۔ وہ حسب معمول سر جھکائے میری بات سنتا رہا۔ معلوم نہیں کہ کچھ سمجھا یا نہیں۔ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ اس کی پریشان حالی بڑھتی جارہی ہے۔ اب اس نے خود کلامی شروع کردی تھی۔ کام میں بھی غلطیاں زیادہ کرنے لگا تھا۔ جو

کچھ کہو سر جھکا کر سنتا مگر کام بالکل نہ کر پاتا فائل جس کو بھیجی جائے، اس کے بجائے کسی اور کو دے آتا۔ کسی کو بلانے کے لیے کہا جائے تو دوسرے کو بلا لاتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے چہروں اور چیزوں کی پہچان نہیں رہی ہے۔ جب اس کی سرزنش کی جاتی تو خاموشی سے سر جھکائے سنتا رہتا۔ پھر اسٹول پر بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا۔ خود سے باتیں کرنے کا یہ عمل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے اس کی بیوی کو بلا کر اس کا علاج کروانے کا مشورہ دیا کچھ دنوں کے لیے وہ چھٹیوں پر رہا واپس آیا تو اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس چھٹی نے اس میں غیر حاضری کی عادت بھی ڈال دی تھی۔ اب وہ اکثر دفتر سے غائب رہنے لگا تھا۔ آتا بھی تو اپنی مرضی سے اور جب چاہتا چلا جاتا۔ اسے کچھ سمجھانا پتھر سے سر پھوڑنا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی خود کلامی زیادہ اور آواز تیز ہوتی چلی گئی۔ اس کی بڑھتی ہوئی دیوانگی کو دیکھ کر میں نے اس کی بیوی کو پھر بلوایا اور کہا کہ بہتر ہے کہ اب وزیر معذوری کی بنیاد پر ریٹائر ہو جائے تاکہ ہم دوسرا نائب قاصد رکھ سکیں۔ وہ غریب عورت پریشان ہوگئی اور کہنے لگی چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے، اگر اس کی تنخواہ بند ہوگئی تو گزارا کیسے ہوگا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وزیر کی جگہ آپ میرے بیٹے کو ملازمت دے دیں۔ یہ احسان ہوگا۔ میں نے بیٹے کی عمر پوچھی تو پتہ چلا کہ وہ سترہ سال کا ہے اور میٹرک پاس کر چکا ہے۔ ''جوان لڑکا ہے یوں بھی بیکار پھر رہا ہے۔ باپ کی جگہ کام کرلے تو اس کی بھی زندگی بن جائے گی۔ میرے دوسرے بچے بھی اسکول میں پڑھ لیں گے۔ دو بیٹیاں ہیں ان کی شادی بھی کرنی ہیں۔'' وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کے حالات سن کر وزیر کی ریٹائرمنٹ کا خیال مجھے جرم لگا۔ اس کا بیٹا اٹھارہ سال سے کم عمر کا تھا۔ پھر دفتر میں اپائنٹمنٹ پر بھی پابندی لگی ہوئی تھی۔ ہمارا یہ دفتر جو نیم سرکاری خود مختار ادارہ ہے یہاں خود مختاری صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو صاحب رسوخ ہیں۔ عام لوگوں کے لئے سب قائدے قوانین سرکاری ہیں قوائد کی رو سے وزیر کے بیٹے کو نائب قاصد کی نوکری ملنی ناممکن تھی۔ ایک تو اس کی عمر کم تھی، دوسرے ملازمت پر بھی پابندی تھی، تیسرے ایک خوف یہ بھی تھا کہ وزیر کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی پوسٹ خالی ہوگی تو کوئی بھی سفارشی آکر بیٹھ جائے گا۔ اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے میرے رفقاء نے یہ مشورہ دیا کہ ٹھیک ہے وزیر نہ آئے۔ ہمارا مقصد تو کام چلاتے رہنا ہے اس کی جگہ اس کا بیٹا آجائے ہم اسے ہی وزیر سمجھنا شروع کردیں گے۔ یہ غیر معمولی اور قاعدے قوانین کی رو سے غلط قدم تھا مگر حالات کے پیش نظر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمارے شعبے کے تمام افسران اور ملازمین اس بات پر متفق تھے کہ وزیر کے خاندان کو تباہ ہونے سے بچانا ہے۔ اس کی یہی صورت

تھی کہ اس کے بیٹے کو اس کی جگہ پر کام کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس وقت تک وزیر ذہنی طور پر بالکل غیر متوازن بلکہ دیوانگی کی حد میں داخل ہو چکا تھا اور اگر وہ دفتر آتا تو اس کی دیوانگی کا علم سب کو ہو جاتا ہے۔ تمام رفقاء اور خود اپنے جذبات سے مجبور ہو کر میں نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے کل سے وزیر کا بیٹا کام پر آنے لگے اور وہی تنخواہ لے جا کر ماں کے ہاتھ میں دے دے۔ وزیر کی بیوی ہم سب کو دعائیں دیتی ہوئی خوش خوش رخصت ہو گئی۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم اس لڑکے کو بھی وزیر پکاریں گے۔ لڑکے کو سختی سے ہدایت کردی تھی کہ وہ وزیر کہنے پر ہی مخاطب ہو۔ تابع دار رہے اور کسی سے بھی بات نہ کرے۔

اب اس واقعے کو دس برس ہو گئے ہیں۔ جھوٹ جب مسلسل بولا جائے تو سچ لگنے لگتا ہے۔ گزرے ہوئے دس برسوں میں ہم سب تقریباً بھول گئے کہ وزیر کوئی اور تھا۔ لڑکا دھیرے دھیرے باپ کی شکل میں ڈھلتا گیا اور اپنی نوکری مستعدی سے انجام دیتا رہا۔ کسی کو اس سے شکایت نہیں تھی، تنخواہ بھی ماں کے ہاتھ پر رکھتا۔ پلٹ کر دیکھتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے شطرنج کی بساط پر ایک پیادہ بڑھتے بڑھتے وزیر کے خانے تک پہنچ گیا ہو۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ساتھ کام کرنے والوں میں سے اکثر لوگ جو اصلی وزیر سے ملے تھے چلے گئے تھے جو موجود تھے ان کے ذہن سے بھی نکل گیا تھا کہ کن حالات میں اصل وزیر کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی۔ خود میں بھی اس حقیقت کو تقریباً فراموش کر چکی تھی۔ آج وزیر یہ خبر لایا ہے۔ اس کا باپ وزیر مر گیا۔ میں نے جب سے یہ خبر سنی ہے کشمکش میں ہوں وزیر کو مر جانے دوں؟ وزیر کو زندہ رکھوں؟ یہ کھیل کب تک جاری رہ سکے گا؟ کون سا مہرہ پٹا ہے؟ کسے آگے بڑھانا ہے۔ وزیر مر گیا ہے میرا ذہن کہتا ہے وزیر زندہ ہے، میرے سامنے کھڑا ہے۔ آنکھیں اور دل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں میں چونکتی ہوں۔ سر اٹھاتی ہوں۔ اسے دیکھتی ہوں۔ وہ سر جھکائے، ہاتھ باندھے بالکل باپ کی طرح سامنے کھڑا ہے بلکہ اب تو باپ کا سراپا بھی معدوم ہو گیا ہے۔ دونوں کے چہرے گڈمڈ ہونے لگتے ہیں۔

کیا نام ہے تمہارا؟ میں پوچھتی ہوں۔

وزیر...... وہ رٹا ہوا سبق دہراتا ہے۔

"جاؤ پانی لاؤ"

وہ چلا جاتا ہے۔

بساط جب تک بچھی ہے مجھے کھیلنا ہے۔ وزیر کو زندہ رکھنا ہے۔

محمد عباس

لھیر*

جس دن بچھڑا پیدا ہوا، اسی دن اس کے گلے میں رسی ڈال دی گئی سو آنکھیں کھل جانے کے بعد اسے رسی سے کبھی اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ اس کے واسطے یہ بالکل اسی طرح بدن کا حصہ تھی جیسے اس کی دم یا کان۔ دوسری طرف اس نے اول دن سے اپنی ماں کو بھی اسی طرح کی رسی کے ساتھ دیکھا اور اسے یہی وہم رہا کہ یہ رسی ان کی نوع کا وہی حصہ ہے۔

اس بچھڑے کے ساتھ مالکوں کی اولاد کو بڑا لاڈ تھا اور وہ گاہے گاہے اس کی رسی کھول کر اس سے کھیلتے رہتے۔ دو پایوں کی اس صحبت نے اسے سوچنے کی تھوڑی بہت صلاحیت عطا کر دی۔ جب رفتہ رفتہ اس کے مشاہدے اور تجربے میں اضافہ ہوا تو ایک دن اسے یہ احساس ہو گیا کہ یہ چیز جو اس کے گلے پڑی ہے، یہ اس کے وجود کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس پر مسلط کی گئی ہے۔ یہ اس کے دیگر اعضاء کی مانند اس کے لیے کارآمد نہیں تھی۔ یہ اس کے جسم سے الگ بھی ہو سکتی تھی بلکہ جب علیحدہ ہوتی تو وہ سکھ سا محسوس کرتا تھا۔ یہ ہوتی تو اسے خاصی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب کبھی بھوک لگنے پر وہ ماں کی طرف لپکتا تو یہ رسی اسے رکنے پر مجبور کرتی اور اگر وہ تھوڑی سی تروڑ دینے کی کوشش کرتا تو اس کا پورا جسم گلے میں کھینچ لاتی۔ 'یہ اگر میرے جسم کا حصہ ہو تو میری مرضی سے چلے ناں، الٹا مجھے اپنی مرضی پہ کیوں چلائے؟' اسے یقین ہو گیا کہ یہ رسی نہیں، مالکوں کی مرضی ہے جو مجسم ہو کر میرے گلے سے چمٹی ہے اور مالکوں کی رضا کے خلاف کچھ نہیں کرنے دیتی۔ آخر ایک دن اس نے گھبرا کر اپنی ماں سے پوچھ لیا۔

---

* ایک لمبی رسی جو پالتو جانور کو کسی ایک کھیت میں باندھ کر چرانے کے کام آتی ہے۔ اس کا ایک سرا زمین میں گڑے کھونٹے سے اور دوسرا جانور کی کسی ایک ٹانگ میں باندھ دیا جاتا ہے یوں جانور صرف اپنے مالک کے کھیت میں چرتا رہتا ہے اور دوسروں کے کھیت میں نہیں گھس سکتا۔

''ماں...... یہ میرے گاٹے سے کیا چیز لپٹی ہوئی ہے؟''

ماں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور بے تعلقی سے جواب دیا'' وہی جو میرے بھی گلے میں تمہیں نظر آ رہی ہے''

بچھڑا اچڑ گیا'' نظر تو آ رہی ہے...... مگر یہ ہے کیا؟''

''نہیں ...... مجھے نہیں پتا...... عمر بھر کی غور سے میں اتنا ہی جان سکی ہوں کہ یہ ایسی چیز ہے جس کی موجودگی میں اس بارے سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں''

''لیکن ماں! تمہیں یہ تو خبر ہوگی کہ یہ میرے اور تمہارے گلے میں آئی کہاں سے''

''میں کیا جانوں ...... میں نے تمہیں جنم دینے کے بعد جب پہلی بار دیکھا تو یہ تمہاری گردن میں موجود تھی۔ یہ بھی شاید تمہاری طرح میرے پیٹ سے نکلی ہوگی''

''نہیں''...... بچھڑا چیخ پڑا'' یہ تمہارے پیٹ سے نہیں نکلی...... یہ مالکوں کے ہاتھ کی بنی ہے''

''چلو جو بھی ہے، جب یہ موجود ہے تو پھر............؟''

''یہی تو میرا سوال ہے، آخر یہ موجود کیوں ہے۔ کیا ہم اس سے اپنی جان چھڑا نہیں سکتے''

''پتر یہ ہمارا مقدر ہے جو ہمارے گلے پڑا ہے اور مقدر سے کون بھاگ سکتا ہے'' ماں نے بڑی اداسی سے کہا اور اپنی کھرلی پر جھک گئی۔

بچھڑا اکھڑ گیا'' میں اس...... مقدر کو قبول نہیں کرتا۔ میں اسے اپنی تقدیر نہیں مانتا۔ میں اسے اتارنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہوں ...... یہ مالکوں کی مرضی میرا دم گھونٹتی رہتی ہے...... میں...... میں اسے اپنے کھردں تلے کھوند ماروں گا''

ماں نے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا'' خاموش............ گستاخ...... آئندہ ایسی بات منہ سے نکالنا بھی مت۔ اسی جرم میں تم سے پہلے تمہارے تین بھائی قصائی لے گیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی میری نظروں سے نکل جاؤ''

وہ حیران ہو گیا۔'' یہ قصائی کون ہے۔ اور یہ میرے بھائیوں کو کیوں لے گیا تھا''

''آہ...... تمہیں کیا بتاؤں۔ وہ ظالم ہے تو تمہارے مالکوں جیسا لیکن اس کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔ وہ جب جسے پکڑ لیتا ہے پھر اس کی آواز بھی نہیں نکل پاتی۔ تم اپنے مالکوں کی مرضی پر غصے ہو رہے ہو مگر اس کی مرضی کہیں زیادہ تیز ہے۔ اس نے اپنی مرضی تمہارے گلے پر رکھ دی تو تم ایک سانس بھی مزید زندہ نہیں رہ پاؤ گے۔ وہ تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اپنے بھائی

بندوں کو کھلا دے گا۔ تم اگر چاہتے ہو کہ میرے دل پر اور گھاؤ نہ لگے تو خاموش رہو۔ تھوڑے سے اتھرے ہوئے تو اس مرضی کی جگہ قصائی کی مرضی لے لے گی۔ تم بس چپکے رہو۔ اور میرے تھنوں سے جتنا دودھ تمہیں پینے کو ملے، پیتے رہو۔ میں بھی خوش رہوں گی کہ میرا کچھ دودھ تو میرے اپنے بچے کے کام آیا''

وہ کافی دیر تک قصائی کے خوف سے لرزتا رہا۔ پھر منمنا کر بولا ''لیکن ماں، تمہارا سارا دودھ میرا کیوں نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ماں میری ہو اور اس کا دودھ یہ دولتے لے جائیں۔ آخر یہ ظلم کیوں؟''

''میرے بھولے! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ یہ ہمارا مقدر ہے۔ جتنی بھی کوشش کرلیں ہم اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہمارے لیے یہ بھی بہت ہے کہ اپنا لیکھا ہی آسانی سے ملتا رہے۔ تمہیں ایک تھن مل جاتا ہے..... شکر کرو، اگر یہ تمہیں کاٹ کھا جائیں اور چاروں تھن خود پینے لگیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟''

''تو پھر کیا میری زندگی تمہاری طرح اسی کلے پر گزرے گی؟''

''تم نر بچے ہو، تمہارا کلے پر کیا کام۔ تم تو سارا جگ گھومو گے''

''تو کیا ابا اور چچا کی طرح ہل کھینچتے کھینچتے مر جاؤں گا؟ کیا میری اپنی کوئی زندگی نہیں؟ اس سے بہتر نہیں کہ یہ مجھے کاٹ ہی کھائیں۔ عمر بھر کے عذاب سے جان تو چھوٹے گی''

''نہ میرے پتر۔ مرنے کی بات نہ کر۔ میں تمہارے لیے کچھ سوچتی ہوں، بلکہ جب باہر چرنے گئی تو اپنی سہیلیوں سے بھی تمہارے لیے کوئی ترکیب پوچھوں گی۔ تم بے چنتے رہو، ہم کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گی''

کچھ دنوں بعد ایک روز اس کی ماں چرائی سے لوٹی تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''مبارک ہو۔ تمہاری رہائی کی تدبیر مل گئی۔ میری ایک بوڑھی سہیلی نے ایک بہت اچھی تجویز دی ہے۔'' ہنسی ماں کی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی ''اس نے مجھے بتایا ہے کہ گاؤں والوں کو اپنی گائیں گجانے کے لیے ایک بیل کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر کوئی بچھڑا زیادہ اتھرا نہ ہو تو جوان ہونے پر اسے آزاد کر کے اپنی گائیں گجنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ گاؤں بھر کی فصلیں، پٹھے کھانے کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ اور اسے اپنی مرضی پر جینے کی کھلی چھوٹ ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ لوگ تمہیں اس کام کے لیے رکھ لیں۔ بس تم شرافت سے رہنا۔ کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا

مت کرنا۔ دو ہی تین سال میں تم گائیں بکنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ پھر تم آزاد...... اپنی مرضی کے مالک ہو جاؤ گے"

بچھڑا کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولا "ٹھیک ہے۔ میں یہ تو کر لوں گا، لیکن ایسا نہ ہو کہ میری اتنی شرافت کے باوجود بھی یہ مجھے آزاد نہ کریں، کسی اور کو رکھ لیں؟"

"تم فکر نہ کرو، میں نے پہلے ہی یہ سوچا ہوا ہے۔ میں اپنی سہیلی کے ذریعے پرانے بیل سے تمہاری سفارش کرا دوں گی، اس کی ضمانت مالکوں کے لیے بہت ہو گی، پھر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا"

☆☆☆

بچھڑا تھا تو سیانا، ماں کی بات سمجھ گیا اور سیل ساؤ انداز میں رہنے لگا۔ یوں گویا کسی کو احساس ہی نہ ہو کہ کلے پر کوئی جانور بندھا ہوا ہے...... دن گزرتے گئے...... جب وہ چھیگا ہو گیا اور مالک اسے بچھے کی بجائے داند کہنے لگے تو ایک دن انہوں نے اسے کلے سے کھولا اور ایک کھلی جگہ لے گئے جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ اسے سارے مجمعے میں گھمانے کے بعد لے جا کر ایک درخت سے جکڑ دیا گیا۔ کچھ دیر بعد اچانک اسے پشت پر شدید جلن کا احساس ہوا۔ وہ تڑپ کر بندھن تڑانے لگا، مگر یہ اس کی طاقت سے باہر تھا۔ سب لوگ اس کی پھڑکن سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ جب تک اسے جلن رہی، وہ تڑپتا مچلتا رہا مگر نہ خود آزاد ہو سکا نہ کوئی اور اسے کھولنے آیا۔ آرام آ جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ سبھی لوگ جا چکے تھے اور وہ اکیلا وہاں بندھا رہ گیا تھا۔ دوسرے دن صبح سویرے اسے کھول دیا گیا اور اس کے گلے سے رسی بھی اتار دی گئی۔ کھلنے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف کو چل دیا۔ وہ یہ محسوس کر کے خوشی سے ڈگمگانے لگا کہ اس کے گلے میں اب وہ رسی نہیں ہے جو اسے اپنی مرضی سے باز رکھتی تھی۔ اب تو پورا گاؤں اس کی مرضی کے نیچے تھا۔ رات بھر کا بھوکا تو وہ تھا ہی، جہاں سبزہ دکھا، منہ مارنے لگا۔ شام ہوتے تک اس نے پورے گاؤں کی فصلوں کا ذائقہ چکھ لیا۔

وہ جان چکا تھا کہ اماں کی پیشین گوئی پوری ہو چکی ہے اور اب وہ آزاد ہے...... اپنی مرضی کا مالک...... جو چاہے کر سکتا ہے، جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ سو اس نے اپنی آزادی کا جی بھر کے لطف لیا۔ دل چاہتا تو بھاگتا، مرضی ہوتی تو بیٹھ رہتا۔ جن پٹھوں پر دل آ جاتا، پیٹ اور جی بھرنے تک کھاتا رہتا، جہاں خواہش ہوتی، پڑ کر سو رہتا۔ بس وہ تھا اور اس کی نوخیز آزادی کا نشہ جس کا سرور

ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔

اس کی ایک اور موج بھی بنی ہوئی تھی ۔ ہفتے دس دن بعد کوئی نہ کوئی بندہ اپنی لار گائے اس کے پاس رُلانے کے لیے لے آتا۔ یہ کام اسے سب سے زیادہ مخمور کرتا۔ وہ گائے کے قریب جا کر اوپر والا ہونٹ سکوڑ کر اس کے لار کی مہک لیتا اور پھر جوش میں آ کر اپنی بھری جوانی سے اسے پھرک دیتا۔ اسے اپنی آزادی کی سب سے زیادہ خوشی اسی عمل سے ہوتی تھی۔ فصل فصل منہ مارتے ہوئے ،لار گائیوں کے پچھلاپے سے ہمکتی میٹھی میٹھی خوشبو کا خیال اسے مست کر دیتا اور ان کے قرب کی یاد سے اس کی جوانی کا ہر ہر پل نشیا اٹھتا۔

اب اسے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ آزادی تھی اور ہر کام کی آزادی تھی۔ چرنے کو گاؤں بھر کی چراگاہیں، فصلیں اس کے سامنے موجود تھیں۔ کوئی اسے روکتا ٹوکتا نہ تھا۔ اپنے رس بھرے شباب کا لطف اٹھانے کے لیے سارے گاؤں کی گائیں حاضر تھیں۔ اسے اور کس چیز کی ضرورت ہوتی۔ اس کا جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتائے کہ میں اب آزاد ہوں...... میں اب آزاد ہوں۔

☆☆☆

آزادی کی اس مستی میں گاؤں کی سیر کرتے ہوئے اسے جو بھی جانور گلے میں مالک کی مرضی سجائے ملتا، وہ اس کے ساتھ بڑی تحقیر سے پیش آتا اور اس کے سامنے اپنی آزادی کے فوائد گنتا رہتا۔ جانور اس سے تنگ تو پڑتے مگر کچھ جواب نہ دے پاتے کہ بات سچی کہتا تھا۔ ایک دن اسی طرح سرشاری کی لہر میں چلتے ، اس نے ایک بکری کو دیکھا جو ایک لھیر سے بندھی گھاس پر منہ مار رہی تھی ۔ اس نے بکری سے مشکری کی۔

''بی بکری! سناؤ کیسے مزاج ہیں؟ کیسی گزر رہی ہے اس لھیر کے ساتھ؟''

''بس مزے سے ہوں بھیا۔ اور اس لھیر کا کیا پوچھتے ہو، یہ تو اپنا مقدر ہے، اس کا کیا ذکر کرنا؟''

''مقدر...... ہاہاہا...... ارے ننھی یہ سب بکواس ہے، یہ مقدر شقدر کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھو میں نے کیسے غلامی سے اپنی جان چھڑائی۔ مالکوں کی مرضی اتار، اپنی مرضی جی رہا ہوں''

''ہی ہی ہی'' بکری بے طرح ہنسنے لگی۔

''چپ لتری...... تمہیں ذرا تمیز بھی ہے بڑوں سے بات کرنے کی۔؟ کیوں اس طرح ہنسے جا رہی ہے؟''

''مجھے تو تمہاری نادانی پر ہنسی آ رہی ہے۔ کس سادگی سے کہہ رہے ہو کہ اب تم آزاد ہو۔ تم سا بھولا بھی شاید ہی کوئی ہو۔ ہی ہی ہی'' بکری دوہری ہونے لگی۔

''بکواس بند کرو۔ میں آزاد ہوں اور آزاد ہوں...... میں کسی کو اپنی آزادی اور خود مختاری کا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں دے سکتا...... تمہیں اگر کوئی شک ہے تو ابھی سامنے والے کھیت میں گھس کر تمہیں دکھاتا ہوں۔ کسی دولتے میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھے روک سکے'' بچھڑے کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

''ہی ہی ہی۔ بڑے بھیا! اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں''

''جانوروں کی طرح بات کرو تو مجھے کیوں برا لگے، مگر پہلے یہ انسانوں جیسی مکروہ ہنسی بند کرو''

''ٹھیک ہے بڑے بھیا'' بکری سہم کر سنجیدہ ہو گئی ''کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کی پشت پر ایک گول گول سا نشان ہے۔ کسی چیز سے جلنے کا؟''

''نہیں تو۔ کیسا نشان؟''

''بس تھوڑی سی جگہ جلی ہوئی ہے اور اس پر انہی دولتوں نے کچھ مکوڑے کھود رکھے ہیں''

''مجھے تو خبر نہیں۔ خیر ہو گا کچھ۔ مجھے اس سے کیا''

''بڑے بھولے ہو بھیا، تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ یہ نشان ہے کیا؟''

''ایں...... ایسی کیا بات ہے اس میں''

''یہ انسانوں کا بنایا نشان ہے۔ یہ تمہارے مالکوں کی وہ مرضی ہے جو تمہیں نظر نہیں آتی۔ یہ تمہاری غلامی کا داغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم گاؤں کے سرکاری سانڈ ہو اور جو کوئی بھی اپنی گائے رلانا چاہے، تمہارے پاس لا سکتا ہے۔ تم چاہتے ہوئے بھی اس کام سے بھاگ نہیں سکتے۔ نہ ہی ان انسانوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے ہو۔ تم بھاگ کر جہاں بھی گئے، تمہیں پکڑ کر واپس یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ جو مہر ہے، یہ تا عمر اس پورے گاؤں کی غلامی کا نشان ہے۔ تمہیں نظر نہیں آتا تو کیا، ہر دولتے کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے گی۔''

''چلو ہو گا۔ مجھے کیا۔ میری تو موجیں بنی ہوئی ہیں ناں۔''

''ہی ہی ہی...... معاف کرنا بڑے بھیا، ہنسی نہیں رک رہی'' بکری نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے اس پر ترس بھری نگاہ کی ''تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے دولتوں کی مرضی اتار پھینکی ہے لیکن وہ رسی جو اتر گئی، وہ ایک دولتے کی مرضی تھی۔ یہ نشان تو پورے گاؤں کی مرضی ہے جو تمہارے اوپر مسلط

ہے۔تم پہلے ایک کے غلام تھے اب پورے گاؤں کے غلام ہو۔''

''کیسا غلام......؟میں کسی کتے کا غلام نہیں ہوں۔''

''بھیا، جو آزادی آقا خود اپنے ہاتھوں دے، اس میں بھی غلامی کی کوئی نہ کوئی صورت پنہاں ہوتی ہے۔''

''مجھے تو کوئی غلامی نظر نہیں آتی۔ میں اپنی مرضی سے جی رہا ہوں۔جو میرا دل چاہے کھاتا ہوں، جہاں تمنا ہو سو رہتا ہوں۔آزادی اور کیسی ہوتی ہے۔''

''آزادی کا تو مجھے پتا نہیں، البتہ کچھ کچھ جانتی ہوں کہ غلامی کی کتنی شکلیں ہوتی ہیں۔ان میں سے بھی بدتر شکل تمہاری غلامی کی ہے۔اس غلامی کا سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ غلام کو غلامی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تئیں آزاد ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ انہوں نے تمہیں اپنی گائیں پھلرنے کے لیے باندھ رکھا ہے۔جس کی گائے لار آ جائے، تمہیں برتنی ہی پڑے گی۔ یہ ہے تمہاری غلامی۔تم ہی بتاؤ اور غلامی کیا ہوتی ہے۔''

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے ننھی۔ اور میں یہ سب کرتا بھی تو اپنی مرضی سے ہوں۔''

''حرج کا کیا پوچھو ہو۔تمہیں یہ محض وہم ہے کہ تم یہ سب اپنی مرضی سے کرتے ہو۔تمہاری آنکھیں کھل جائیں اگر کسی دن تم گائیں پھلرنے سے انکار کر دو۔ پکڑ کر اسی دن قصائی کے ہاتھ دے دیں گے اور تمہاری آنکھیں تب کھلیں گی جب قصائی کی مرضی تمہاری گردن پر دھری ہو گی اور میرے پیارے بھیا! اس کی مرضی سے زیادہ خوفناک چیز دنیا میں اور کوئی نہیں'' بکری نے جھرجھری لی۔

''نہیں نہیں تم جھوٹ بولتی ہو۔آج کے بعد میں کسی گائے کے قریب پھٹکوں گا بھی نہیں۔ تب تم دیکھ لو گی کہ میں کسی کا غلام نہیں۔ میں بہت جلد تمہیں یقین دلا دوں گا کہ میں اپنی مرضی کا خود مالک ہوں اور مجھ پر کسی اور کی مرضی نہیں چلتی۔''

یہ کہہ کر بیل اینڈتا ہوا وہاں سے پلٹ آیا۔

☆☆☆
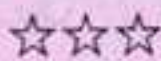
اسی شام کچھ لوگ اس کے پاس ایک گائے کو لے کر آئے لیکن اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور منہ پھیرے کھڑا رہا۔کافی دیر وہ اس کے بدن پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے اور کانوں کے پاس ہولی ہولی سیٹیاں بجا کر اسے ابھارنے کی کوشش کرتے رہے مگر اس نے بھی ہل کر نہ

دیا اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر گائے کی طرف دیکھا۔ کافی دیر تک وہ لوگ اپنی سی کرتے رہے مگر بیل تو بالکل ہی ٹھنڈا یا گیا تھا۔ آخر ایک دولتے نے ہاتھ بڑھا کر اس کے نچلے بدن کو چھیڑنا شروع کر دیا کہ شاید اسی طرح جوش میں آجائے لیکن سانڈ الٹا اس حرکت پر غصے ہو گیا اور نتھنوں سے شوشو کی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ شخص گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ دو آدمی فوراً دوڑ کر گاؤں کی طرف گئے اور تھوڑی دیر بعد لاٹھیاں اٹھائے لوٹ آئے۔ دونوں آتے ہی بیل پر ٹوٹ پڑے۔ کھچک کھچک لاٹھیاں برسنے لگیں۔ اس نے پہلے تو سینگ، کھر مار کر انہیں رگیدنے کی کوشش کی مگر دولتے اس کے حملے بچا جاتے۔ آخر کوئی چارہ نہ پا کر وہ بھاگ اٹھا۔

دوڑتے دوڑتے وہ بیلے میں گھس گیا اور اسی رفتار سے بھاگتا رہا۔ اس دوران میں اس نے کئی بار پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک لاٹھیاں اٹھائے پیچھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آگے دریا کا کنارہ آ گیا۔ اب اسے رک جانا پڑا۔ آگے پانی اور پیچھے لاٹھیاں.......... "تمہاری آنکھیں کھل جائیں اگر کسی دن تم گائیں پھلرنے سے انکار کر دو......"

وہ خاموش کھڑا تعاقب میں آتی لاٹھیاں دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد وہ بکری کے قریب سے گزر رہا تھا۔ بکری نے لھیر کو آخری حد تک کھینچتے ہوئے اس کے قریب پہنچ مسکرا کے پوچھا "جی بڑے بھیا۔ کیسے مزاج ہیں آج کل؟"

"بس موجاں ای موجاں ہیں۔ تم اپنے لھیر میں خوش ہو، میں اپنے لھیر میں خوش ہوں۔" اس نے بڑے رسان سے جواب دیا اور مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

برتنا۔ نر کا مادہ سے جنسی تعلق قائم کرنا۔

رلنا۔ جانوروں کے ملاپ کے لیے ایک عام رسمی لفظ

کجنا۔ بیل اور سانڈ جیسے بڑے جانوروں کا اپنی مادہ سے جفتی کرنا

پھلرنا۔ عموماً بکرے کی بکری سے جفتی کرنے کے بارے میں، استعمال ہوتا ہے۔

پھرکنا۔ یہ عام طور پر مرغوں کے جنسی حملوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یا اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جنسی عمل کو فوراً ختم کرنا۔

محمد عباس

رنگ

سب حیران رہ گئے جب اچھا رات دس بجے ہی گھر واپسی کو اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت ہم چاروں دوست حسبِ معمول میرے ڈیرے پر تاش کھیل رہے تھے۔ تاش ابھی ابھی شروع ہوئی تھی جس کا مطلب ہے کہ رات بھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ دس بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ ''رنگ'' کا رنگ جمنے بھی نہ پایا تھا کہ اچھے نے تاش پھینٹنے کی بجائے اکٹھی کر کے ایک طرف رکھ دی۔ یہ واضح اشارہ کھیل ختم کرنے کا تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً ہی گھڑی دیکھی اور ساتھ ہی جیب سے سگریٹ ماچس برآمد کر لیے ''لگتا ہے، آج اچھے کا چائے بنانے کو دل ہے۔ ٹھیک ہے یار۔ اٹھو ذرا چھوکری قسم کی چائے تو پلاؤ''

''چاہ ہو جئے تو سادہ سرگٹ بھی ڈبل کا مزہ دے'' کالو نے لقمہ دیا۔

''نئیں یرا۔ میں تو جا رہا ہوں ...... گھر۔ تم لوگ بیٹھو اور گپ شپ کرو'' اچھے نے بھی اپنا ولز کنگ کا سگریٹ سلگایا اور دونوں ٹانگیں میز پر رکھ کر بڑا پرسکون ہو کر سوٹے مارنے لگا۔

کالو نے تاش اٹھائی اور اس کا پنکھا بنانے لگا ''سدھی طرح کیوں نہیں کہتا کہ سرگٹ پینے کو دل کر رہیا ہے۔ گھر جانے کا بہانا کیوں کرتا ہے''

''نئیں ...... میں تو بس یہ آخری سگریٹ پیوں گا اور ...... گھر''

''فضول بکواس نہ کر۔ یہاں رنگ تیرا پیو کھیلے گا۔ چوتھا بندہ ...... تمہاری ...... سے نکالیں گے'' کالو نے اسے گھورا۔

''نہیں او یارا۔ ایویں بونگیاں مار رہا ہے۔ یہ کہاں جائے گا۔ یہ تو رات کو بھی بھگتا کر گھر جانے والا شخص ہے''

مجھے تو یقین تھا کہ اچھا اتنی جلدی گھر نہیں جانے کا۔ ابھی تو اس کی دوپہر بھی نہیں ہوئی۔ ابھی چلا گیا تو اسے نیند کہاں سے آئے گی۔ اس کی نیند تو اذانِ سحر کی محتاج تھی۔ ادھر صبح کی اذان بلند ہوتی، ادھر اس کے چہرے پر پہلی جمائی پھوٹتی۔ نمازیوں کو گھروں سے نکلتا دیکھنے کے بعد ہی کہیں اسے گھر جانے کی ہڑک پیدا ہوتی تھی۔ اور وہی اچھا آج اتنی جلدی گھر جانے کو کہہ رہا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ تاش سے تو ہم لوگ دو بجے تک اٹھ جاتے تھے۔ ڈاکٹر اور کالو نے صبح اپنی اپنی دیہاڑی لگانی ہوتی تھی، سو انہیں تو جلدی گھر واپسی ضروری تھی۔ پر میں اور اچھا ان کے بعد بھی بیٹھے رہتے۔ کبھی تو پنکھا چلا کر ڈیرے پر ہی بیٹھ جاتے، جو تاش کے دوران، پتے بکھرنے کے اندیشے سے بند ہی رہتا تھا۔ اگر کسی دن اچھا زیادہ حساس ہو رہا ہوتا تو پھر پنکھے کی آواز اس کے اعصاب برداشت نہ کر پاتے اور ہم ڈیرے سے نکل کر گلیوں میں گھومنے لگتے۔ آج کل تو مستقل ہم دونوں ''سیانوں'' کے پاس بیٹھ رہے تھے۔ ''سیانے'' ہم نے ایک خاص جگہ کو نام دے رکھا تھا۔ گاؤں کے مرکزی چوراہے میں ایک بڑے سے تھڑے پر سارا دن گاؤں کے بڈھے ٹھیرے لوگ چوپال جمائے بیٹھے آپس میں اپنے اپنے تجربے بانٹتے رہتے۔ خوبیٔ قسمت سے یہ چوراہا ایسا تھا جہاں سے اپنے اپنے گھر جاتے ہوئے میرا اور اچھے کا راستہ جدا ہوتا تھا۔ ایک رات گھر جانے سے پہلے ہم وہاں تھوڑی دیر کو رک گئے۔ وہاں بیٹھ کر جو اچھے نے گفتگو شروع کی تو ایسے ایسے کمال کے جملے کہے کہ ہم دونوں ہی حیران رہ گئے۔ اتنی عقل مندی کی باتیں ......اچھے کو سوجھیں کیسے؟ میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس تھڑے پر چونکہ دن بھر سیانے بابے بیٹھے رہتے ہیں، ان کی سیانپ کا اثر لگتا ہے یہاں ہر وقت رہتا ہے۔ بس اسی اثر سے اچھا بھی سیانا ہو گیا ہے۔ اب کیا تھا، ہم نے اس جگہ کو ''سیانے'' کا نام دے دیا اور معمول بنا لیا کہ رات کو تاش کے بعد کافی دیر ''سیانوں کی معیت'' میں بیٹھا کرتے۔ وہاں اچھا صاحب ولز کنگ کی پوری پوری ڈبی پھونک ڈالتے، پر باتیں ایسی گجھی ہوئی کرتے کہ اصل سیانے بھی سنتے تو اس سے دانائی کا درس لیتے۔

سگریٹ ختم ہوا تو اچھا اٹھ کے چل پڑا'' ٹھیک ہے یرا، میں چلتا ہوں، آئندہ دس بجے تک ہی بیٹھا کروں گا۔ جب تک میرا ابا واپس نہیں جاتا، تب تک تم اپنے لیے کوئی چوتھا سنگی ڈھونڈ لو''

کالو نے اپنی چنیدہ گالیوں سے اسے نوازا۔ ڈاکٹر نے سوشل بائیکاٹ کی دھمکی دی۔ تاش کا واسطہ بھی دیا گیا، سیانوں کی بھی یاد دلائی گئی مگر وہ ذرا بھی ماٹھا نہ پڑا اور چھلنی کے پانی کی طرح

ڈیرے کی حدوں سے نکل گیا۔ کالو نے تاش میز پر پٹخی اور غصے میں اندر جا کے کمرے سے پنکھا اٹھا لایا'' اس حرامی کی وجہ سے تاش نہیں کھیل سکتے، پنکھا تو چلا لیں۔ ہم کوئی دوزخی نہیں کہ'' جھڈوؤں '' کی طرح اس گرمی میں بیٹھے رہیں''

وہ غصے میں بڑ بڑ کرتا رہا۔ ڈاکٹر نے اپنے خاص فلسفیانہ انداز میں سوٹا لگا کر یوں دھواں نکالتے ہوئے، گویا کوئی جن برآمد کرنے والا ہو، بولا'' پر باوا، سوچنے والی بات یہ ہے کہ وہ گیا کیوں، اسے تو اتنی جلدی کبھی بھی نہ ہوتی تھی، بلکہ وہ جو تم نے ایک شاعر بتایا تھا جو ساری رات سڑکیں ناپتا رہتا تھا...... کیا نام......''

'' ناصر کاظمی یار''

'' ہاں وہی...... اسی کی طرح یہ بھی سب سے آخر پر گھر جایا کرتا ہے۔ تو پھر اب اسے کیا تکلیف ہوگئی ہے؟''

'' آہاں...... تم نے کہا تو مجھے یاد آیا کہ اُس شاعر کا ایک شعر بالکل اسی موضوع پر ہے، سمجھو کہ ناصر نے اسی موقع کے لیے یہ شعر کہا تھا

وہ میکدے کو جگانے والا، وہ رات کی نیندیں اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

جب میں نے شعر ان دونوں کو ذرا سا سمجھایا تو دونوں مچل اٹھے'' واہ، واہ'' اور کالو نے تو اپنے خاص انداز میں کہا'' لگتا ہے، ناصر نے یہ شعر اسی بھوسڑ کے لیے لکھا تھا''

'' پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ گیا کیوں؟'' ڈاکٹر کی چرخی ابھی تک اسی محور پہ گھوم رہی تھی۔

'' بتا کر نہیں گیا کہ پیو کے ڈر سے......؟ اب ہم پر یہ بھی ویلا آنا تھا کہ باپ کے ڈر سے تاش کھیلنا چھوڑ دیں'' کالو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کرسی کے ہتھے پر کبھی کبھی مکہ مار دیتا۔

'' ابا جب تک یہاں ہے......!اس کا کیا مطلب ہے؟ اِسے ابے کا اتنا خیال تھا کب، اور پھر اس کا ابا تو پچھلے چھ ماہ سے گھر آیا بیٹھا ہے۔ اب تو اُس کی چھٹی بھی ختم ہونے والی ہے۔ پہلے اِسے کبھی ابے کا خیال نہیں آیا۔ آج ابے کی اتنی دہشت کیوں؟''

'' ہوسکتا ہے کل تک اسے یقین ہی نہ ہو کہ یہی اس کا باپ ہے۔ اور آج ہی اماں نے اسے بتایا ہو کہ تم حلال کے جنے ہو'' کالو کا غصہ اسی طرح مستقل ہوا کرتا تھا'' اتنا بھی نہ سمجھا کہ ماں

جھوٹ بھی تو بول سکتی ہے''

''تم خواہ مخواہ ابل گئے ہو۔ بندے کی کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے''

''دفع کرو اس کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔ کنجر کو آئندہ یہاں گھسنے نہیں دینا۔ کہتا ہے، بس دس بجے تک ٹھہرا کروں گا۔ یہ کتے کا بچہ، احسان کرے گا ہم پر۔ جب ہم چوتھا سنگی ڈھونڈ لیں گے تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے تم جیسے شہدے کی۔ ہم ہر روز وکھرے وکھرے لوگوں سے کیوں......''

''پر مسئلہ تو یہی ہے نا کہ اسے ہوا کیا، باوا بھی تو نہیں بتا رہا، اسے تو کچھ پتا ہوگا کہ وہ آج جلدی کیوں چلا گیا''

''میں کیا بتاؤں یار، میں تو خود حیران ہوں کہ بیٹھے بیٹھے اس کے اندر ابے کی اندھی محبت کہاں سے آگھسی کہ وہ تاش کو چھوڑ کے چلا گیا''

''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کل تاش کے لیے چوتھا سنگی کسے بناؤں۔ میرا میسر بہت اچھا رنگ کھیل لیتا ہے، کوشش کروں گا کہ اسے گھیر لاؤں، وہ اس حرامی کی طرح بزدل نہیں ہوگا کہ دس بجے جا کر ابے کی بغل میں بیٹھ جائے''

☆☆☆

اب تو اچھے نے دس بجے گھر چلے جانا معمول بنا لیا تھا، کالو کو شک تھا کہ اچھا ڈیرے سے اٹھ کر سیدھا گھر نہیں جاتا بلکہ کسی اور جگہ رات رنگیلی کرتا ہے۔ عاشقی معشوقی میں یاروں کی یاد حرام زادی کب آتی ہے۔ لیکن ایک دن خود اچھے کی اماں نے کالو کے سامنے اچھے کی تعریف کی کہ پتا نہیں کیسے اسے عقل آگئی ہے، اب تو دس بجے ہی لوٹ آتا ہے۔ اس کا ابا بے چارہ جب سے آیا، کھپتا رہتا تھا کہ رات کو جلدی گھر آ جایا کرو مگر وہ انسان نہ بنا تھا، کبھی چار بجے تو کبھی پانچ بجے آ دیوار پھلانگتا۔ اگر وہ اس قدر گبھرو جوان نہ ہوتا تو اس کا ابا اس کو خوب پھینٹی لگاتا مگر ڈرتا ہے کہ جوان بیٹا ہے، کہیں جواباً اس پر ہاتھ نہ اٹھا دے۔ بس منہ سے کہتا رہتا ہے لیکن اس نے بھی مان کر نہ دی۔ پر پچھلے دس بارہ دن سے بڑا فرمانبردار بنا ہوا ہے۔ ابھی ہم سب جاگ رہے ہوتے ہیں کہ وہ لوٹ آتا ہے۔ اس کا ابا بھی اس سے بہت خوش ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم بھی اُس کے اِس نئے معمول کے عادی ہو گئے۔ وہ ڈیرے پر آتا، بمشکل آدھا گھنٹہ بیٹھتا اور واپس چل دیتا۔ ڈاکٹر نے ایک دو دفعہ اسے باز رکھنا چاہا تو وہ تھوڑا اُکھڑ گیا۔

"تم لوگ دیہاڑیاں لگاتے ہو ناں؟ کیوں لگاتے ہو؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟ گھر والوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے اور کیا"

"تم گھر والوں کے لیے دیہاڑی لگاتے ہو، اور میں گھر والوں کے لیے جلدی لوٹ جاتا ہوں۔ میں نے کبھی تم لوگوں کو دیہاڑی لگانے سے روکا؟ تو پھر تم مجھے کیوں روکتے ہو؟"

ڈاکٹر کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

ڈیرے پر اب تاش کم، گپیں زیادہ چلتیں۔ ہمیں چوتھا کھلاڑی نہ مل سکا، اسی لیے اچّھے کے اٹھنے تک رنگ کی دو بازیاں لگتیں، اور پھر چادر لپیٹ دی جاتی۔ ڈیرے پر رات دیر تک بیٹھنے کی عادت بنی ہوئی تھی، اسی عادت کو نبھانے کے لیے بیٹھے رہتے، ورنہ تاش کے بغیر کہاں مزہ آتا تھا۔ ڈاکٹر تو کہا کرتا تھا کہ جن دوستوں کے درمیان تاش بٹنا ختم ہو جائے، وہ خود بٹ جاتے ہیں۔ یہ تاش کے باون پتے ہیں جو دوستوں کو باندھ رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں نے اتنی مدت اکٹھے تاش کھیلی تھی کہ لگتا، تاش ہمارا پانچواں دوست ہے۔ تاش کے بغیر ہمیں مل بیٹھنا عذاب ہو جاتا تھا۔ آخر فارغ بیٹھ کر ایک دوسرے سے کیا بات کریں؟ تاش کے ساتھ تو عجب معاملہ تھا، ادھر پتے سب کے ہاتھ میں آئے اور ادھر دنیا بھر کے موضوع یاد آنے لگے۔ پتا پھینکا جا رہا ہے اور ہستی کے مسائل پر بحث ہو رہی ہے۔ تاش پھینٹی جا رہی ہے اور زمانے بھر کے فلسفے چھانٹے جا رہے ہیں۔ اب تاش کے بغیر ہم ایک دوسرے کی گفتگو سے بیزار ہونے لگے تھے۔ یوں جیسے محض دکھاوے کے لیے باتوں کی تسبیح رول رہے ہوں۔ کالو بیٹھا بے لطفی سے پتے پھینٹتا رہتا۔ بدمزگی اس کے ہر ہر روم سے عیاں ہوتی تھی۔ میں اور ڈاکٹر بھی اکتائے اکتائے سے بیٹھے رہتے۔ کئی بار ہم نے تین کھلاڑیوں والا رنگ کھیلنا شروع کیا مگر عادت نہ تھی، بدمزگی میں اضافہ ہی ہوا۔

☆☆☆

آخر ایک دن ڈیرے کی رونق پھر سے بحال ہو گئی۔ اچّھے کا ابا واپس بحرین چلا گیا اور اچّھا اس شب پھر رات دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ اب وہ پھر وہی پرانا اچّھا تھا، ڈیرہ پھر تاش کا ڈیرہ بن گیا۔ ڈاکٹر اور کالو دو بجے چلے جاتے اور میں اور اچّھا سیانوں کے پاس جا بیٹھتے۔ اس کا والز کنگ جلتا رہتا، باتوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ ایک دن پتا نہیں کس لہر میں رواں تھا کہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"تمھیں اندازہ ہے کہ پچھلا پورا مہینہ میں جلدی گھر کیوں جاتا رہا"

"نہیں۔ میں نے بہت سوچا مگر ذرا بھی اندازہ نہ کر سکا"

''بس یرا، یہ بھی ایک الگ ہی معاملہ تھا'' اس نے تھڑے پر ٹانگیں پھیلا لیں'' بات تو بتانے والی نہیں مگر تم سے اپنا اتنا پردہ بھی نہیں۔ اور میں خود چاہتا ہوں کہ کسی سے یہ ساری گل سانجھی کروں''

''تو پھر بتا دو۔ بجھارتیں کیا ڈال رہے ہو''

''بتاتا ہوں یرا...... پر نکتہ باریک ہے...... سمجھانے کے لیے شروع سے بات کرنی پڑے گی۔تم جانتے ہو کہ میرا ابا مارچ سے گھر آیا بیٹھا تھا۔تب سے وہ مجھے جھڑکتا رہتا تھا کہ میں جلدی گھر کیوں نہیں آتا۔ اسے بڑا دکھ ہوتا تھا، رات کو میرے گھر نہ ہونے سے۔ وہ کہتا تھا'' میں بحرین سے آیا ہوں کہ اپنے پتر دھیوں سے مل آؤں۔ چھ مہینے کی چھٹی لایا ہوں کہ اپنے اکلوتے پتر سے جی بھر کے باتیں کروں گا۔مگر اسے ذرا بھی غیرت نہیں آتی ،گھر ہوتے ہوئے بھی مجھے نظر نہیں آتا۔ساری رات کتے کی طرح لور لور کرتا رہتا ہے۔سارا دن مگرمچھ کی طرح سویا رہتا ہے۔کچھ کھانے کو مل گیا تو اونٹ کی طرح ہر چیز لپیٹ گیا۔نہیں تو بھینس کی طرح خاموش پڑا رہے گا۔اس میں انسانوں والی کوئی عادت ہی نہیں۔ باپ اتنی مدت بعد گھر آیا ہے،ذرا دیر کو اس کے پاس بھی بیٹھ، کچھ اس کی سن ، کچھ اپنی سنا۔مگر نواب صاحب گھر پر ٹھہریں تو ناں ۔لوگوں کی اولاد ایسی نیک ہے کہ ماں باپ کی اجازت کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھاتی،ایک مجھے یہ اللہ میاں کا تحفہ مل گیا ہے، پتا نہیں کب اسے باپ کا خیال آئے گا'' تو یہ تھا میرے باپ کا مسئلہ، وہ میرے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا اور آخر اس کی خواہش کیوں نہ ہوتی، ساری عمر اس نے بحرین مزدوری کرتے گزار دی، کس کی خاطر، میری خاطر ناں، اب وہ بس اتنا چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ دو گھڑی گپ شپ ہی کرلوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ میں بیٹے کی طرح اس سے ملوں......''

''یہ خیال اُس کی چھٹی کے آخر میں تمہیں کیسے آیا...... پہلے کیوں نہیں''

''نہیں تم پوری بات تو سنو۔ وہ تو چاہتا تھا کہ میں بیٹے کی طرح اس سے ملوں، اس کے پاس بیٹھا کروں لیکن مجھے اِس کی عادت ہی نہ تھی، وہ کب میرے سامنے باپ کی طرح رہا تھا۔ یہی چھ مہینے کی چھٹی وہ میرے بچپن میں کبھی آجاتا تو میرا ذہن اسی وقت اس کو اپنا باپ مان لیتا۔ جب وقت تھا تب اس نے مجھ سے باپ کا رشتہ نہیں بنایا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ میں اس کا بیٹا بن جاؤں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں اکثر سوچتا تھا...... ذرا ماچس تو دینا...... میں اکثر سوچتا تھا کہ جب مجھے اس کی ضرورت تھی ، وہ میرا نہیں بنا، تو اب اس کی ضرورت پوری کرنا کیا مجھ پر فرض ہے؟ نئیں یار، یہ

ولز کا سگریٹ بھی انتہائی گھٹیا ہوتا جا رہا ہے، جیسے تمبا کو کی جگہ بھوسا بھرا ہو، کوئی سواد ہی نہیں آتا''

''بس، تم جانتے ہو آج کل دو نمبر سگریٹ بہت ہو گئے ہیں''

''نہیں او یرا! جب سے یہ بجٹ میں ان پر ٹیکس زیادہ لگا ہے، تب سے ان کا معیار ہی نہیں رہا، ٹیکس لگاتے وقت بھی یہ کہاں خیال رکھتے ہیں غریبوں کا...... کالو بجٹ بنانے والوں کو گالیاں دیتا ہے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ یہ لوگ ہیں بھی......''

''سگریٹ اور کالو دونوں کی......''

''ہاں یرا، ...... ابا کہتا ہی رہا کہ رات کو جلدی گھر آجایا کرو یا دن کو دو گھڑی میرے پاس بیٹھ جایا کرو مگر میں نے بھی ایک طرح سے ضد ہی بنالی تھی کہ ابے کی نہیں سنی۔ جو میری مرضی ہو، وہی کروں گا۔ صورت حال یہاں پر تھی کہ وہ واقعہ پیش آگیا۔ ہوا یوں کہ اس رات ہم ڈیرے سے دو بجے اٹھے اور'' سیانوں'' کے پاس بیٹھے ہی نہیں، یوں میں معمول سے قبل گھر پہنچ گیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ حسب معمول میں نے بھی دیوار پھلانگی اور اندر۔ آج کل سب ہی گھر والے ویہڑے میں سوتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے کھڑا پنکھا ہمارے گھر ایک ہی ہے۔ سب سے پہلے پنکھے کے ساتھ میری چارپائی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بے بے اور بابے کی۔ پھر ابے کی، اس کے بعد چھوٹی بہنوں کی دو چارپائیاں اور آخر پر تقریباً دیوار کے ساتھ اماں کی چارپائی۔ اس رات چاند کی ۲۳ یا ۲۴ ہو گی۔ روشنی بہر حال اتنی تھی کہ صحن میں سوئے ہوئے سب لوگ نظر آتے تھے۔ میں دیوار پھلانگ کر اماں کی چارپائی کے قریب اترا۔ دیکھا تو اماں اپنی چارپائی پر نہ تھی۔ ادھر اُدھر دیکھا، گھر کے سبھی کمرے گھپ بند تھے۔ ادھر...... غسل خانے کی بھی بتی آف تھی۔ یہ اماں کہاں گئی۔؟ میں نے ذرا اونچی آواز دی'' اماں۔ اے اماں'' لیکن تھوڑی دیر بعد مجھ پر انکشاف ہو گیا کہ اماں ویہڑے میں ہونے کے باوجود بولنے جوگی نہیں ہے۔ میں تیز تیز قدم چلتا اپنی چارپائی تک پہنچا اور پنکھے کی طرف منہ اور ظاہر ہے کہ باقی چارپائیوں کی طرف پشت کر کے لیٹ گیا''

''تو اماں کہاں تھی......؟'' میں حیران ہو گیا'' اوہ ہ ہ...... ، کہیں......''

''ہوں۔ درست سمجھے۔ اب خود دیکھو، ایسے موقع پر میں کیا سوچتا؟...... صبح میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے رات کو کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اور وہ بھی ایسے ہی رہے، گویا رات کو کچھ ہوا ہی نہیں''

''تو پھر......؟''

"تو پھر یہی کہ میں نے تم لوگوں سے معذرت کر لی، اور جلدی گھر آنے لگا۔ اس رات میں سونے کی بجائے سوچتا ہی رہا۔ میں سمجھ گیا، ابا مجھے جلدی گھر آنے کو کیوں کہتا تھا۔ میرے گھر لوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، میرے آنے سے پہلے تک وہ گھبراتے ہوں گے کہ پتا نہیں کب اچھا دیوار پھلانگے اور ان کے سر پر آن پہنچ جائے۔ اس لیے میرا ابا مجھ سے کلپتا رہتا تھا کہ جلدی گھر آجایا کرو۔ میں جب اس نکتے پر پہنچ گیا تو میں نے جلدی گھر جانا، اور وقت پر سونا شروع کر دیا۔ اب یہ سوچ سوچ کر مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ آخری ایک مہینہ اماں کس طرح کھل کر اپنی چارپائی سے اتری ہوگی۔ ایک اور ہی نشے سے...... ابا بھی بحرین ہنستے بولتے سدھارا ہے"

وہ خاموش، دھواں پیتا رہا۔ میں اس کے سگریٹ پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ کافی وقت گزر گیا۔ اس کا سگریٹ بجھے بھی بڑی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "چلیں یار گھر، اب تو لگتا ہے، تیرے سگریٹ بھی ختم ہو گئے"

اس نے ولز کنگ کا نیا پیکٹ نکال، سیل کھولی، سگریٹ سلگایا اور دو چار سوٹے مارنے کے بعد بڑے اطمینان سے کہنے لگا "ابا اب بحرین پہنچ چکا ہے۔ اب گھر جا کے کیا کروں گا...... ہم تو بات کر رہے تھے کہ بجٹ کے بعد ولز کنگ بہت خراب ہو گیا ہے۔ پتا نہیں یہ ٹیکس کا سگریٹ کے سٹنڈر پر کیا اثر پڑتا ہے............؟"

محمد عباس

ساک دار

چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے جب ایک تپتی سہ پہر اسکول سے چھٹی کے بعد، میں اپنے گھر جانے کی بجائے اس کے ساتھ چل دیا۔ اس کی باتیں سن سن کر مجھے بہت چاؤ ہو گیا تھا اس کا گھر دیکھنے کا، اور خاص طور پر اس کی بے بے سے ملنے کا۔

گھر اس کا بہت کشادہ تھا، ہمارے اسکول سے بھی زیادہ۔ صحن میں لگے درختوں پر چڑھی گھیا توری اور کدو کی بیلوں سے چھاؤں خاصی گھنی ہو گئی تھی، اس لیے اس موسم میں بھی سبز سی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ بے بے ایک درخت کی چھاؤں میں منجی پر لیٹی ہاتھ سے پکھی جھل رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ وہ بوڑھی تو تھی لیکن عام بوڑھوں کی طرح تھکی ہاری نظر نہیں آتی تھی۔ وہ بے بے کے پاس گیا تو بے بے نے بڑے پیار سے اپنے پوتے کو دو تین بار چوما اور پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔ مجھ سے ابا اور دادا کا نام پوچھا اور جیسے پہچان کر اپنے بھوسلے ہونٹوں سے مجھے بھی ایک بڑی میٹھی سی پچّی دی۔

"تیری آنکھیں ہی بتا رہی ہیں کہ تُو کس کا بیٹا ہے۔ اتنی کھوجی آنکھیں میں نے صرف تیرے باپ کی دیکھی ہیں۔ پنڈے کی خوشبو بھی وہی" اس نے ایک لمبا سونگھا لے کر گویا اپنی یادداشت میں محفوظ خوشبو سے ملایا اور مجھے منجی کی باہی پر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ "رنگ بھی اپنے پیو پر ہے تیرا۔ صرف ناک سے ماں کی لشک آتی ہے...... پر اتنا تو ہوتا ہے۔"

"میرا ابا کہتا ہے کہ اماں کی ناک نے میری خوبصورتی کم کر دی ہے"

"ہاں ...... تمہارے باپ جیسا حسن تو بادشاہوں کے بیٹوں کا ہوتا ہے۔ تمہاری ماں تو بس ویسے ہی اس کے پلے بُجھ گئی تھی...... ورنہ اسے رشتوں کی کوئی کمی تھی؟ کہیں سے کوئی شہزادی لے آتا"

تھوڑی دیر ہم سب چپ رہے، گویا اس پہلے تعارف کو اپنے اندر اتار رہے ہوں۔ پھر اس نے جیسے بات چھیڑنے کے لیے کہا "تم اِس کے ساتھ پڑھتے ہو ناں......؟"

"جی بے بے"

"کیسا ہے یہ پڑھنے میں، زیادہ ڈنڈے تو نہیں کھاتا"

"نہیں بے بے، ہم دونوں بڑے لائق ہیں۔ کبھی ڈنڈے نہیں کھاتے۔"

"ہاں...... تیرا ابا بھی بڑا لائق تھا...... بس اس کا نصیبا کہ وہ پڑھ نہ سکا۔ ورنہ کہیں افسر لگا ہوتا۔ اب ڈنگروں کے ساتھ ڈنگروں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ تم کبھی پڑھائی نہ چھوڑنا۔ اِس سے تو میں کہتی رہتی ہوں، اتنا پڑھنا...... اتنا پڑھنا کہ لوگ نام لے لے کر فخر کیا کریں کہ ہمارے پتر نے پڑھا ہے۔ پر اس کا دھیان شرارتوں کی طرف ہی رہتا ہے۔ سارا دن چڑیوں اور طوطوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔"

"نہیں بے بے، ہمارے ماسٹر کہتے ہیں کہ اس سے لائق پورے اسکول میں کوئی نہیں ...... یہ ضرور سولہ جماعتیں پڑھے گا...... لفٹین بنے گا"

"میں جانتی ہوں، یہ جتنا لائق ہے......" بے بے نے لاڈ سے اس کے کان مروڑے "الو ہے الو۔ چل ...... جا، اٹھ کے گھڑے سے پانی لے آ، دوست کو ساتھ لے آیا ہے تو اب پیاسا مارے گا؟"

وہ اٹھ کے پانی لینے چلا گیا۔ بے بے بیٹھی مجھے پکھی جھلنے لگی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی لے آیا۔ پانی اچھا خاصا ٹھنڈا تھا۔ پسینہ تو بے بے کی پکھی سے سوکھ گیا تھا۔ اب اندر بھی ٹھنڈ پڑ گئی۔

بے بے نے پوچھ تاچھ ختم کر دی تھی اور اب گزرے وقت میں بہنے لگی۔

"پتر! تم بھی اس کی طرح میرے پوتے ہو۔ تم لوگ ہمارے ساک دار ہو۔" ہم دونوں پواندی بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے۔ دوپہر کی گونجیلی خاموشی میں اس کی پولی سی آواز بھی دگنی سنائی دے رہی تھی۔ "تیرے دادے کے گھر میری میسر بیاہی ہوئی ہے۔ تیرا باپ میں نے ان ہاتھوں سے اٹھا کر کھلایا ہے، اب وہ نہ مانے تو اور بات ہے ورنہ اسے اتنا لگاؤ تو اپنی ماں سے نہ تھا جتنا مجھ سے تھا۔ سارا سارا دن میرے کچھوڑ لگا رہتا تھا، اس کی ماں بھی اپنی جگہ خوش رہتی تھی کہ چلو پتر سنبھالنا تو نہیں پڑتا۔ میں اپنے گھر کے کام بھی کرتی اور ساتھ اسے بھی گھسیٹے پھرتی۔ اس کے باپ

نے کتنی دفعہ مجھے جھڑکا کہ اس مسٹنڈے کو اس کی ماں کے حوالے کرو اور خود اپنے گھر پہ دھیان دو، مگر مجھے اُس سے دُکھ ہونا کب گوارا تھا۔ وہ تو خیر جب سیانا ہوا تو اسے ماں کے ساک کی سمجھ آ گئی اور وہ میرے مونڈھے سے اتر گیا۔ جس طرح وہ میرا پتر تھا، اسی طرح تم میرے پوترے ہو۔ اگر وقت یوں زمانے کی گوڈی نہ کرتا تو تمہیں بھی انہی ہاتھوں میں کھلاتی اور تم دونوں میں ذرا فرق نہ کرتی ......'' وہ بولتی جا رہی تھی۔ اس کی پکھی نے ہمارے بدن تو سکھا دیے تھے، مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی آنکھیں اپنی ہی باتوں کی رڑک سے چھلک رہی تھیں۔

''تم دونوں منجی پر سیدھے ہو کر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے شربت بنا کر لاتی ہوں'' وہ مجھے ایک بار پھر چوم کر اٹھی اور اپنے تریڑوں بھرے پیر گھسیٹتی ہوئی رسوئی میں چلی گئی۔

''کیسی لگی میری بے بے؟'' آنکھوں میں چمک لیے اس نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

''بہت اچھی ہے۔ اتنی اچھی نہ تو میری دادی ہے نہ میری اماں''

''بابا جی کہتے ہیں، میری بے بے اس لیے اتنی اچھی ہے کیونکہ میری ماں جو نہیں رہی۔ اب ماں اور دادی دونوں کا پیار مجھے بے بے سے ملتا ہے۔ اگر میری ماں ہوتی تو شاید بے بے اور ماں شاید آپس میں لڑتی رہتیں...... اور مجھے کوئی نہ پوچھتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر میری ماں کے مرنے سے بے بے اتنی چنگی ہوئی ہے تو پھر اچھا ہی ہوا کہ وہ نہیں رہی''

''دُر بے غیرتا...... اس طرح نہیں کہتے۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے......؟ ابھی تو صرف بے بے کا پیار دیکھا ہے، ماں کا دیکھ لیتا تو پھر کہیں بھی نہ بچتا'' دادی نے چینی گھولتے گھولتے رسوئی سے آواز لگائی۔

''بے بے، میں تو بابے کی بات کر رہا تھا۔ آپ کو پتا ہے...... بابا میرے ساتھ کس طرح مخول کرتا ہے''

''ہاں ہاں بس کر، جانتی ہوں تجھے بھی اور تیرے بابے کو بھی''

بے بے جب شربت لے کر آئی تو اس وقت ہم کبوتروں کے ڈربے کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے بڑے شوق سے کبوتر پالے ہوئے تھے اور ان کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دو کبوتر نیولا کھا گیا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے وہ نیولا پکڑ لیا تھا اور اس کی دُم میں رسی باندھ کر پورے گاؤں میں پھراتا رہا تھا۔ اچھا خاصا تماشا کرنے کے بعد اسے ایک اونچے درخت پر الٹا لٹکا آیا تھا۔ جہاں وہ تین دن تک ٹنگا رہا تھا۔ ڈربے میں کوئی پندرہ بیس کبوتر

تھے اور پتا نہیں کس کس قسم کے۔ مجھے تو اب یاد نہیں ، البتہ وہ مجھے بتاتا رہا تھا۔ شاہ سرا، لنڈا، ہرا، تیترا..............

بے بے ہمیں کان سے پکڑ کر چارپائی تک لے آئی۔

"پہلے کچھ ٹھنڈا پی لو، پھر ان مستیوں میں پڑے رہنا۔ اسے تو شطانیوں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ پتا نہیں ان کلبوتروں میں کیا رکھا ہے۔ کسی دن میں اس کے ابے سے کہتی ہوں، ان سب کو حلال کر دے، تھوڑا منہ تو سلونا ہو گا۔"

ہم نے جلدی جلدی شربت پیا اور پھر کبوتروں کے پاس پہنچ گئے۔ گردن سکیڑے، اٹھلا اٹھلا کر چلتے ہوئے، غٹر غٹر کی آواز نکالتے کبوتر مجھے بہت اچھے لگے۔ میں نے ایک کبوتر کو اٹھا لیا اور بے بے کے پاس لے گیا۔ "بے بے دیکھ تو کتنا پیارا ہے۔ اسے ذبح کرنے کو دل کرتا ہے؟"

وہ ہنسنے لگی "جھلیا...... تو نے سچ مچ یہ سمجھ لیا ہے۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ مجھے پتا ہے کلبوتروں میں اس کی جان ہے۔"

ہم کافی دیر تک ان سے کھیلتے رہے۔ پھر وہ مجھے کھینچ کر ایک درخت تک لے گیا۔ اوپر ایک طوطا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر طوطا پکڑ لیا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے طوطے کے پاؤں میں رسی باندھ کے اسے درخت پر کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ "اس طرح اس کا دل نہیں گھبراتا، دوسرے طوطے بھی اس کے پاس آجاتے ہیں"

میں نے طوطے کی طرف دیکھ کے کہا "میاں مٹھو! چوری کھاؤ گے"

میاں مٹھو نے تو کوئی دھیان نہ دیا مگر وہ ہنسنے لگا۔ اور گھڑے پر بیٹھی بے بے کو پکار کر بولا "بے بے دیکھ اسے کچھ پتا ہی نہیں...... کاٹھے طوطے سے باتیں کر رہا ہے"

"ہاں ...... اس غریب کو کیا پتا۔ ایک تم ہی بڑے عالم فاضل ہو" اس نے برتن مانجھتے ہوئے دور سے جواب دیا۔

ایک ٹاہلی بہت گھنی تھی۔ اس نے مجھے اوپر چڑھنے کو کہا اور خود بندروں کی طرح وہ دور اوپر پہنچ گیا۔ میں بھی لٹکتا جھٹکتا اس کے پیچھے چڑھنے لگا۔ بے بے برتن وغیرہ دھو کر واپس منجی پر آ کر بیٹھ گئی۔ "چلو نیچے اتر آؤ۔ جب دھپ ڈھل جائے تو پھر چڑھنا۔ دوپہر کے وقت تو پتا نہیں رکھوں پر کون کون سی چیز ہوتی ہے۔ چلو۔ دونوں اترو۔ نیچے آ کے کھیل لو جو کھیلنا ہے...... میں تو اب کسے جوگی نہیں رہی ورنہ تمہیں ایسے ایسے کھیل سکھاتی کہ یاد کرتے"

ہم دونوں نیچے اتر آئے۔وہ بے بے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ بے بے نے اس کا کان پکڑ لیا ''ادھر آشطان کی ٹوٹی، ابھی تیری خبر لیتی ہوں۔'' بے بے نے اسے اچھی طرح قابو کر کے مجھے اشارہ کیا کہ اب اسے گدگدی کرو، میں نے اس کی بغلوں میں، پسلیوں میں، ہاتھوں پر، کانوں پر سب جگہ گدگدی کی۔ وہ گدگدی سے بے حال ہنستا رہا، میں اس کو گدگدا کر ہنستا رہا اور بے بے ہم دونوں کو دیکھ دیکھ اپنے پوپلے منہ سے ہنستی رہی۔ سب ہنستے رہے جیسے جگ میں اور کوئی کام ہی نہ ہو۔

بے بے ہمارے ساتھ خوب کھیلا کی اور اُس کی نسبت زیادہ لاڈ مجھ سے کیا۔کوشش کر کے مجھے جیتنے کا موقع دیتی رہی۔گو کہ وہ بوڑھی تھی مگر ابھی بھی اس کے اندر جوانی والی تھوڑی چھٹ باقی تھی۔ مجھے تو احساس تک نہ ہوا کہ وہ بوڑھی ہے۔

دھوپ دھیمی پڑ چکی تھی۔سائے لپٹتے جا رہے تھے۔دھوپ کو فرار ہوتے دیکھ کر بے بے نے ہم سے پوچھا ''کتنی دیر ہوگئی۔تمہیں بھوک تو لگی ہوگی؟'' ہمارے ہاں میں سر ہلانے پر بولی۔'' ٹھیک ہے، میں کچھ پکاتی ہوں...... تمہاری چاچی ہوتی تو میں تمہاری بڑی خاطر کرواتی، اب مجھ تری سے کچھ نہیں ہوگا۔صرف سکی روٹی ہی کھلا سکوں گی۔ میں جا کے آٹا گوندھتی ہوں، تم دونوں ٹاہلی پر چڑھ کر توریاں اتار لاؤ۔ پھر سب مل کر کھائیں گے''

بے بے رسوئی میں چلی گئی۔ اور ہم زیادہ سے زیادہ توریاں توڑنے کی شرط باندھ کر الگ الگ ٹاہلیوں پر چڑھ گئے۔ میرے والی ٹاہلی باہر گلی کے بہت قریب تھی۔توریاں توڑتے ہوئے جو گلی کے باہر دیکھا تو گلی میں ایک بابا کھڑا ٹک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔اس کے چہرے پر حیرت کلبلا رہی تھی۔ میں نے سختی سے پوچھا'' بابا کیا دیکھ رہے ہو''

بابا بڑبڑا گیا'' اوئے تم ڈیرے والوں کے پتر ہو ناں؟''

''جی۔کیوں تم نے میری حاضری بولنی ہے'' میں نے مسخری کی۔

'' اوئے پاگل، نیچے اتر۔ یہ تم کہاں آئے ہوئے ہو؟ تمہیں پتا ہے یہ کس کا گھر ہے؟''

'''کیوں، تمہیں کیا؟ میری مرضی، میں جہاں بھی جاؤں'' میں نے تھوڑا اکڑ کر پوچھا۔

بابا کچھ دیر بٹر بٹر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔

شرط اس نے جیتی۔وہ روزان درختوں پر کھیلتا ناچتا تھا۔میں ذرا شرمندہ نہ ہوا۔توریاں ہم نے بے بے کو دے دیں۔اس نے آٹا گوندھا۔ہم دونوں نے سبزی کاٹی۔ چولہے پر ہانڈی رکھ کر بے بے تھوڑی پر سکون ہوئی، پھر چارپائی پر ہمارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ

کھوئے ہوئے ہاتھوں سے پکھی بھی جھلتی رہی: "اس نمانڑے کے نصیبوں میں نہ تھا کہ ماں کی چھاؤں ملتی۔ اب میں بڈھی اس کی دال روٹی دھکدی رہتی ہوں۔ اس کے پیو سے کتنی دفعہ کہا کہ فیر ویاہ کرلے پر اس کے دل کو بات لگتی ہی نہیں، ادھر یہ نمانڑا اِکو ٹنڈ، نہ کوئی بھین نہ بھائی، سارا دن اکیلا جھلاّ ہوا پھرتا ہے۔ پیو دادا کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں، صبح جائیں تو شام کو گھر آتے ہیں۔ وہ بھی اتنے تھکے ہارے کہ پڑتے ہی سو گئے۔ اس سے کون باتیں کرے، کون اس کا دل بہلائے؟ میں اجڑی بڑی کوشش کرتی ہوں کہ اسے اکلاپے کا احساس نہ ہو لیکن ایک بندے سے تو خدا بھی نہیں بہلا تھا، بندہ کیسے بہل جائے۔ میں بھی پتا نہیں کب تک ہوں، اس کے بعد اس کا جانے کیا ہوگا؟ ہمارا گھر بھی گاؤں سے اتنا دور ہے...... یہ کوئی سنگی بیلی بھی نہیں بنا سکتا۔ اسکول جاتا ہے، دو گھڑی خوش رہتا ہے۔ تمہارا نام بہت لیا کرتا ہے۔ آج تم آگئے ہو تو دیکھو کس طرح کھلا ہوا ہے، ورنہ تو آتے ہی ویہڑے میں منجی ڈاہ کر سو رہتا ہے۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے، میں روز آجایا کروں گا"

بے بے کی گم صم سی جھلتی پکھی رک گئی جیسے گھومتی موٹر کا پٹا اتر گیا ہو۔ ایک دم اجنبی بن جانے والی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا اور پھر گویا اپنے اندر کسی فیصلے کی چوٹی پر قدم دھر کے پریم سے بولی "پتر میرے لیے تو تم اور یہ ایک جیسے ہو، پر ایک بات ضرور کہوں گی، اگر برا مانو تو پھر بھی کہوں گی، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے"

"ناں بے بے، تمہارا کہا کیوں برا ماننا ہے، تم کہو تو سہی"

"دیکھو میں تمہاری دادی کی میسر ہوں، تم میرے بھی پوترے ہو۔ مجھے تم کلبوتر کی طرح بھولے سے لگے ہو۔ تمہیں پیار سے کہوں گی کہ آج آگئے ہو تو ست بسم اللہ، پر...... آئندہ...... ہمارے گھر کبھی نہ آنا"

"وہ کیوں"

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں، بس تم مت آنا۔ اسی میں ہم سب کا بھلا ہے، اور ابھی بھی بس روٹی کھاؤ اور اپنے گھر کی طرف چل پڑو، تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ تم انہیں بتائے بغیر جو ادھر نکل آئے ہو"

"آپ کو کیسے پتا کہ میں گھر والوں کو بتا کر نہیں آیا"

"جھلیا اگر بتا کے آتا تو انہوں نے تجھے یہاں آنے دینا تھا......؟، اور ویسے بھی گاؤں کی

مسیت میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اعلان ہوا ہے کہ تم گم ہو گئے ہو۔ کسی نے دیکھا ہو تو بتا دے۔ میں تو بتانے نہیں جا سکتی، اسی لیے تمہیں کہتی ہوں کہ روٹی کھاتے ہی یہاں سے نکلنے کی کرو...... پتا نہیں کب اس کا بابا یا پیو گھر آ جائیں ......"

دھوپ کا سینک ہلکا پڑ جانے پر کبوتر اپنے ڈربے سے باہر نکل آئے تھے اور ادھر ادھر گھومنے لگے تھے۔ بے بے کھانا لانے چلی گئی اور ہم نے کبوتروں کو اٹھا لیا۔

تھوڑی دیر بعد روٹی آ گئی۔ ابھی ہم نے کھانی شروع کی تھی کہ دور سے شوریلی سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بے بے تھوڑی سی گھبرا گئی اور اس کے منہ سے فوراً نکلا "مولا خیر کرے"

ہم دونوں نے پوچھا "بے بے یہ شور کیسا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی رولا ہے۔ ہو گا کچھ نہیں۔ تم بے فکر ہو کے روٹی کھاؤ"

شور قریب آتا گیا اور ہم لوگوں کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر بے بے تن کے اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ بے بے نے یک دم دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ تھوڑی دور میرا ابا بہت سے لوگوں کے ہمراہ چلا آ رہا تھا۔ اکثر کے ہاتھ میں ڈنڈے اور لاٹھیاں تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ہجوم کا شور بڑھ گیا۔ بے بے نے دانی کو اپنے پیچھے کر لیا اور میری طرف اشارہ کر کے بولی "یہ ہے تمہارا پتر"

ابا دوڑ کر میری طرف آیا اور دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بھینچنے اور مٹھارنے لگا۔ اس کے منہ سے گرم سانسیں اور آنکھوں سے تتا پانی نکلتا جاتا تھا۔ پھر واپس پلٹتے وقت بے بے سے کہنے لگا" بے بے تیرا بھلا ہووے۔ مجھے پتا تھا اگر تیرے کول ہے تو اسے کچھ نہیں ہو گا"

بے بے نے کوئی جواب نہ دیا۔

ابا کافی دیر تک بے بے پر نظر جمائے کھڑا رہا۔ بے بے بھی مُنھے کی طرح کھڑی رہی۔ آخر ابے نے منہ پھیرا اور مجھے کندھوں پر اٹھا کر واپس ہو لیا۔ ہجوم بھی ہمارے پیچھے تھا، یہ سب میرے چاچے مامے تھے اور مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ لیتا، کوئی گالوں پر چٹکی لیتا گویا میرے زندہ ہونے کا یقین کر رہے ہوں۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے کسی قدر تھرتھلی کا احساس ہوا۔ کتنے ہی مرد عورتیں ہمیں ملے جنہوں نے یہ ضرور پوچھا "خیری آ گیا اے؟" اور پھر جواب سن کر خدا کا شکر کر کے دائیں بائیں ہو جاتے۔ ہماری گلی میں تو کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی، یوں لگتا تھا کہ گلی میں کسی کا مرن ہو گیا

ہے۔ مرد عورتیں ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ گلی میں پہنچتے ہی میری اماں سامنے آ گئی۔ بال بکھرے، چہرے پر پسینے سے زیادہ آنسوؤں کا نم، آتے ہی مجھ سے چمٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی، روئے جاتی اور ''میرا پتر...... آ گیا میرا پتر'' پکارتی جاتی۔ ابے نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود پا کر چھوڑ دیا اور خود مجھے لیے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ جانے کتنی خلقت کے نرغے سے نکل کر ہم اپنے گھر کے دروازے تک پہنچے۔ اتنے مرد، عورتیں میرے سر پر ہاتھ پھیر چکے تھے کہ مارے گھبراہٹ کے پورا جسم سانسوں میں سمٹ آیا۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو اور زیادہ ہجوم تھا۔ یا میرے اللہ اتنی عورتیں، لگتا تھا پورا گاؤں ہمارے گھر جمع ہو گیا ہے۔ اماں ابھی تک مجھ سے لپٹ لپٹ جا رہی تھیں۔ باقی بھی ہر عورت مجھے ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ ادھر میں خوف کی حد تک سہم گیا تھا۔ ابا مجھے بڑی اوکھت سے برآمدے تک لے کر گیا۔ برآمدے میں ایک چارپائی پر میری دادی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف خاصی عورتیں جمع تھیں اور ان میں سے کچھ اپنے دوپٹے کے پلو سے دادی کو ہوا دے رہی تھیں۔ دادی کو لاش کی طرح پڑے دیکھ کر میں رونے لگا، مگر ابے نے مجھے تھپکا اور تسلی دی کہ دادی مری نہیں بے ہوش ہے۔ تم آ گئے ہو تو دادی کی سب خیر ہے۔ اب اسے کچھ نہیں ہو گا...... جب ہوش میں آ کر تجھے دیکھے گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ کسی عورت نے لقمہ دیا 'بس جیسے ہی پتا چلا کہ تو ان کے گھر ہے تو وہیں بے ہوش ہو گئی۔'

ابے نے مجھے دلاسہ دیا اور لے جا کر کمرے میں ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اب باہر والا مجمع اندر جمع ہونے لگا تھا۔ ابے نے تنگ آ کر اونچی آواز میں سب سے کہا 'اب یہ واپس آ گیا ہے، آپ لوگ فکر نہ کریں، اب آپ کی ضرورت نہیں'۔ کمرے سے ہجوم کب کم ہوا اور میں کب سو گیا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔ صرف چھت کے پنکھے کی ہوا کا میٹھا سا احساس باقی رہ گیا جیسے بے بے سرہانے بیٹھی پکھی جھل رہی ہو۔

سیمین دانشور
فارسی سے ترجمہ: ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

جنت نظیر شہر

ہر رات سیاہ فام حبشی نژاد لڑکی، مہر انگیز دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر تھکی ہاری بچوں کے کمرے میں آ کر سو جاتی۔ پانچ بڑے بڑے دروازوں پر مشتمل اس وسیع و عریض خواب گاہ میں جوڑوں کی شکل میں بستر بچھائے گئے تھے۔ علی اور اس کی دونوں بہنیں سارا دن اس کمرے میں خوب دھما چوکڑی کرتے اور اپنے کھیل کود سے اسے گرد و غبار سے بھر دیتے — بالآخر رات ہوتے ہی دُھلے دُھلائے بستروں میں گھس جاتے۔ ان میں سے آخری اور سب سے خستہ حال بستر مہر انگیز کا تھا۔ علی کی بڑی بہن چراغ کی لو اُس وقت تک نیچے نہ کرتی جب تک یہ حبشی ملازمہ اندر نہ آ جاتی۔ مہر انگیز، رات کو اس پانچ دروازوں والے بڑے کمرے کے سامنے واقع باورچی خانے میں برتن دھویا کرتی تھی۔ علی برتنوں کے ٹکرانے اور مسلسل بہنے والے پانی کی 'شڑاپ شڑاپ' کی آوازیں سنتا رہتا۔ جیسے ہی مہر انگیز باورچی خانے کا چراغ گُل کرتی، علی خوشی سے نہال ہو جاتا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے بستر میں گٹھڑا ہو کر لیٹ جاتا اور چہرے کو بالوں سے ڈھانپ لیتا۔ مہر انگیز خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی چراغ کو پھونک مار کر بجھا دیتی اور اپنے بستر پر اس قدر آہستگی سے دراز ہوتی کہ اگر علی اس کا منتظر نہ ہوتا تو اُسے ہرگز اس کے آنے کی خبر نہ ہوتی۔ جیسے ہی مہر انگیز اپنے بستر پر دراز ہوتی علی اس کو آواز دیتا اور ضد کرتا کہ اس کے ساتھ لیٹ کر کہانی سنائے — ہر رات ایک ہی کہانی دُہرائی جاتی — مہر انگیز، اس کی ماں اور دوسری بہت سی حبشی غلام عورتوں کے واقعات پر مبنی کہانی:

مہر انگیز کی ماں بہت چھوٹی سی بچی تھی جب وہ سمندر کے کنارے اکیلی ننگ دھڑنگ سیاہ

فام بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ ایک موٹا اور بھدا اجنبی آدمی سر پر عربی رومال باندھے، اپنے اونٹ پر سے نیچے اترا اور اونچی آواز میں بچوں کو دھمکانے لگا کہ ''آؤ— میرے پاس آؤ!'' سب بچے ڈر کے مارے بھاگ گئے لیکن مہرانگیز کی ماں جو اُس وقت بے حد کم عمر تھی، اُس کے پچکارنے اور دھمکانے پر اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس اجنبی بد وضع شخص نے بادام اور شکر کی بنی ہوئی مٹھائی کے چند ٹکڑے اس بچی کی مٹھی میں تھمائے اور تیزی سے اسے اپنی بغل میں داب کر کجاوے کی طرف بھاگا۔ بچی رونے لگی اور کافی ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس آدمی کا اس کے مُنھ پر رکھا گیا ہاتھ سختی پکڑتا گیا— تنگ آکر مہرانگیز کی ماں نے اس کے ہاتھ کو کاٹ کھایا— ہاتھ مزید مضبوط ہوگیا— اس قدر کہ بچی کے مُنھ سے خون نکلنے لگا— وہ رونے لگی اور جس قدر روتی گئی، نڈھال ہوتی چلی گئی— پھر اُسے نیند آگئی — آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو ایک بحری جہاز میں پایا۔ یہاں اُسے نہ کہیں اپنی ماں دکھائی دیتی تھی اور نہ باپ! البتہ سیاہ رنگت والے بے شمار لوگ، عورتیں، مرد اور بچے خاصی تعداد میں موجود تھے— وہ پھر رونے لگی۔ آنسو، آنسو اور مسلسل آنسو! اسی دوران ایک حبشی عورت نے اس کے ہاتھ میں گہرے سُرخ رنگ کا سیب تھما دیا۔ مہرانگیز کی ماں نے بڑے بھولپن سے اُس سے پوچھا: ''کیا تم مجھے میری ماں کے پاس لے جاؤ گی؟'' سیاہ عورت یہ سنتے ہی اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر مارتے ہوئے واویلا کرنے لگی اور سر پر دو ہتڑ مارتے ہوئے مقامی زبان میں فریاد کناں ہوئی: ''ہائے یہ کیا ہوگیا! ہائے یہ کیا ہوگیا!'' یہ زبان مہرانگیز کی ماں کو آتی تھی البتہ مہرانگیز کا کہنا تھا کہ اُسے یہ زبان کبھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بعد ازاں علی کے بزرگوں نے اسے خرید لیا اور اس کا نام 'باجی دلنواز' رکھا گیا!

علی نے مہرانگیز کی زبانی یہ کہانی بارہا سُن رکھی تھی لیکن ہر بار اُسے نیا لطف محسوس ہوتا اور ہر رات مہرانگیز سے یہ وعدہ کرتا کہ اگر کبھی وہ موٹا بھدا آدمی اس کے سامنے آیا تو وہ اُسے باورچی خانے کی چُھری سے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا اور مہرانگیز کہتی: ''اچھا! اب سو جاؤ!'' — دوسری رات پھر یہی قصہ نئے انداز سے دہرایا جاتا:

''نورالصبا، نواب صاحب کی تمام حبشی ماماؤں میں ممتاز تھی۔ اول تو یہ کہ دلنواز اور مہرانگیز جیسی سیاہی اس کے چہرے پر نہ تھی۔ نہ ہی اُس کی ناک زیادہ موٹی تھی، بلکہ پتلی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی گول نہ تھیں، بادامی تھیں۔ اُس کے بال بھی گھنگھریالے نہیں تھے۔ وہ بالکل اُن دو سیاہ لڑکیوں کی مورتیوں جیسی تھی جو گھڑی کے ساتھ بیٹھک میں رکھی ہیں۔ نہ کہ میری طرح اماں کی

جان! کہ ابرو تک نہیں ہیں۔ آنکھیں بھی مٹر کے دانوں کی طرح، ناک بھی دکان کے سامنے ڈالی جانے والی چٹائی کی طرح سیدھی اور چپٹی اور ہونٹ بھی کالے شہتوت کی طرح لٹکے ہوئے — اماں کی جان! میں ابھی تمہارے ابا کے گھر میں پل بڑھ رہی تھی کہ ایک دن وہ نواب صاحب کے گھر سے بڑے مالک کے گھر آ گئی۔ وہ بیگمات کو نواب صاحب کی آخری رسومات کی دعوت دینے آئی تھی۔ اُس وقت نواب صاحب کو سفارت خانے میں گولی مار دی گئی تھی۔ اُس کا قد اتنا لمبا تھا کہ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنا سر ہلکا سا نیچے جھکا لیا تھا۔ اُس نے بیگم صاحبہ کے کندھے پر بھی بوسہ نہ دیا اور محض رسمی انداز میں سلام و دعا کے بعد کالے رنگ کے ایک ریشمی رومال کے نیچے سے خوشبودار بھنی ہوئی کافی سے بھری ہوئی طشتری نکالی اور بڑی بیگم صاحبہ کے سامنے رکھ دی...

اس کے بعد پورے شیراز میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ آخر وہ کون تھی؟ اور کس کام سے آئی تھی؟ ماما کی جان! ایک دن تین نئے برق رفتار تانگے نواب صاحب کے گھر کے سامنے آ کر رُکے اور ایک آدمی جو کوٹ پتلون اور ہیٹ پہنے ہوئے تھا، پہلے تانگے میں سے باہر نکلا۔ پھر اس کے پیچھے بہت سے دوسرے آدمی نیچے اُترے جو سب کے سب اسی طرح بولگائے، ٹائیاں باندھے اور ہیٹ پہنے ہوئے تھے اور سب سے آخر میں ایک بوڑھا شخص نیچے اُترا جس کے ہاتھ میں سُرخ مخمل میں لپٹا ہوا ایک صندوق تھا۔ یہ سب، ماں کی جان! نورالصبا شہر کے وزیر تھے۔ انہوں نے نواب صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر داخل ہوئے۔ بیگم صاحبہ نے کسی کو نورالصبا کو بلانے کے لیے بھیجا۔ جب نورالصبا آئی تو سب آداب بجا لائے۔ ہاں وہ سب تو بار بار آداب بجا لاتے تھے۔ ماما کی جان! اس صندوقچے کے اندر بنارسی کپڑے اور زیورات تھے۔ انہوں نے نورالصبا کو پہننے کے لیے دیے۔ جب وہ سب جانے کے لیے مُڑے تو نورالصبا کے تانگے میں سوار ہونے سے قبل دوبرہ سب کورنش بجا لائے۔ وہ سب اس طرح تعظیماً جھک گئے تھے کہ اُن کے سر اُن کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے... ظاہر ہے کہ اب وہ اُن کے شہر کی ملکہ بن چکی تھی۔ اور پیارے! اُس وقت سے سب حبشی ماماؤں کی یہی آرزو رہی ہے کہ اسی طرح کچھ لوگ آئیں اور اُنہیں ساتھ لے جائیں —"

اور علی کہہ رہا تھا: "شاید تمہارے پیچھے بھی وہ لوگ آ جائیں۔ آیا جی! اگر وہ آ گئے تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔"

اور مہرانگیز نے جواب دیا: "اچھا اب سو جاؤ تا کہ صبح جلدی اُٹھ جائیں۔

علی کی ماں بتایا کرتی تھی کہ باجی دلنواز کی دوسری تمام خادماؤں کے مقابلے میں اس خاندان کے ساتھ خاصی زیادہ قرابت تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسے مکہ کے سفر پر بھی لے گئے تھے۔ البتہ اس سفر کے بعد اُس کا دماغ اُلٹ گیا تھا— اُس نے اس خاندان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ مہرانگیز بھی مالک کے بیٹوں اور بیٹیوں کی ہم جولی تھی — البتہ اس کو اس بات کا بہت غم تھا کہ اس نے مہرانگیز کو اپنے شوہر کے کام کرنے پر بھی لگا رہا تھا۔ وہ شکوہ کرتی: ''بھلا کوئی اپنی کنیز کو تو کام پر نہیں لگا سکتا۔ وہ تو صرف خزانچی ہوتی ہے۔ مگر وہ خزانہ ہے کہاں کہ مہرانگیز اس کی خزانچی بنے؟''

علی کو یہ واقعہ بہت اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب ایک روز باجی دلنواز پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کسی شکست خوردہ درخت کے مانند، لاٹھی ٹیکتی ہوئی ان کے گھر آئی تھی۔ اس وقت علی کی ماں حوض کے کنارے بیٹھی وضو کر رہی تھی۔ پاؤں کا مسح کرتے ہوئے، اُس نے وہیں سے آواز دی: ''مہرانگیز، اِدھر آ، تیری ماں آئی ہے—'' مہرانگیز باورچی خانے سے پھلانگتی ہوئی آئی اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اس کے بعد علی کی ماں نماز کے لیے کھڑی ہوگئی، علی اور اس کی دونوں بہنیں بیٹھک میں جمع ہوگئے۔ بچے خلافِ معمول خاموش تھے اور دوزانو بیٹھے باجی دلنواز اور مہرانگیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ باجی دلنواز کمرے کی دہلیز میں بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ اس کے مالکوں نے بڑھاپے میں اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں وہ سر چھپا سکے۔ یہ سنتے ہی علی اور اس کی چھوٹی بہن رونے لگے۔ تاہم بڑی بہن نے کہا: ''بچو! آؤ چلو کھیلتے ہیں!'' علی کی چھوٹی بہن اندر جا کر اپنا پرانا کوٹ لائی اور باجی دلنواز کو دے دیا۔ علی کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ بھی گیا اور جتنی کشمش اس نے چھپا کر رکھی تھی، ساری دلنواز کی جھولی میں ڈال دی۔ ماں اُسی طرح نماز میں مشغول تھی لیکن کبھی کبھی اس کی آواز بلند ہو جاتی۔ تمام تر بچپنے کے باوجود علی کو معلوم تھا کہ ان سب باتوں کی وجہ سے انہیں ڈانٹ ضرور پڑے گی۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی ماں نے جان بوجھ کر نماز لمبی کر دی ہے اور قنوت کو تو اس قدر طول دے دیا کہ علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جیسے ہی ماں نے آخری بار تین مرتبہ جھکایا، اُس نے سکھ کا سانس لیا۔ دلنواز اس کے پاس گئی اور پیار سے اس کے کندھوں کو دبانے لگی۔ اس کی زبان ہکلانے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی کہانی آغاز سے سنائے، وہ بولی: ''آج اگر مالک زندہ ہوتے تو میں بے گھر نہ

ہوتی!'' علی کی ماں نے کہا: ''میں نے سب کچھ سُن لیا ہے... بس ... بس کرو!'' دلنواز بولی: ''بی بی! مجھے اجازت دیں کہ آج رات کوئلوں کے گودام میں پڑ رہوں!'' ماں نے جواب دیا: ''یہ تو نہیں ہوسکتا، ہم اب کتنوں کو کھلائیں؟ ابھی مہرانگیز ہی کافی ہے۔'' دل نواز نے کہا: ''ٹھیک ہے، پھر اب میں بھیک مانگنے پر مجبور ہوں، میں بے بس ہوچکی ہوں!'' علی کی ماں نے کہا: ''مجھے کیا کہتی ہے، چل اب اٹھ یہاں سے...'' علی اور اس کی ننھی بہن رونے لگے اور ماں سے التجا کی کہ دل نواز کی کفالت کریں۔ ماں غصیلی نظروں سے دونوں کو گھورنے لگی۔

اس کے بعد انہوں نے صحن کی طرف سے دلنواز کے لاٹھی ٹیکنے کی آواز سنی۔ بیٹھک قدرے بالائی حصے میں تھی اور علی چھجے پر بیٹھا بڑبڑاتا ہوا ماں سے درخواست کر رہا تھا کہ اس کے لیے کچھ کریں۔ ماں نے تنگ آ کر کہا: ''بچے اب اٹھ کھڑا ہو۔'' اس کے بعد وہیں سے چیخ کر بولی: ''دلنواز جاؤ، منور خانم کے گھر چلی جاؤ۔ ہمارا کیا قصور ہے کہ ہم بڑی بہن ہیں؟''

علی وہاں سے اُٹھ کر باورچی خانے میں مہرانگیز کے پاس چلا گیا۔ مہرانگیز چولہے کے نیچے ایندھن کی لکڑیاں سُلگا رہی تھی۔ علی اس کے قریب آ بیٹھا۔ مہرانگیز مسلسل رو رہی تھی اور اس کے آنسو ٹھوڑی سے ہوتے ہوئے اس کی گردن پر گر رہے تھے۔ علی بولا: ''آپا جی! مت رو اگر میری خالہ نے اس کی کفالت نہ کی تو میں خود کروں گا۔ میں بھی بڑا ہوگیا ہوں...'' مہرانگیز نے کہا: ''میں رو تو نہیں رہی ہوں، دھواں میری آنکھوں میں جا رہا ہے۔'' علی نے پوچھا: ''کون سا دھواں؟'' مہرانگیز نے ناک پونچھتے ہوئے کہا: ''مالکن کو مت بتانا کہ میں رو رہی تھی۔''

....

ایک مہینہ گزر گیا یا شاید ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن شام کے وقت منور خانم کا میاں مہرانگیز کو پوچھنے کے لیے آیا۔ مہرانگیز حمام کی طرف گئی تھی۔ منور خانم کا شوہر علی کی ماں کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ ماں جواب میں مسلسل سر ہلا رہی تھی۔ پھر کہنے لگی: ''لا الہ الا اللہ'' ہائے، میں مر جاؤں میری بہن! تجھ پر کیا اُفتاد آن پڑی!'' اس کے بعد ماں کھڑی ہوگئی اور بولی: ''علی بھاگ کے جاؤ، مہرانگیز سے کہو کہ وہ حمام سے جلدی لوٹ آئے۔ علی فوراً جوتے پہن کر بھاگا۔ اُس نے سُنا کہ ماں منور خانم کے شوہر سے کہہ رہی تھی: ''آپ اسے ساتھ ہی لے جایئے۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ وہ یہاں رہ کر واویلا کرتی رہے—''

علی اور اس کا خالو غسل خانے کے ناٹے کے پیچھے کھڑے تھے۔ خالو نے حمام پر کھڑی

دیہاتی عورت کو اپنے پاس بلایا اور اُسے کچھ کہا۔ وہ عورت گئی اور علی اور اس کی خالہ کا شوہر وہیں کھڑے رہے۔ علی نے مہر انگیز کی آواز سنی جو کہہ رہی تھی: ''چین سے بیٹھو۔ اپنا سر تو دھو مرلوں۔ ابھی آتی ہوں — '' دروازے پر کھڑی دیہاتی عورت بولی: ''نہیں رک سکتی، ضروری کام ہے، جلدی کر۔''

اور پھر مہر انگیز کی آواز دوبارہ سنائی دی: ''کیا میرے لیے کوئی رشتہ لائی ہے گنوار عورت؟''
اور پھر ایک تنک آواز سنائی دی: ''اُدھر تیری ماں کی جان نکل رہی ہے اور تو یہاں ماتھے پر بل ڈال رہی ہے؟''

اور اس کے بعد ایسی نالہ وزاری ہوئی کہ علی بھی رو پڑا۔ وہ تینوں روانہ ہوئے اور راستے میں مہر انگیز دو تین بار گرتے گرتے بچی۔ بہر حال وہ منور خانم کے گھر پہنچ گئے۔

منور خانم نے شوہر سے پوچھا: ''بچے کو جو ساتھ لے آئے ہو، یہ کیا کرے گا؟''

— یہ خود آیا ہے —

اس کے بعد خالہ نے چلا کر کہا: ''نیر آؤ، علی بیٹا آیا ہے۔'' اور پھر میاں کی طرف دیکھ کر کہنے لگی: ''خدا اسے بخشے! بُرے وقت مری ہے۔ غروبِ آفتاب قریب ہے۔''

نیر اور علی کھیل میں مشغول ہو گئے۔ نیر نے کہا: ''آؤ علی! کوئی مرنے والا کھیل کھیلتے ہیں!''

علی نے پوچھا: ''باجی دلنواز مر گئی ہے؟''

نیر بولی: ''ہاں! افسوس! — اچھا آؤ اب اُسے نہلانے کے لیے لے گئے ہوں گے۔''

....

دلنواز کے چہلم کے دن علی اور مہر انگیز دونوں قبرستان گئے۔ وہ کافی دیر اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور پوچھ پڑتال کے بعد انہیں دلنواز کی قبر مل ہی گئی۔ یہ کچی قبر تھی البتہ اس کے اوپر ایک پکی اینٹ نشانی کے طور پر رکھ دی گئی تھی۔ مہر انگیز مٹی کی اس ڈھیری پر جھک گئی اور اس قدر روئی کہ علی سہم گیا۔

اُس رات علی کو شدت کے ساتھ مہر انگیز کا انتظار تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا مہر انگیز جلدی سے باورچی خانے کا چراغ بجھائے اور آ کر اُسے کہانی سنائے کہ اب اس کے قصوں میں ایک نئے قصے کا اضافہ ہو چکا تھا! اُس کی ماں کی موت کی کہانی۔ لیکن مہر انگیز آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اب علی کو پریشانی ہونے لگی۔ اُس کی نیند اڑ چکی تھی۔ آخر کار جب کافی وقت گزر گیا تو اُسے

مہرانگیز کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی— اور پھر اس کے بعد اس کے باپ کا سایہ کمرے کے سامنے سے گزرا۔

صبح دن چڑھتے ہی یہ خبر پھیل گئی کہ علی کے والد کی عینک کہیں گم ہوگئی ہے۔ ہر جگہ اسے تلاش کیا گیا یہاں تک کہ بچے بھی اس کام میں مشغول ہوئے۔ لیکن اس کی ماں قیاس تو ایک طرف اسے ڈھونڈنے میں بالکل بھی مداخلت نہیں کر رہی تھی بلکہ زیر لب طنز آمیز ہنسی ہنس رہی تھی۔ علی کو اس کا یہ طنزیہ انداز بالکل اچھا نہ لگا۔ علی ماں کی جائے نماز کی طرف بڑھا کہ شاید اُسے عینک وہاں مل جائے لیکن ابھی اس نے متبرک شے کو الٹ پلٹ کر دیکھا بھی نہ تھا کہ ماں نے اُسے پکڑ کر کمرے کے بیچ میں دھکیلا اور پھر غصے سے علی کو ڈانٹ کر کہنے لگی: ''ناپاک کرتا ہے۔'' بالآخر والد کو بغیر عینک کے کام پر جانا پڑا اور اس کے بعد سے وہ ہر رات عینک لگا کر ہی سوتے۔ ابھی علی اسکول نہیں جاتا تھا البتہ اس کی دونوں بہنیں پڑھنا شروع کر چکی تھیں۔ مہرانگیز بچوں کو اسکول لے جاتی اور واپس لاتی تھی۔ علی کی ماں باورچی خانے میں تھی۔ علی پنج دری کمرے کی دہلیز پر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی مہرانگیز باورچی خانے میں داخل ہوئی علی کی ماں نے ایندھن کی جلتی لکڑی اس کے سر پر دے ماری۔ علی کمرے سے بھاگا اور باغیچے سے ہوتا ہوا باورچی خانے میں پہنچا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ ماں کا ہاتھ روکے۔ وہ رو بھی رہا تھا۔ لیکن ماں طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ مہرانگیز کا سر پھٹ چکا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ علی نے روتے ہوئے کہا: ''مت ماریے مجھے خوف آتا ہے۔ میں ڈر رہا ہوں۔'' لیکن مہرانگیز بالکل نہیں رو رہی تھی۔ ماں بولی: ''کلموہی نظر نہیں آتا خون نکل رہا ہے؟'' اس کے بعد مہرانگیز حوض کے کنارے بیٹھ گئی اور اپنے سر کو پانی سے دھونے لگی۔ لیکن خون بند ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور علی کو مہرانگیز کے نہ رونے پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ماں نے حوض کے قریب پڑے حقّے کو اُٹھایا اور جلا ہوا تمباکو زخم میں گرا دیا، پھر کہنے لگی: ''آخر کار تو فاحشہ ہی نکلی۔'' علی نے پوچھا: ''فاحشہ کیا؟'' ماں نے جواب دیا: ''میں دائی کو لاتی ہوں'' علی پھر بولا: ''دائی کیا؟'' — اور اُس وقت مہرانگیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

....

گرمیوں کا بُرا پہلو یہ تھا کہ علی اور مہرانگیز میں جدائی آ پڑتی۔ اس موسم میں حوض کے قریب ایک تخت بچھا دیا جاتا اور سب بچوں کو یہیں سُلاتے۔ مہرانگیز باغیچے کے درمیان زمین ہی پر پڑ جاتی۔

ایک دن غروبِ آفتاب کے قریب منور خانم اور اس کی بیٹی نیر، علی کے گھر آئیں۔ منور خانم، ماں کے ساتھ تخت ہی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ حقّہ پی رہی تھی اور آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی تھی۔ ساتھ ہی روتی بھی جاتی تھی اور مسلسل بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی لمبی چادر کے کونے سے صاف کرتی جا رہی تھی۔ بچے زینے کے اوپر جو بیٹھک کی دہلیز سے متصل تھا، ''قلعہ گیری'' کھیلنے میں مشغول تھے — نیر اور علی ایک طرف تھے اور باقی سب دوسری طرف۔ ایک بار یوں ہوا کہ علی اور نیر نے 'قلعے' کو پوری قوت کے ساتھ پکڑ لیا اور ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے۔ علی کی ماں جس کے کان تو بہن کے دُکھڑوں کی طرف متوجہ تھے لیکن نظریں مسلسل بچوں کے کھیل کی جانب تھیں، وہیں سے علی کو ڈانٹنے لگی: ''بیٹے! شرم کرو!'' منور خانم نے حقّے کو ایک طرف رکھ دیا اور کہنے لگی: ''کیا برائی ہے بہن؟ ایسا مت کہو، کیوں نہ ان دونوں کو ایک کر دیں؟'' ماں نے جواب دیا: ''دیکھیں جو قسمت میں ہو۔''

منور خانم اور اس کی بیٹی اُس رات اُن کے گھر میں ہی ٹھہریں اور تخت پر علی کے باپ کی جگہ پر سو گئیں۔ کافی کھینچ تان کے بعد مہر انگیز نے دھلے ہوئے برتنوں کو ہمیشہ کی طرح باورچی خانے کے تخت پر جمع کرنے کے بجائے، وہیں اوپر مچان پر رکھ دیا۔ تخت کو باورچی خانے سے باہر نکالا گیا اور 'مالک' کا بستر اس پر بچھا دیا گیا۔ علی کی ماں کی ضد تھی کہ اُس رات مہر انگیز کمرے میں سو جائے۔ تاہم منور خانم نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا: ''کہیں بچی گرمی سے مر نہ جائے۔'' اس کی بات مان لی گئی۔

چاندنی رات تھی اور چاند کی تیز روشنی نے علی کی آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی اور پھر جوں ہی اُسے تھوڑی سی نیند آئی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صبح اُس کی خالہ زاد کے سامنے اُس کا گیلا دھوپ میں پھیلایا جائے۔ عام طور پر اس کی ماں روزانہ یہ فریضہ ڈانٹ پھٹکار اور بھرپور شور شرابے کے ساتھ علی الاعلان انجام دیتی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ ماں سو رہی تھی اور منور خانم خراٹے لے رہی تھی۔ اچانک علی نے مہر انگیز کی سرگوشیوں کی آواز محسوس کی۔ وہ جوش میں آ گیا اور اُسے آواز دی: ''آیا — آیا جی!'' اور اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس طرف نظر دوڑائی جہاں اس کا بستر بچھا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے باپ کا لحاف پھولا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے وہ بھیانک عفریت یاد آ گیا جس کے متعلق اُس نے مہر انگیز سے سُنا تھا کہ وہ سینے پر دباؤ ڈالتا ہے اور اب وہ منتظر تھا کہ اس کا باپ اُس بھوت کی لکڑی کی ناک پکڑ کر اُسے قسم دے گا اور خزانوں کی جگہ

کی بابت اس سے دریافت کرے گا۔ لیکن وہ اس کی ناک کو نہ دیکھ سکا۔ بھوت بل رہا تھا اور بستر میں مسلسل ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ علی خوف زدہ تھا اور شدت سے اس بات کا منتظر تھا کہ اس کا باپ اس بھوت پر قابو پانے میں کامیاب ہوجائے۔ آخر کار لحاف ہموار ہوگیا۔ بھوت کھڑا ہوچکا تھا۔ علی چیخا۔ ''اس کی ناک پکڑو۔'' اور ماں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: ''سو جاؤ!'' — اور علی نے بستر گیلا کردیا۔

صبح پھر انگیٹھی تھی اور مہر انگیز کا پھٹا ہوا سر — اور علی کا گیلا گدا دھوپ میں سامنے دیوار پر نشیبی صورت میں لٹکا دیا گیا تھا۔ مہر انگیز نے اُسے اُداسی سے دیکھا اور کہنے لگی: ''تمہیں یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

....

منور خانم اور نیر کچھ روز ان کے گھر ٹھہریں۔ پھر علی کا خالو ان کے گھر انہیں لینے آ گیا۔ منور خانم بیٹھک کے دروازے کے پیچھے کافی دیر کھڑی رہی۔ پھر باہر آئی اور رونے لگی اور بعد میں سب چلے گئے۔ جاتے ہوئے علی کی ماں نے اونچی آواز میں کہا: ''بہن! بھول نہ جانا، اُسے ضرور بھیج دینا۔''

چند دنوں بعد ایک ہٹی کٹی عورت جس کے بال سُرخ رنگ کے تھے اور ہاتھ پاؤں پر بھی اُس نے مہندی لگا رکھی تھی، ان کے گھر آئی۔ علی کی ماں اس کے سامنے کھڑی تھی اور اسے بڑی اہمیت دے رہی تھی۔ اُس نے مہر انگیز کو کافی آوازیں دیں کہ شربت لے کر آئے لیکن مہر انگیز نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں نے علی کو بھیجا کہ جاؤ مہر انگیز کو بلالاؤ۔ مہر انگیز باورچی خانے کے تخت پر سر نیہوڑائے بیٹھی تھی اور بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ علی نے پوچھا: ''کیا ہوا ہے؟ سردی لگ رہی ہے؟ چلو دھوپ میں!'' لیکن مہر انگیز جواب میں خاموش رہی۔ بالآخر وہ موٹی عورت باورچی خانے میں آئی۔ وہ اپنے ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے بولی: ''آتی ہے یا میں آجاؤں؟'' پھر مہر انگیز کو کھینچ تان کر بیٹھک میں لے گئی اور اندر سے کنڈی لگا لی۔ علی اور اس کی بہنیں دروازے کے پیچھے کھڑے تھے۔ بڑی بہن نے آہستہ سے چھوٹی کے کان میں کچھ کہا اور دونوں بے اختیار ہنس پڑیں۔

بعد میں مہر انگیز کی چیخ و پکار کمرے سے سنائی دیتی رہی۔ علی رونے لگا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میری انا! میری پیاری انا!''

....

ابھی علی ہائی اسکول کے پہلے سال کے امتحان کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس کا باپ بستر سے

لگ گیا۔ اس کے والد کی بہت سی خواہشات تھیں جو ادھوری رہ گئیں۔ حتیٰ کہ وہ گھر میں بجلی بھی نہ لگوا سکے۔ اس صورت میں کہ منور خانم کے گھر میں بجلی آ چکی تھی۔ جن دنوں اس کے والد کی بیماری شدت اختیار کر چکی تھی، علی کی چھوٹی بہن کے لیے ایک رشتہ بھی آیا تھا۔ جب کہ انہوں نے بڑی بیٹی کے آنے والے رشتے کو قبول نہ کیا تھا۔

فزکس کے امتحان کی تیاری کی رات علی چیزوں کے وزن کے حوالے سے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مہرانگیز گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور سانس اُکھڑا ہوا تھا۔ وہ خاصی تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ علی نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

مہرانگیز کہنے لگی: ''چھوٹے مالک! میں نے ایک اُلو کو دور سے دیکھا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اُلو کو ہر چیز کا پتا ہوتا ہے۔ پیغمبر پرندہ ہے۔'' علی نے پوچھا: ''تمہیں کس چیز کا ڈر ہے؟''

—بڑے مالک—

علی نے کہا: ''اچھا، اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

مہرانگیز نے جواب دیا: ''چھوٹے مالک! ہمیں چاہیے کہ ہم اوپر جا کر دیکھیں کہ یہ کس قسم کا ہے؟''

علی اور مہرانگیز سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے۔ مہرانگیز نے ہاتھ میں ایک سینی اُٹھائی ہوئی تھی جس میں قرآن، سبز پتے، روٹی اور نمک رکھا گیا تھا۔ وہ چھت پر ہولے ہولے چلتی ہوئی اُلو کے قریب آ گئی اور اس کے عقب میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے قرآن ہاتھ میں لیا اور آہستہ آواز میں گنگنانے لگی: ''تیرے سامنے قرآن ہے، تیرے سامنے نمک ہے...'' علی کو ہنسی آ گئی۔ اُلو نے کسی پنکھے کی طرح پر پھڑپھڑائے اور اُڑ گیا۔ مہرانگیر بہت خوش تھی، کہنے لگی: ''وہ چلا گیا— چلا گیا اپنے ویرانے کی طرف— یہ گھر نہیں بناتا، خرابوں ہی میں زندگی گزارتا ہے۔ ہمارے سر سے بلا ٹل گئی۔''

ایک ہفتے کے بعد علی کے باپ کا انتقال ہو گیا اور علی امتحان نہ دے سکا اور اگلے سال بھی وہ اسکول نہ گیا کہ اب وہ اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ اُسی دفتر میں جہاں علی کا باپ حساب دار تھا، علی کو ملازمت مل گئی۔ اپنی ملازمت کے پہلے دن علی نے مہرانگیز اور اپنی بہنوں کے سامنے دفتر کو ایک افسر کے انداز میں کھولا۔ اپنی لاٹھی زمین پر رکھی، تھوک پھینکا اور میز کے دراز کو چابی سے کھولا۔ اُس میں سے صرف ایک بڑی ماچس کی ڈبیا، چائے اور کچھ دانے چینی نکلی۔ علی کی بہنیں اور مہرانگیز ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئیں لیکن ماں نے بچوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''مت ہنسو، ابھی تو

تمہارے بابا کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔''

مہرانگیز 'کفن' اور 'بابا' کے الفاظ سنتے ہی باورچی خانے میں چلی گئی اور رونے لگی۔ علی کی ماں نے چلا کر کہا: ''مہرانگیز! اپنا بوریا بدھنا سمیٹو اور اب اس گھر سے رخصت ہو جاؤ — اب میں اتنوں کو نہیں کھلا سکتی۔'' یہ سننا تھا کہ مہرانگیز کا رونا شدت پکڑ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے سر کو پیٹ رہی تھی اور غم سے اپنے بال نوچ رہی تھی۔ علی نے اُسے سہارا دیا اور حوض کی طرف لے گیا اور کہنے لگا: ''مُنھ دھو لو۔ بھلا میں تمھیں اس گھر سے جانے دوں گا؟''

....

گرمیوں کے آخر میں منور خانم کے اصرار پر علی کے گھر والوں نے سیاہ ماتمی لباس ترک کر دیا لیکن مہرانگیز ابھی بھی کالی چادر اوڑھے رہتی۔ علی کی ماں مہرانگیز کو ہرگز نہیں رکھنا چاہتی تھی اور وہ اس کا بوریا بستر کب کی گول کر چکی ہوتی لیکن علی کی دھمکی اور ماں سے بحث کے باعث اس کا قیام طول اختیار کر گیا۔ پہلے علی کی چھوٹی بہن کی شادی اُسی کے ساتھ کر دی گئی جس کے رشتے کو علی کے والد نے رَد کر دیا تھا۔ منور خانم اور نیر پورا ہفتہ شادی والے گھر میں ٹھہرے۔

شام کے وقت سب کم سِن لڑکے اور لڑکیاں مہرانگیز کے کہنے پر پنجدری کمرے میں جمع ہو جاتے۔ بڑی بہن پریشان دکھائی دیتی اور زیادہ تر باغیانہ رویوں کا اظہار کرتی۔ چھوٹی بہن سُرخ گالوں، سجی سنوری صورت اور تراشی خراشی کمان دار ابروؤں کے ساتھ ایک بالکل نیا انسان بن چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ نیر اگرچہ علی سے پردہ کرتی تھی لیکن جب وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتی تو اُس کی چادر قدرے سرک جاتی۔ اب وہ بڑی ہو گئی تھی اور ناز و ادا دکھاتی تھی۔ علی نے بھی اس کی ادائیں سمجھنا شروع کر دی تھیں۔ علی مزاحیہ انداز میں مختلف نقلیں اتار رہا تھا۔ جس وقت سب ہنس ہنس کر دُہرے ہو جاتے، بڑی بہن ہلکا سا بھی نہ مسکراتی۔ علی سب کی باتوں کو سمجھ رہا تھا لیکن اُس کا ایسا کرنا علی کی سمجھ سے باہر تھا۔

ایک دن کھیل کھیل میں علی نے ایک لمبی سی لکڑی ہاتھ میں پکڑی اور دیوار پر ایک خیالی سا جغرافیائی نقشہ بنانے لگا۔ پہلے اُس نے تاریخ کے اُستاد کا روپ دھارا، پھر جغرافیے کے معلم کی نقل اتارنے لگا اور یوں دونوں سبق ملا دیے۔ وہ کہہ رہا تھا: ''یہ لمبی اور تنگ پٹی مصر ہے۔ یہ دریائے نیل ہے۔ مصر کے فرعون خود کو خدا سمجھتے تھے اور ایسے پہاڑ بناتے جو خدا کے بنائے ہوئے پہاڑوں کی طرح آسمان کو چھوتے۔''

بڑی بہن نے ناک بھوں چڑھائی اور علی کی بات کو کاٹتے ہوئے کہنے لگی: ''علی کفر بک رہا ہے۔ کہو استغفر اللہ!''

نیر نے کہا: ''پیاری عزت آپا! ہم تو کھیل رہے ہیں! وہ تو صرف ہمیں بہلا رہا ہے، اُسے کرنے دو ناں۔''

کھیل؟ تم ابھی تک بچے ہو؟ اگر اس کی شادی ہو چکی ہوتی تو اس کے بچے کا قد میرے برابر ہوتا۔

مہرانگیز بولی: ان شاء اللہ، چھوٹے مالک کی شادی ہوگی، بچہ ہوگا، میں خود اُسے پالوں گی اور تُو بھی عزت خانم، اس سال نہیں تو اگلے سال اپنے گھر سدھارے گی۔ یہ میں تمہیں دل سے کہہ رہی ہوں۔''

عزت خانم پھر نہیں بولی۔ نیر نے کہا: ''علی، وہیں سے بتاؤ کہ وہ پہاڑ بناتے تھے...''

اور علی نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: ''ہاں، لیکن پہاڑ بنانا کیوں کہ آسان کام نہیں ہے اور انسان خدا نہیں کہ چشم زدن میں پہاڑ بنا دے۔ 'کُن' کہے اور ہو جائے 'فیکون'۔ ان پہاڑوں کو غلاموں نے بنایا اور ان میں سے بہت سے سورج کی تیز روشنی میں کوڑے کھاتے ہوئے مر گئے۔ بہت سے ان میں سے پتھروں کو پتھروں سے ٹکراتے رہے اور 'یا علی مدد' کہتے رہے — ہائے وہ سب رخصت ہوئے۔ فرعونوں کے ہاتھ بھی آسمان کو نہ چُھو سکے اور وہ بھی زمین بھی دفن ہوئے۔ اس کے بعد ان کی ممیاں بنا کر انہی پہاڑوں میں رکھا گیا ہے۔''

مہرانگیز چمک کر بولی: ''مالک! مصر کے لوگ سیاہ ہوتے ہیں؟...''

علی نے کہا: ''نہیں، مہرانگیز! وہ کالے نہیں ہوتے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ صرف سیاہ لوگوں پر ہی ظلم ہو!''

....

علی کی ماں نے بیٹھک کی الماری میں رکھے بڑے گھڑیال اور اس کے گرد پڑے دو حبشی لڑکیوں کے مجسموں کو بیچ دیا۔ اس کی رقم چھوٹی بیٹی کے جہیز میں صرف ہوئی اور یوں وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ اس کے باوجود کہ اب علی کی چھوٹی بہن رخصت ہو چکی تھی اور خود علی کو بھی تجارتی دفتر کے مالک نے سیکریٹری رکھ لیا تھا، آٹھوں پرنویں کا وجود بھاری تھا لیکن مہرانگیز کی کفالت بوجھ محسوس کیے جانے کے باوجود طوالت اختیار کر گئی۔ مہرانگیز کو جب بھی موقع ملتا وہ مصری ممیوں کے

بارے میں علی سے دریافت کرتی رہتی کہ: ''کس طرح ابھی تک ستتر کفن خراب نہیں ہوئے؟ یہ کیسا معاملہ ہے؟ میرے مالک! کالے لوگ مصر سے لائے جاتے ہیں؟ مصر میں سمندر ہے؟ میری ماں بھی کہتی تھی کہ سمندر ہر جگہ ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ شہر نورالصبا مصر میں تھا، ایک ایسا شہر جو جنت کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ نورالصبا جنت ہی کی طرح کا شہر تھا۔''

....

علی کی ماں جلد ہی بوڑھی ہوگئی۔ اُس نے تانبے کا وہ بڑا برتن بھی فروخت کردیا جس میں وہ سال میں ایک مرتبہ قتل امام حسینؑ کی نیاز پکایا کرتی تھی۔ اس کی آدھی رقم اس نے اُس بڑھیا کو دے دی جس کے بارے میں اُس نے سُن رکھا تھا کہ قسمت کھولنے والی ہے اور باقی آدھی رقم اُس کی نئی شادی شدہ بہن کی شادی کے بعد دعوت میں خرچ ہوگئی۔ دعوت کے دن علی دفتر نہ گیا اور مہمانوں کی آؤ بھگت کرتا رہا۔ نیر اور منور خانم بھی بغیر کسی تردد کے برتن چُن رہی تھیں اور کسی کے داماد کی باتیں بھی کررہی تھیں۔ ماں کمر پر ہاتھ رکھے ہمیشہ کی طرح مہرانگیز کو چھوٹے چھوٹے بے شمار کاموں کا حکم دے رہی تھی۔ مہرانگیز پھرکی کی طرح پورے گھر میں گھوم رہی تھی۔ وہ چیزیں لاتی، لے جاتی اور مہمانوں کے سامنے پیش کرتی۔ شام سے پہلے ہی مہمان رخصت ہوگئے البتہ نیر اور منور خانم یہیں تھے۔ علی پنجدری کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ نیر بھی اُسی کمرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ اس قدر سُرخ ہورہا تھا کہ علی کی نگاہ اس پر سے نہ ہٹتی تھی۔ وہ بظاہر سویا ہوا تھا، لیکن اس کی نظریں اُسی پر جمی تھیں۔ مہرانگیز اس قدر آہستگی سے رینگتی ہوئی کمرے میں آئی کہ علی کو پتا بھی نہ چل سکا۔ اُس نے مہرانگیز کا ہاتھ اپنے بازو پر محسوس کیا۔ مہرانگیز نے اس کے کان میں سرگوشی کی: ''چھوٹے مالک! میرے ساتھ آیئے۔'' علی تھکا ہوا تھا اور اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ نیر کا خوبصورت چہرہ اور ہنستی اور شرماتی ہوئی آنکھیں چھوڑ کر جائے لیکن وہ مہرانگیز کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس عورت کے ہاتھوں میں وہ جوان ہوا تھا اور اُس کے لیے وہ ماں سے بڑھ کر تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل دیا۔ دونوں بیٹھک کے دروازے کے پیچھے کھڑے ہوگئے اور کان دھر دیے۔ منور خانم کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی:

— یہ رشتہ بھی تو اچھا ہے، اگر کوئی بات طے ہوجاتی تو...

علی منور خانم کی باقی بات نہ سُن سکا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ نے کچھ سننے ہی نہ دیا۔ یہ اُس کی ماں تھی جو حقہ پی رہی تھی۔ اس کی ماں نے جواب دیا: ''جو قسمت میں ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

منور خانم نے کوئی بات کہی جس کا محض ایک حصہ ہی وہ سمجھ سکا۔ ''کچھ وقت لے لیتے ہیں۔'' لیکن ماں کے جواب نے پوری صورتِ حال اُس پر واضح کردی۔ وہ کہہ رہی تھی: ''دیکھو بہن! میں بالکل نہیں چاہتی کہ تم ہمارا انتظار کرو۔ تم تو جانتی ہو کہ صرف علی کی تنخواہ پر تو خود ہمارا گزارا نہیں ہوتا، اب اگر اس کی دلہن لے آؤں گی تو کیا بنے گا؟''

دراصل میں سوچ رہی تھی کہ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ بہت گناہ کی بات ہے۔

ماں کا سخت جواب سنائی دیا: ''علی ابھی بچہ ہے۔ ابھی اس کے دل میں کوئی نئی خواہش پیدا ہوسکتی ہے۔''

منور خانم کا جواب بھی بالکل واضح اور صاف سُنا جاسکتا تھا کہ: ''میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کل کو کوئی شکایت مت کرنا۔''

علی نے عجلت میں کپڑے تبدیل کیے اور منور خانم اور نیر کو خدا حافظ کہ بغیر گھر سے باہر نکل گیا۔ مہرانگیز اس کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے آئی تا کہ بعد میں بند کرے، کہنے لگی: ''چھوٹے مالک! غم نہ کریں۔ غم انسان کو کھا جاتا ہے۔'' علی جو چوکھٹ میں کھڑا تھا، بولا: ''اچھا میں اندر جاتا ہوں اور انہیں بتا دیتا ہوں کہ نیر میری ہے؟ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈیں، میں انہیں بتاتا ہوں کہ نیر تو بچپن ہی سے میری تھی، کیا نیر ہمیشہ سے میری نہیں تھی؟''

اور واپس لوٹا لیکن مہرانگیز نے اُسے سامنے سے روک لیا اور کہنے لگی:

''چھوٹے مالک! بیگم صاحبہ کا مزاج بگڑتا جا رہا ہے۔ اکثر لڑائی جھگڑا برپا ہوجاتا ہے۔ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں...'' بعد میں بولی: ''اگر میرے پاس ایک لمبی سیاہ چادر ہوتی تو میں ابھی اوڑھ کر منور خانم کے گھر چلی جاتی اور اُس سے کہتی: ''منور خانم، میرے مالک...... آیا کی جان! آپ مجھے بتائیں کہ میرے لیے کیا کیا کہنا زیادہ مناسب ہوتا؟''

....

ایک دن دوپہر کو علی کافی دیر سے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا لیکن کوئی کھولنے کے لیے نہیں آرہا تھا جب کہ گھر کے اندر سے گالیوں اور رونے دھونے کی مسلسل آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ علی کا دل دھڑکنے لگا اور اُس نے زیادہ شدت کے ساتھ دروازے کو بجانا شروع کردیا۔ بالآخر علی کی بہن نے دروازہ کھولا۔ علی اندر آیا۔ اُس نے مہرانگیز کو دیکھا جو باغیچے کے کنارے گری ہوئی تھی،

اُس کے ماتھے پر زخم تھا اور باورچی خانے کی ایک بڑی چُھری حوض کے کنارے پڑی چمک رہی تھی۔ علی نے ماں کی طرف نظر دوڑائی جو غصے سے کانپ رہی تھی اور اُس کے چہرے پر وحشت تھی۔ شدتِ گریہ سے علی کا دم گُھٹنے لگا۔ بالآخر اُس نے پوچھا: ''کیا ہوا؟ خدا کے لیے کچھ تو بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟''

ماں نے جواب دیا: ''اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا یہ حبشی غلام! تم سب اس سیاہ بے ڈھب عورت کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو۔ وہ تمہارا باپ، خود تم، میں جانتی ہوں تمہاری بھی س راہ و رسم ہے۔''

علی نے حیرت سے ماں پر نظریں گاڑ دیں اور کہنے لگا: ''خدا کے لیے بس کیجیے، یہ بتائیں کیا ہوا ہے؟''

— ''کچھ نہیں۔ اور تم کیا چاہتے ہو کہ ہو؟— یہ دیکھو۔'' اور دو موم کے آپس میں چپکے ہوئے ٹکڑے علی کے ہاتھ میں تھما دیے۔ علی کو کچھ سر پیر سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر موم کے یہ ٹکڑے کیا بلا ہیں۔ اُس نے حیرت سے پہلے ماں اور بہن کی طرف دیکھا، پھر اُس کی نظریں مہر انگیز پر پڑیں جو اُسی طرح باغیچے کے کنارے گری ہوئی تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ ماں کہہ رہی تھی: ''جی ہاں— اب جادو بھی کرنے لگی ہے۔ یہ آپس میں چپکی ہوئی دو گڑیاں مجھے باورچی خانے سے ملی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگی چھوٹے سرکار اور نیر خانم ہیں کہ دونوں اس طرح ہو جائیں۔ یہ مت سمجھو کہ میں نے بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔ جو تجھ بے کار بڑیا کو نہ پہچان سکوں؟ تو اگر جادو جانتی ہے تو اس بچی کے لیے کیوں نہیں کرتی کہ اس کے نصیب کھل جائیں؟ جواب دے؟ بعد میں میں نے اس سے کہا کہ علی کے آنے سے پہلے اس گھر سے نکل جاؤ تو جا کر ایک چھری اُٹھا لائی تا کہ مجھے مار ڈالے۔''

مہر انگیز وہیں بیٹھی تھی۔ وہ خاک و خون سے بھر چکی تھی۔ اُس نے کہا: ''سرکار بیگم کی صاحبہ کی باتیں مجھے مار ڈالیں گی۔ مجھے چھڑی اٹھا دو میں خود کو مار ڈالوں۔ میں حبشی غلام کس قابل کہ کسی خانم کو ماروں یا خود اپنے بچے پر بری نظر ڈالوں۔ میرا تو بال بال اسی گھر میں سفید ہوا ہے...'' پھر وہ اتنا روئی کہ الامان والحفیظ!

رات کو علی گھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ مہر انگیز گھر کے بیرونی دروازے کے چبوترے پر اپنی گٹھری لیے بیٹھی تھی۔ علی کو دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی: ''مجھے اب کہیں اور چلے جانا

چاہیے۔ بیگم صاحبہ نے ایسی باتیں کی ہیں کہ کوئی اگر اپنے بچے کے لیے ہی برا سوچتا ہے تو پھر مجھ جیسی حبشی دایہ کو کچھ بھی کہنے کا اختیار رکھتا ہے۔ آیا کی جان! ان دونوں موی گڑیوں کو لو اور کوئی بھاری چیز ان کے ساتھ باندھ کر حوض میں ڈال دو۔ دیکھنا، اگلے ہفتے ہی نیر تمہاری ہو جائے گی۔ اچھا اب تمہیں خدا حافظ کہتی ہوں۔ میرے بچے میں نے تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے پالا ہے، میں...''

—اب تم کہاں جا رہی ہو؟ کہاں رہو گی؟

مہرانگیز آنسو پونچھتے ہوئے گویا ہوئی: ''چھوٹے مالک! تم غم نہ کرو۔ میں منور خانم کے گھر جا رہی ہوں۔ ان شاء اللہ میں نیر خانم کے جہیز میں ہوں گی۔ پھر دوبارہ اپنے گھر لوٹ آؤں گی، اپنے آقا کے پاس۔ میرے بچے! میں تو تمہارے قدموں کی خاک ہوں۔ البتہ اگر منور خانم نے مجھے قبول نہ کیا۔

....

چند ماہ بعد نیر کی شادی ہوگئی۔ مہرانگیز بھی جہیز میں تھی اور دلہن کے ساتھ دولہا کے گھر آ گئی لیکن لیکن دولہا علی نہ تھا۔ منور خانم اور نیر خدا حافظ کرنے اور شادی کی دعوت دینے علی کے گھر آئے تھے لیکن وہ سامنے نہ آیا اور شادی پر بھی اپنی ماں کے تمام تر اصرار کے باوجود نہ گیا۔ نیر کی شادی کی رات وہ واحد رات تھی جب علی نہ سو سکا۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ اُسے محسوس ہوا کوئی چیز اُس کے گدے پر گری ہوئی ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا تاکہ ٹٹول کر دیکھے لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

اگلے دن دوپہر سے پہلے ان کا گھر کا دروازہ بجا۔ وہ اپنی بہن اور ماں کا ہرگز منتظر نہ تھا کہ وہ اس قدر جلدی شادی سے لوٹ نہ سکتی تھیں۔ دروازہ کھولا تو مہرانگیز وہی پرانی چادر اپنے کندھوں اور سر پر لپیٹے کھڑی تھی۔ وہ دونوں پنجدری کمرے میں گئے۔ مہرانگیز نے اپنی بوسیدہ چادر میں سے تہہ کیا ہوا رومال نکالا اور تمام تر عقیدت کے ساتھ علی کے سامنے رکھ دیا۔ یہ ایک مٹھائی کا ٹکڑا تھا جو اس ریشمی پھول دار رومال میں اچھی طرح سے لپٹا ہوا تھا۔

علی نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

—مجھے آپ کا خیال آ رہا تھا، چھوٹے صاحب! یہ شادی کی مٹھائی ہے۔

علی کا دل بھر آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ کچھ کہتا، اس نے مہرانگیز سے سوال کیا: ''دلہن دولہا کو الوداع کر دیا ہے جو یہاں آئی ہے؟''

میں نے نیر خانم سے اجازت لی ہے۔

علی خاموش ہو گیا۔ مہر انگیز نے کہا: ''دولہا گنجا ہے۔ کل رات تو مجھے پتا نہ چل سکا۔ کل جب وہ سیج پر بیٹھا تھا تو اُس نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ صبح میں کمرے کی صفائی کرنے گئی تو مجھے معلوم ہے کہ وہ سر سے گنجا ہے۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کا اعلیٰ افسر ہے۔ مجھے تو کشتی ران معلوم ہوتا ہے۔ میرے تو چھوٹے آقا کی چھوٹی انگلی بھی اُس جیسے دولہا سے سیکڑوں گنا قدر و قیمت کی حامل ہے۔

دُکھ سے علی کا لہجہ رُندھ گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ''نیر کیسی ہے؟ خوش تھی؟'' مہر انگیز نے جواباً سر جھٹک دیا۔ اور مایوسی سے اُس کے ہونٹ لٹک گئے۔ بس وہ رویا ہی چاہتی تھی۔ بولی: ''نہیں۔ کل رات وہ سیج میں مسہری پر بیٹھی تھی۔ عورتوں نے اُسے بہت کہا کہ وہ اپنا ہاتھ دولہا کی طرف بڑھائے... ظاہر ہے کہ وہ یہ چاہتی تھیں کہ اس کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیں لیکن اُس نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ عورتیں کہتی رہیں کہ رونمائی طلب کرو لیکن نہیں آقا! نیر خانم چہرہ بھی نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن بہت زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ سُرخ رنگ کے پھولوں سے اس کے بالوں کو باندھا گیا تھا اور ان کے درمیان ایک بجلی کا بلب بھی روشن کیا گیا تھا۔ میں نہیں جانتی بہت عجیب قسم کا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھیں کہ جس وقت نیر خانم چاہتی تھی کہ بجلی کے اس بلب کو بجھا سکے وہ بجھا دیتی۔ اس کی قوت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اماں کی جان! بالآخر دولہا نے زبردستی نیر خانم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک سُرخ رنگ کا پھول بستر پر گر پڑا۔''

....

نیر اور اس کا بیٹا بیژن کبھی کبھی مہر انگیز کے ساتھ علی کے گھر آیا کرتے تھے البتہ پولیس افسر جو اب اس خاندان کا داماد بن چکا تھا، عید تہوار کے علاوہ کبھی ان کے گھر نہ آیا۔ نہ ہی اُس کی کبھی علی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بات چیت ہی ہوئی۔ نیر نے اپنے بیٹے کے لیے بھی مکمل پولیس کی وردی سی رکھی تھی۔ بچہ اگرچہ اس لباس کو پہن کر خاصا تنگ ہوا کرتا تھا لیکن بالکل پولیس افسروں کی طرح اس کا سینہ باہر کی طرف نکلا ہوا ہوتا اور وہ خوب چاق و چوبند دکھائی دیتا۔ ایک لکڑی کی چھوٹی سی تلوار چلتے وقت اس کے پاؤں سے ٹکراتی تھی۔ علی نے ایک مرتبہ تو نیر سے پوچھ ہی لیا: ''بچے کو ابھی سے اس چیز کا عادی کر رہی ہو؟'' نیر نے جواب دیا: ''خوب صورت ہے؟ نہیں؟'' اور علی کا جی بھر آیا۔ لیکن نیر نے دوبارہ کبھی علی کے گھر آتے وقت پولیس کی وردی نہ پہنائی۔

ایک مرتبہ آفیسر صاحب اپنی ڈیوٹی پر گئے۔ نیر، بیژن اور مہر انگیز دوپہر کے کھانے پر علی

کے ہاں مدعو تھے۔ نیر اب کچھ فربہ ہو چکی تھی اور اُس نے حجاب بھی ترک کر دیا تھا۔ جس وقت وہ ہنستی تو اس کے گالوں پر ننھے ننھے ڈمپل پڑتے لیکن جب کبھی اس کی نگاہیں علی سے ٹکراتیں، تو وہ بہت رنجیدہ اور شکایتی انداز اختیار کر لیتیں۔ عزت خام دوپہر کے بعد بیٹھک میں نماز پڑھنے لگتی۔ وہ کافی نمازی ہو چکی تھی اور اکثر لمبی نمازیں پڑھتی۔

دوپہر کے بعد مہرانگیز، بیژن کو پنجدری کمرے میں سلانے کے لیے لے آئی۔ علی بھی اُسی کمرے میں لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مہرانگیز اس قدر بوڑھی ہو چکی تھی کہ کوئی دوسرا تو ایک طرف خود علی کی ماں تک نے یہ خیال چھوڑ دیا تھا کہ وہ علی کو اُس کے ساتھ ملوانے کے موقعے پیدا کرتی رہتی ہے۔

علی نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور بیژن کی شرارتوں اور نقلوں کو دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ اُس کی نیر کے بچپن سے کس قدر مماثلت تھی۔ بیژن شرارتیں کر رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ سوئے۔ وہ علی سے تصویروں والا البم مانگ رہا تھا جو اُس کے پاس نہیں تھا یا پھر کم از کم ایک رنگین پنسل اور کاغذ کا ٹکڑا — مہرانگیز نے کہا: ''چلو، بیژن خان، یہاں آؤ، آقا کو بوسہ دو اور میرے پاس آؤ میں تمہیں کہانی سنا کر سُلا دوں۔ تم اگر اس شدت کی گرمی میں نہ سوؤ گے تو پھر تمہاری نکسیر پھوٹے گی۔ علی نے بیژن کے بوسے کے انتظار میں آنکھیں موند لیں لیکن وہ بوسہ دیے بغیر مہرانگیز کے پاس بھاگ گیا۔

علی نے مہرانگیز کی آواز سنی جو نہایت آہستگی سے کہہ رہی تھی: ''نورالصبا کی سب عزت کرتے۔ ہاں اُس کی عزت کرتے، اُسے بنارسی لباس پہناتے، اس پر جواہرات نچھاور کرتے۔ اس کے بعد اُسے اپنے شہر لے جاتے۔ اپنے شہر میں، نانی کی جان! ایک بادشاہ تھا کہ سمندر کے کنارے حبشیوں کو حکم دیتا تھا کہ اس کے لیے پہاڑ بنائیں۔ ان کے شہر میں سب کچھ تھا لیکن پہاڑ نہیں تھے۔ بادشاہ کے دل میں پہاڑوں کی بھی خواہش پیدا ہوئی۔ سیاہ لوگ سیکڑوں پتھروں کو اپنی پشت پر لادتے اور پہاڑ بناتے۔ اب نورالصبا اُن پہاڑوں کی طرف دیکھتی ہے لیکن اُن پہاڑوں پر درخت سبز نہیں ہوتے...''

علی نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور مہرانگیز کی طرف دیکھنے لگا جو بیژن کے ساتھ بیٹھی اُس کی قمیص میں ہاتھ ڈالے قدرے آہستگی سے اس کی کمر کو سہلا رہی تھی۔ علی نے اُس سے پوچھا:

''مہرانگیز درخت ہرے کیوں نہیں ہوتے؟''

مہر انگیز کہنے لگی: ''میرے مالک! میں نے آپ کی نیند خراب کی۔ یوسٔن خان جب تک کوئی کہانی نہ سُنے اُسے نیند نہیں آتی، بالک آپ کی طرح۔''

— میں نے پوچھا کہ درخت کیوں نہیں پھلتے پھولتے؟

— اس لیے کہ ان پہاڑوں کے قدموں میں خون بہایا گیا ہے۔ چھوٹے مالک! سیابلّیوں اور سیاہ لوگوں کا — اور نہ جانے کیا کیا ظلم یہاں ہوئے!

علی نے اپنی آنکھیں موندلیں۔ اُس نے یوسٔن کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا: ''وہیں سے شروع کرو ناں!''

اور پھر وہی مہر انگیز کی آواز اور وہی پرانی کہانیاں، سمندر کا کنارا اور ایک بھدا آدمی زنجیروں اور اونٹ کے ساتھ اور اس کے بعد ایک ایسی کہانی جو علی نے کبھی بھی مہر انگیز کی زبانی نہ سُنی تھی:

''میری ماں بھی کالے لوگوں کی زبان جانتی تھی۔ لیکن مجھے کسی نے نہیں سکھائی۔ ایک دن ایک بوڑھا غلام بڑے مالک کے گھر آیا جو میری ماں کے ساتھ اپنی زبان بول رہا تھا۔ بیگم صاحبہ اور بڑے صاحب بالکل نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ اس سے اگلے دن میری ماں نے اپنی گٹھری بغل میں دبائی۔ کہنے لگی کہ میں حمام تک جا رہی ہوں۔ وہ چلی گئی۔ ایک سال تک اُس کی کوئی خبر نہ آئی۔ ہر جگہ اُسے تلاش کیا گیا۔ سب کہتے کہ ڈوب گئی ہوگی یا پھر شاید مر چکی ہے۔ سب کہتے تھے کہ حبشی دایہ فرار ہوگئی ہے۔ ایک دن غروبِ آفتاب کے قریب وہ لوٹ آئی۔ لیکن وہ اکیلی نہ تھی۔ میرے ساتھ تھی۔ اُس نے مجھے ایک بچھونے میں لپیٹا ہوا تھا اور اپنی چادر میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر وہ اتنا روئی، اتنا روئی — بے حد روئی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے اُس کی غلطی معاف کردی۔ اس کے بعد ہر سال مجھے لیتی اور کہیں چلی جاتی اور پھر چند دن کے لیے غائب رہتی...''

علی کھڑا ہوگیا اور پوچھنے لگا: ''مہر انگیز تمہیں یاد ہے کہ تم کہاں گئی تھیں؟ کس کے پاس ٹھہری تھیں؟''

مہر انگیز کہنے لگی: ''مجھے وہ سب ایک خواب کی طرح یاد آتا ہے۔ ہم ایک کنویں پر گئے، وہاں ایک بوڑھا غلام آیا اور اُس نے مجھے گود میں لے لیا۔ وہ مجھے پیار کر رہا تھا۔ اُس نے تازہ کھیرے توڑے اور ہمیں دیے۔ اس کے بعد مجھے گایوں کے ساتھ رہٹ پر بٹھا دیا۔ میں گایوں کے تیز تیز چکر لگانے سے بہت زیادہ ڈر جاتی تھی۔ البتہ مجھے پانی سے بھرا وہ ڈول ضرور یاد ہے جو

کنویں سے اوپر آتا تھا اور میٹھا پانی جب نیچے گراتا تو میں خوش ہوجاتی تھی۔ میں خوش ہوگئی تھی۔ کنویں کی چرخی سے ایسی ہی آواز آتی رہتی تھی اور اسی طرح میٹھا پانی گرتا رہتا۔ میری ماں اور وہ آدمی کمرے میں چلے جاتے اور دروازے بند کر لیتے۔ آخری سال جب ہم گئے تو وہ بڑی عمر کا شخص نہ تھا بلکہ ایک اور آدمی وہاں موجود تھا جس نے میری ماں سے کہا کہ اُسے ڈھونڈ لیا گیا ہے اور گرفتار کر کے ''نوشہر'' لے جایا گیا ہے— اور میری ماں بہت رو رہی تھی۔

....

ایک روز غروبِ آفتاب کے قریب علی نے لباس تبدیل کیا اور ابھی گھر سے باہر جا ہی رہا تھا کہ دروازہ بہت زور سے بجا۔ یہ نیر کا شوہر تھا۔ اُس کے کندھوں پر ستارے سجے ہوئے تھے، وہ پولیس کی وردی اور اسلحے سے لیس تھا اور ہاتھ میں بید کی چھڑی تھامے ہوئے تھا۔ گویا آفیسر صاحب ابھی ابھی ڈیوٹی سے واپس آئے تھے۔ اُسے دیکھ کر علی نے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ کبھی کبھی وہ اس سے اس قدر نفرت محسوس کرتا کہ اس کا دل چاہتا کہ اس کے کندھوں پر سجے تاروں، امتیازی بیج اور دیگر ساز و سامان کو نوچ ڈالے اور اس کے ہاتھ سے بید کی چھڑی چھین لے اور اس کے سر میں دے مارے لیکن کبھی کبھی وہ اس سے ایک عجیب طرح کی محبت بھی محسوس کرتا۔ آخر وہ نیر سے سب سے زیادہ قربت رکھتا تھا۔ علی منتظر کھڑا تھا۔ وہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے جھجک محسوس کر رہا تھا۔ نیر کے شوہر نے کہا: ''آپ میرے ساتھ چلیے۔'' جس سے علی کا خوف مزید بڑھ گیا۔ اُس نے دل میں سوچا: ''نیر نے بلایا ہوگا یا مہرانگیز نے؟'' جی تو چاہتا تھا کہ اس پولیس افسر کی چھڑی چھین لے اور...... تنگ آ کر اُس نے پوچھ ہی لیا: ''کیا ہوا ہے؟'' وہ چلتے گئے۔ اس سے پیش تر علی، نیر کے گھر کبھی نہیں گیا تھا۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے پھر پوچھا:

— کیا بات ہے؟ تم مجھے اکیلے یہاں کیوں لائے ہو؟

— میرا اردلی تمہارے گھر کا پتا نہیں جانتا۔ چناں چہ مجھے خود آنا پڑا۔

علی نے پوچھا: ''میری خالہ زاد تو ٹھیک ہے ناں؟ مہرانگیز کیسی ہے؟— اور تمہارا بیٹا بیژن...'' پولیس افسر نے جواب دیا: ''مہرانگیز نے تمہیں بلایا ہے۔ بڑھیا اب بے کار ہوتی جا رہی ہے۔ گیس کے چولہے کا پمپ صحیح طرح نہ چلا سکی، چولہا پھٹ گیا اور وہ سر سے پاؤں تک جل گئی۔ چند دن پہلے ہی یہ حادثہ ہوا ہے۔''

— اب کہاں ہے؟ ہسپتال میں؟

پولیس افسر نے کہا: ''اُس نے یہ مہلت ہی نہیں دی۔''
علی خاموش ہو گیا اور جب تک نیر کے گھر نہ پہنچ گئے، وہ کچھ نہ بولا۔
نیر نے دروازہ کھولا۔ وہ اُمید سے تھی اور ایک ہاتھ سے بیژن کی انگلی تھامے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے علی کو بتایا:
مہرانگیز اوپر کی منزل میں ہے۔ مجھے اُس کے ساتھ اکیلے ٹھہرتے ہوئے پریشانی ہو رہی ہے۔
علی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ مہرانگیز گوشت کے لوتھڑے کی طرح کچلی ہوئی گدے پر پڑی تھی۔ اُس کا چہرہ اس قدر سُوج رہا تھا کہ آنکھیں بھی پوری طرح نہ کھل رہی تھیں۔ وہ علی کو ایک ٹوٹی پھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ تکنے لگی اور پھر بولی: ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی، میرے مالک!''
علی نے وہیں کھڑے ہوئے اُس سے پوچھا:
''تم نے مجھے جلدی اطلاع کیوں نہ دی؟ میں تمہارے لیے کوئی ڈاکٹر ہی لے آتا۔ تمہیں ہسپتال لے جاتا۔''
— میرے آقا، کیا فائدہ!
اس کے بعد علی نے دیکھا کہ مہرانگیز خود کو جنوبی کھڑکی کی طرف گھسیٹ رہی ہے۔ اس نے فوراً پوچھا:
— کھڑکی کھول دوں؟
— نہیں مالک! میں چاہتی ہوں کہ قبلہ رُو ہو جاؤں...
علی نے اس کا گدا پکڑا اور اُس طرح جیسے وہ اس پر پڑی تھی، گھسیٹ کر اُسے قبلہ رُخ کر دیا۔
نیر اندر آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سفید رومال تھا۔ مہرانگیز پرسکون ہو چکی تھی۔ اُس نے نیر سے کہا: ''بیگم صاحبہ! طاقچے پر 'سجدہ گاہ' ہے۔ مجھے لا دیں تاکہ میں اسے اپنی آنکھوں سے لگاؤں۔''
نیر نے شیلف سے 'سجدہ گاہ' اٹھائی۔ اس کی گرد جھاڑی اور کہنے لگی: ''یہ سجدہ گاہ تو بہت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے، جا کر تمہارے لیے دوسری لے آتی ہوں —''

— جی ہاں۔ ٹوٹی ہوئی ہے۔ جب میری ماں کی آنکھ میں بینائی نہ رہی تھی تو اُسے بتایا گیا تھا کہ ٹوٹی ہوئی سجدہ گاہ کو اپنی آنکھوں پر لگائے۔

علی مہرانگیز کے بستر کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ نیر کی آواز نے اچانک اُسے متوجہ کیا۔ وہ کہہ رہی تھی: ''جاؤں تمہارے لیے کرسی لے آؤں۔''

— نہیں، نہیں۔

پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ نیر بدستور کھڑی تھی اور خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ گرد و غبار سے اٹا ہوا بلب جل اُٹھا۔ اس کے بعد مہرانگیز کی آواز سنائی دی۔ بالکل آہستہ آواز۔ جیسے کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہو:

''انہوں نے میرے پیروں پر مہندی لگائی۔ مجھے بہت ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ ہم نورالصبا کے ساتھ تانگے پر سوار ہو گئے۔ مردوں نے ہیٹ پہن رکھے تھے۔ ہم ''فتح الایالہ'' کے قریب ایک کنویں پر پہنچ گئے۔ اس نے ہمارے لیے تازہ کھیرے توڑے۔ بہت زیادہ ٹھنڈے — یخ بستہ — بالکل اس طرح کیسے انسان کا دل اور باطن ٹھنڈا ہوتا ہے... پھر اُس نے میرے لیے جگہ صاف کی اور کہنے لگا کہ میں نہانے کے لیے جا رہا ہوں... پھر وہ چلا گیا... میرے بچے! تُو تو میری ٹھوڑی کو باندھ رہا ہے... لیکن مجھے اُس وقت اپنی ماں کی ٹھوڑی باندھتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا تھا — یہاں تک کہ مرتے وقت اُس کا منہ بالکل ٹیڑھا ہوتا جا رہا تھا — کالے لوگ پہاڑ بناتے ہیں اور ان پہاڑوں کے نیچے جنت جیسے شہروں میں دوسرے زندگی گزارتے ہیں — ٹھنڈا، ٹھنڈا، یخ ٹھنڈا پانی...''

علی مہرانگیز کی لاش کے قریب بیٹھا تھا۔ نیر نزدیک ہی بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ دیوار پر اُس کا سایہ قدیم مصری بادشاہوں کے مخروطی مقبرے کی طرح دکھائی دے رہا تھا!

منیب الرحمٰن

ایک شاخ

اڑتی ہے ہوا میں ایک موسیقی
تم دوڑ کر ہاتھ سے پکڑ لو
اب شام کا وقت ہے، شفق ہے
تم باغ میں جا کے اس کو چھو لو

کانوں کو بناؤ تم بصارت
بینائی کو وصف سامعہ دو
خوشبو سے اٹھاؤ لذت لمس
آواز سے لطفِ ذائقہ لو

ہیں جتنے حواس آدمی کے
ہر ایک کا عمل جدا جدا ہے
جو چیز آنکھ کے لیے ہے
وہ کان کی دید سے نہاں ہے

ہے دل ہی فقط وہ شاخ جس پر
بینائی، لمس، شامہ، ذائقہ، سماعت

کھلتے ہیں سب ایک پھول بن کر
ہیں سارے خواص جس کے اندر
تم صبح کی روشنی میں ڈھل کر
اس پھول کو شاخ سے کتر لو

سناٹا

جب مکانوں کی چھتیں برف سے ڈھک جاتی ہیں
اور چاندی سی درختوں پہ بکھر جاتی ہے
میں نے جاتے ہوئے دیکھا ہے اسے
ایک پرچھائیں مری یادوں کی
مجھ سے نزدیک مگر بیگانہ
جنوری کا یہ ستم گر موسم
کوئی پرساں نہیں اس موسم میں
ایک تصویر خیالی کے سوا
وہ گھڑی بھر کو اگر لوٹ آئے
میں غم ہجر کی روداد کہوں
دل پہ ہر دم جو گزرتی ہے وہ بیداد کہوں
کھڑکیاں بند، اکیلا کمرہ
راستے برف کے نیچے معدوم
صبح سے میری طبیعت مغموم
اور ماحول کے سناٹے ہیں
زندگی سرد ہے آج
کس قدر درد ہے آج۔

حسن منظر

دفینہ

کالی گیلی مٹی کھود کر
رات ہم نے
اُس کے سپرد کر دی
منصور کی لاش۔
اُس کے ساتھ جانے کو
نہ سونے کے کنگن تھے
نہ شاہی لباس
نہ گیہوں کی بالیاں۔
سو ہم نے اُس کی
چَھپی اَن چَھپی کتابیں
گور میں رکھ دیں
کیونکہ وہ منصور کی
تحریر تھیں۔
نہ وہ سوسائٹی کے
کام کا تھا،
نہ اس کی کتابیں۔

عذرا عباس

نظم

میں نے پوچھا ان سے
وہ جو گلی کے نکڑ پر رہتے تھے
اس گلی کو چھوڑے مجھے عرصہ ہوا
بتاؤ مجھے اس گلی کا کیا حال ہے
کیسا ہے وہاں کا موسم۔
کہتے ہیں
نہ دھوپ ہے نہ چھاؤں
نہ ہوا ہے نہ حبس۔
میں نے پوچھا کیا یہ کوئی نیا موسم ہے؟
ہاں
نہیں
وہ ہاں نہیں کرتے رہے۔
میں نے سوچا
شاید یہ بتا نہیں پا رہے
یہ اداسیوں کا کوئی موسم ہوگا
اداسیاں تو ہمیشہ نئی ہوتی ہیں
میں نے پوچھا کیسے رہتے ہو بنا دھوپ اور چھاؤں کے

بولے انتظار کرتے رہتے ہیں
ہر وقت کسی بری خبر کے آنے کا۔
اور کیا کرتے ہو؟
کچھ نہیں
بس اپنے اپنے خوابوں کے مُردہ چوہے اٹھائے پھرتے ہیں۔
تم انہیں اتار پھینکو
کیسے؟
خواب پھینکے تو نہیں جاتے۔

نظم

نمبر بس ۱۷۶
آج کل 'ناٹ اِن سروس' ہے
تمہارے ملک میں تمام سروسیں ناٹ اِن سروس ہیں
کیا بجلی کیا پانی
روٹی کپڑا اور مکان کا وعدہ کرنے والے بھی
اب تو ناٹ اِن سروس ہیں
یہاں ۱۷۶ نمبر کی
بس گیراج میں جاتی ہوئی نظر آرہی ہے
یقین ہے اب یہ ٹھیک ہو کر آئے گی
لیکن تمہارے ملک میں ناٹ اِن سروس کے لیے
کوئی گیراج آج تک بنا ہی نہیں ہے

میں جو آج کل برطانیہ میں رہتی ہوں
اور سوچتی ہوں
تم کیسے رہے ہو وہاں
جہاں ناٹ اِن سروس میں
لوگ جی رہے ہیں
اور زندہ ہیں
جہاں ناٹ اِن سروس کے لیے کوئی گیراج نہیں ہے

شوکت عابد

ایک ہی گھر میں...

ایک ہی گھر میں تین شاعروں کا پیدا ہو جانا
کوئی اچھی بات نہیں...

شاید یہی وجہ تھی
میرے بڑے بھائی نے اپنے دو بھائیوں کے حق میں
شاعری ترک کر کے ایک نارمل آدمی کی طرح زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔

نارمل آدمی نارمل آدمیوں سے بھری اس دنیا کے امور کو
کامیابی سے چلانے کے لیے زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوتا ہے۔

وہ شاعروں کی طرح
زندگی سے اپنی مخصوص انفرادی ضرورت کے مطابق
کسی علیحدہ نظامِ اخلاق کی توقع نہیں رکھتا۔
بندھے ٹکے رسوم و رواج کی عمومی پابندیوں کو
قبول کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتا ہے۔
شاعر زندگی میں کامیابی کے لیے
بنے بنائے اصولوں کے سانچوں میں ڈھلنے کے لیے

اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا
سرکشی اور بغاوت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

گھر میں پیدا ہونے والا دوسرا شاعر
درحقیقت ایک مکمل شاعر کی روح لے کر دنیا میں آیا تھا
اس لیے شاعری ترک کرنا
اُس کے لیے زندگی ترک کرنے سے زیادہ مختلف نہ تھا...

میرا شاعر بھائی اس بدصورت اور بے ہنگم دنیا میں
سچائی، توازن، حسن اور محبت کے خواب دیکھنا چاہتا تھا...

اُسے زمین ماں سے زیادہ محبوبہ دکھائی دیتی تھی۔
اُسے بارش اور پانی سے پیار تھا
ریلوے اسٹیشن کے شیڈ میں پتھر کی بنچ پر گھنٹوں بیٹھ کر
مسافر زندگی کی گہما گہمی سے اپنے خالی پن کو بھرنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا...

وہ سر سے پاؤں تک شاعر تھا
سر سے پاؤں تک
ریل گاڑی کے آہنی پہیے اُس کے وجود کو کاٹتے ہوئے گزر گئے۔
ادبی حلقے آج بھی اُس کی یاد مناتے ہیں
زندگی کے شفاف اور دلاویز رنگوں سے بھری اُس کی شاعری
آج بھی شاعروں کا موضوعِ گفتگو بن جاتی ہے۔
ایک روز قبل ملاقات میں
اُس نے باکمال اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے
مجھے شائبہ تک نہ ہونے دیا

کہ وہ دوسرے دن ۱۱ بجکر ۲۰ منٹ پر
ملیر ہالٹ کے ریلوے اسٹیشن سے گزرنے والی بولان میل ایکسپریس کے ذریعے
ایک نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔

ثروت حسین!
یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے
کہ زندگی گزارنے کے لیے
تمھیں اُمید کے پانی سے بھری ایک چھاگل، شفاف دل جیسے کٹورے
اپنے مرحوم باپ کے اوزاروں سے بھرے صندوق کی یاد اور بوڑھی ماں کی دعا
کے سوا کچھ درکار نہ تھا۔

ثروت حسین!
تمھیں جانے کی بہت جلدی تھی
تم چلے گئے — ویران باغ میں موجود پتھر کے فوارے، اپنے درختوں،
اور اپنے بھائی کو الوداع کہے بغیر..
شاید تم نے مجھے الوداع کہنا ضروری نہ سمجھا
کیونکہ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔
تمھیں مجھ سے اپنی ادھوری اور اَن لکھی نظمیں لکھوانی تھیں
تم آج بھی میرے دل میں میرے ساتھ رہتے ہو
اور میری ضروری ترجیحات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہو
مجھے مصروف رکھتے ہو اپنی غزلیں اور نظمیں لکھوانے میں...
جناح ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں
سُرمئی چبوترے پر تمہاری کٹی ہوئی گردن نے
مجھ سے جو باتیں کی تھیں
انہیں بیان کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

ثروت حسین!
میری اِس بزدلی اور نااہلی پر مجھے معاف کر دینا۔

ثروت حسین!
میں محض زندہ رہنے سے زیادہ جینے پر یقین رکھتا ہوں
چھوٹے چھوٹے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں برداشت کرنے کا فن مجھے خوب آتا ہے...

ثروت حسین!
میں ایک ایسا نارمل آدمی نہیں بننا چاہتا
بڑھاپے میں جس کے بیٹے
عزت واحترام کی مسند پر بٹھا کر
اُسے بے منصب کر دیں۔
اور وہ ایک مجبور معزول بادشاہ کی طرح
اپنی بے بسی کا اظہار بھی نہ کر پائے...

ثروت حسین!
میں نارمل آدمی نہیں بننا چاہتا۔
میں شاعر نہیں بننا چاہتا
میں تو صرف مرنے سے پہلے مرجانے کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔
کیا تم میرے لیے دعا نہیں کرو گے؟

ثروت حسین!
ایک ہی گھر میں تین شاعروں کا پیدا ہو جانا
کوئی اچھی بات نہیں...

***

لیکن اکثر مجھے یاد نہیں رہتا...

میں پچپن برس کا ہو چکا ہوں
لیکن اکثر مجھے یاد نہیں رہتا۔
میری عمر کی سُوئی انتیس برس پر آ کر اٹک گئی ہے
میری داڑھی کے سفید بال بھی مجھے یاد نہیں دِلا پاتے
کہ میں پچپن برس کا ہو چکا ہوں۔

آج بھی میرا دل چاہتا ہے
کہ میں ایمپریس مارکیٹ کے فٹ پاتھوں پر
اپنے کسی دوست کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے
تھوڑی دیر کے لیے بھیڑ میں کسی ایسی جگہ گم ہو جاؤں
جہاں سے میں اپنے دوست کو پریشان دیکھ کر لطف اندوز ہو سکوں۔

آج بھی میرا دل چاہتا ہے
کتابوں کی دکان سے کوئی قیمتی کتاب چُرا لوں۔

میرا دل چاہتا ہے
کہ اپنے پرانے دوستوں کو بیش قیمت یادگار اشیاء کے ساتھ
اپنے دل کے لاکر میں محفوظ کر لوں...

میرے دوست میری مجبوری ہیں
اس مجبوری کی حقیقت میرے بیشتر دوست نہیں جانتے۔
اکثر اسے میری ایک خراب عادت سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

میرے اکثر دوست
دل کے عارضے، بلڈ پریشر یا شوگر کے مستند مریضوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔
میں پچپن برس کا ہو چکا ہوں
لیکن میری عمر کی سُوئی اُنتیس برس پر اٹکی ہوئی ہے
اپنے ہم عمر دوستوں سے ملتے وقت
اکثر مجھے یاد نہیں رہتا
کہ میرے سارے دوست بوڑھے ہو چکے ہیں!

***

محبت کا ہم معنی کوئی نیا لفظ...

محبت کرنے والے محبت کرتے ہیں
تصورِ محبت کے بارے میں شعر نہیں لکھتے۔

محبت کرنے والے شاعر کا دل اپنی زندگی
محبت کو بسر کرنے میں گزار دیتا ہے
محبت ایک شاعر کو
فلسفۂ محبت کی ناہیت پر نظمیں لکھنے کی فرصت نہیں دیتا...

مریضانہ رومانویت میں مبتلا نرگسیت زدہ شاعروں کے پاس

محبت کی مختلف کیفیات پر نظمیں لکھنے کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔

یہ نظمیں کالج میں پڑھنے والے کچی عمر کے طلبہ میں مقبولیت حاصل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔

سطحی جذبات سے آراستہ یہ نظمیں
موبائل فون پر ایس ایم ایس کی جاتی ہیں
اور مخصوص مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے
بے حد کارگر ثابت ہوتی ہیں۔

عوام میں مقبول اخبارات و رسائل میں
محبت کے نام پر لکھی جانے والی اِن نظموں نے
محبت کرنا بے حد آسان بنا دیا ہے۔

نوجوان محبت کو کمپیوٹر کے کسی سافٹ ویئر کی طرح
تھوڑی سی محنت سے سیکھ سکتے ہیں
اور حسبِ ضرورت استعمال کر سکتے ہیں۔

کثرت استعمال سے محبت کا لفظ
اپنی معنویت کھو چکا ہے
لغت تیار کرنے والوں سے درخواست ہے
کہ وہ اپنی نسل کی ڈکشنری کے لیے
محبت کا ہم معنی کوئی نیا لفظ تجویز کریں۔

***

ہم اس سے زیادہ جاننا بھی نہیں چاہتے

ہمیں صرف اتنا معلوم ہے
کہ ہمارے شہر میں روزانہ
چند نامعلوم قوّتوں کے اِشارے پر
چند نامعلوم افراد
چند نامعلوم ہاتھوں سے چلنے والی گولیوں سے
ہلاک ہوجاتے ہیں۔

محروم کردیا جاتا ہے روزانہ
کسی نان بائی کو تنور پر روٹیاں لگانے کی ذمّہ داری سے۔
کسی خوانچہ فروش کے بچّوں کو
اپنے باپ کا انتظار کرنے سے۔
کچرا اُٹھانے والے بچّے کو
کام سے فارغ ہوکر ٹی وی دیکھنے کے بہانے
چائے کے ہوٹل میں جانے سے پہلے
بار بار پیسے گننے کی زحمت سے۔

ایسے یا اس سے ملتے جُلتے پیشوں سے وابستہ
چند نامعلوم افراد

روزانہ اِس شہر کی آبادی پر بڑھتے دباؤ کو
کم کرتے رہتے ہیں۔

کسی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے
اِن کی نمازِ جنازہ کے لیے کوئی اعلان نہیں کیا جاتا
کیونکہ یہ نامعلوم افراد ہوتے ہیں۔

ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے
کیونکہ ہم اس سے زیادہ جاننا بھی نہیں چاہتے۔

تنویر انجم

اگر تم خود کو زندہ رکھ لیتیں

کیا وہ وقت آ گیا ہے
کہ میں اپنا موازنہ تم سے کر کے سوچوں
کہ میں نے وہ زندگی کیوں گزاری ہے
جو تمہاری ہو سکتی تھی
اگر تم زندگی کے تیز طوفانوں کے مقابل
میرے جتنے صبر سے کام لیتے ہوئے
خود کو زندہ رکھ لیتیں

اگر تم تیز بارش کے لیے
بدنما ہی سہی
اک چھتری لے لیتیں
پہلی دعوت میں
کسی کے ڈرائنگ روم کے تکلف سے نکل کر
کچن میں جانے کی عادت اختیار نہ کرتیں
بچوں کو نہلانے کے صبر آزما کام میں
وقت ضائع کرتیں
جنون میں ڈوبی ہوئی اپنی نظموں کے

مصرعوں کے درمیان
موہوم ربط کو تھوڑا گہرا کر دیتیں۔
اک محبت کے حتمی حصول میں
پندرہ دن کے بجائے
پندرہ سال لگاتیں
تو شاید تمہیں
اس زندگی کی قید کو طول دے دینا
ناممکن نہ لگتا۔

اور میں
کہیں بہت دور
کبھی بہت پہلے
کسی اور زندگی کے
تیز طوفانوں کی تاب نہ لا کر
بکھر گئی ہوتی۔

میرے بھولے بسرے خوابوں کا کوریڈور

جن کے آر پار
اندر سے باہر دیکھا جا سکتا ہے
مگر باہر سے اندر نہیں
ان سیاہ شیشوں والے
اپنے دفتر سے
میں دیکھ رہی ہوں

اپنے بھولے بسرے خوابوں کا کوریڈور

میں دیکھ رہی ہوں
لڑکیاں اور لڑکے
میرے شیشے کو آئینے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے
بال سنوارتے ہوئے
سیڑھیوں پر اوپر نیچے جانے والوں کی پرواہ کیے بغیر
جگہ گھیرے بیٹھے ہوئے
کھڑکیوں کے ساتھ بنے طاقوں پر
زور زور سے خوش گپیاں کرتے
قہقہے لگاتے ہوئے
ٹائلز والے شفاف فرش پر
دراز یا نیم دراز
کتابیں پڑھتے ہوئے
یا امتحانات کے اہم موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے
یا ڈرائنگ اسائنمنٹ کی تیاری کرتے ہوئے
واضح طور پر عشق میں گرفتار
سب سے بے نیاز، ایک دوسرے سے بے حد قریب
سرگوشیاں کرتے ہوئے
یا متوقع جدائیوں پر آنسو بہاتے ہوئے
موبائل فون پر کالز اور ایس ایم ایس کرتے ہوئے

میں دیکھ رہی ہوں
لڑکیاں اور لڑکے
زیادہ یا کم خوبصورت

زیادہ یا کم امیر
زیادہ یا کم ذہین
زیادہ یا کم بے باک

آزاد کوریڈور کے بے خوف باشندے
یہ بات جانتے ہیں
کہ سیاہ شیشوں کے دوسری طرف سے
اور کوریڈور میں چھپے کیمروں سے
انہیں دیکھا جاتا ہے
اور شاید یہ بھی
کہ وہ بہت سے لوگوں
ان کے بھولے بسرے خوابوں کا کوریڈور
دکھا رہے ہیں۔

بستر میں اک چیونٹی

جب چیونٹیوں کے باہر نکلنے کا موسم نہ ہو
کہاں سے آجاتی ہے بستر میں اک چیونٹی

اچانک ہی نظر آتی ہے
ڈبل بیڈ کی وسیع دنیا میں
بھٹکتی ہوئی
تنہائی کی ماری
واضح طور پر گھبراہٹ میں مبتلا

ایک اکیلی چیونٹی۔

میرے مطالعے میں خلل ڈالنے کے
اپنے جرم سے ناواقف
یہ بیچاری نہیں جانتی
میں نے کس تکلیف سے بچنے کے لیے
کتاب اٹھائی تھی

ایک سمت میں تیز رفتاری سے سفر کرتی ہوئی
وہ اچانک اپنی سمت تبدیل کرلیتی ہے
پھر اک اور سمت
یہ بات کھل جاتی ہے
اسے اپنی منزل کا قطعی علم نہیں ہے
نہ ہی سمت کا

میری انگلی اک خدا کی طرح
اس کا پیچھا کرتی ہے
اور جب چاہے
اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافے سے
محظوظ ہونے کے لیے
اس کے آگے پہاڑ بن کر
اسے اپنا رخ بدل کر
اور زیادہ تیز رفتاری سے بھاگنے کے لیے
مجبور کرسکتی ہے۔

میں جو ایک اذیت پسند ہوں
اس کی کسی غلطی پر
یا اس کے ساتھ کھیل سے بور ہونے کے بعد
اپنی انگلی سے اسے مسل کر
نیچے پھینک دوں گی
اور آدھی رات کو
جب نیند مجھ پر مہربان ہونے سے انکار کرے گی
تو یہ انگلی بڑھے گی
اک رخسار تک
اور ٹھہر جائے گی
اور آدھی رات کا سناٹا کہے گا
کہاں سے آ جاتی ہے
بستر میں ایک چیونٹی۔

ایک کو پکڑ لیا

بچے نے باغ میں
تتلیوں کو دیکھا
ایک کو پکڑ لیا
باقی نکل گئیں

تم نے گلی میں
محبتوں کو دیکھا
ایک کو پکڑ لیا

باقی نکل گئیں

لڑکی نے کھڑکی میں
آہٹوں کو دیکھا
ایک کو پکڑ لیا
باقی نکل گئیں

میں نے برآمدے میں
نظموں کو دیکھا
ایک کو پکڑ لیا
باقی نکل گئیں

تمھیں اجازت ہے

کیوں کرتے ہو تم
فیشن سے باہر
مصنوعی پھولوں سے
اتنی زیادہ نفرت

یہ بھر دیتے ہیں رنگ
ہمارے کمروں میں
ایسے گھروں کے
جن میں باغ نہیں ہیں
گملے نہیں ہیں

ہم رہتے ہیں مل جل کر
سو سے زائد گھروں کی
ایک عمارت میں
اجنبیوں کے ساتھ

یہ بچا لیتے ہیں
ہمیں زحمتوں سے
ہر روز مرجھانے والے
پھول خریدنے اور بدلنے کی
یا باغ رکھنے کی

تمہیں اجازت ہے
ہماری قبر پر
مصنوعی پھول رکھ دینا۔

ہو جائے اس بات پر

ہو جائے اس بات پر
ایک بازی اور
اور ہارگئی میں
جیتا ہوا کھیل

ہو جائے اس بات پر

ایک قدم اور
اور ہار گئی میں
جیتا ہوا گھر

ہو جائے اس بات پر
ایک جنگ اور
اور ہار گئی میں
جیتا ہوا ملک

ہو جائے اس بات پر
ایک جیون اور
اور ہار گئی میں
جیتی ہوئی موت۔

اسکریبل آن لائن اجنبی کے ساتھ

جب میں ایک پرانے دوست کو اک کھیل کے لیے ڈھونڈ رہی تھی مجھے اک اجنبی مل گیا، ور بار بار دعوت دی ایک کھیل شروع کرنے کی۔

اس کی باری پہلے آئی اور اس نے شروع کیا کچھ کمزور انداز میں ایک صرف سہ حرفی لفظ "man" سے میرے پاس بھی کچھ اچھے حروف نہ آئے اور اس کے لفظ کو بڑھا کر میں نے کر دیا۔ "Woman"

اس کی قسمت نے ساتھ دیا۔ "m" کے ساتھ لگا کر اس نے بنا لیا "marriage" اور اپنے ساتوں حروف استعمال کرنے پر اسے پچاس اضافی نمبر ملے۔

میں پاس "s" تھا مگر "massige" کو "massiages" بنانے کی جگہ نہیں تھی اس لیے

میں نے ''r'' کو استعمال کرتے ہوئے بنایا ''reason''

اس نے ''s'' کے ساتھ لکھا ''sex'' اور ٹرپل لیٹر پر ''x'' سے حاصل کر لیے پھر بہت سارے نمبر۔ میں نے بھی ''x'' کو استعمال کیا اور لکھا ''exit''۔

قسمت سے اسے پھر ''s'' ملا اور میرے لفظ کے آگے ''s'' لگا کر اس نے لکھا ''shut''۔

مجھے یہ لفظ اچھا نہیں لگا میں نے ''u'' سے بنایا ''unfit''۔

اس نے میرے ''f'' کے چار نمبر زائد حاصل کیے جب اس نے ''f'' سے بنایا وہ چار حرفی لفظ جسے ہم شریفانہ گفتگو میں استعمال نہیں کرتے۔

میں نے بھی ''c'' سے جواباً لکھا اک ایسا ہی لفظ جس میں ''n'' تھا اور ''t''۔

اس کے پاس آیا پھر بہت کارآمد ''s'' جس سے اس نے میرے لفظ کی جمع بنا کر اسے اور بے ہودہ بنا دیا اور مزید لکھ دیا پھر ایک سات حرفی لفظ ''lustfue'' اور دوسری بار حاصل کر لیے پچاس اضافی نمبر۔

میں کھیل میں بری طرح ہار رہی تھی سو میں نے فیصلہ کیا اپنے تمام بے کار حروف بدل دینے کا جس کے لیے مجھے اپنی باری چھوڑنا پڑی۔

اس نے پھر لکھا ''loser'' اور استعمال کر لیا آخری ''s''۔

میں نے بلینک ٹائل کو ''s'' کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ''loser'' کو بنایا ''losess'' اور لکھا ''stufid''۔

اسے جیسے ہی ''d'' ملا اس نے لکھ دیا ''dirorced'' اور ایک بار پھر حاصل کر لیے پچاس اضافی نمبر۔

میرے لیے اب کھیل میں کچھ باقی نہیں بچا تھا پھر بھی ہار مان لینا میرے لیے آسان نہیں تھا۔ کھیل کو ادھورا چھوڑ کر میں نے اسے پیغام لکھ دیا ''ہم اب اجنبی نہیں رہے۔ ہم پھر ملیں گے اور کھیل کو یہیں سے شروع کریں گے۔''

احمد آزاد

محبت کی کہانی

یہ کہانی
میں نے شروع کی تھی
لیکن اسے
ختم کرنے کا اختیار
میرے پاس نہیں ہے

ایک جلتی ہوئی تیلی میں
پورا جنگل
جلتا ہوا دکھائی دیتا ہے
یا وہ مکان
جو خوابوں سے
خالی نہیں کیا گیا

مجھے خواب دیکھنا
اور نظمیں لکھنا
کسی نے نہیں سکھایا
فی الحال میں

محبت کا ذکر نہیں کر رہا

محبت ایک نظم تک
انجانا کرب
جنگل تک بادل
اور خواب تک
تعبیر پہنچانے کے لیے
خون پسینا ایک کر دیتی ہے

ایک دریا کو
اگر پانی سے نہیں بھر جاتا
تو خون سے بھر دینا چاہیے
اور
زنگ آلود کلہاڑی
محبوبہ کو تحفتاً
بھیج دینی چاہیے
آپ کا ایک بوسہ
اس کے پاس امانت رہے گا

جس دن
کلہاڑی سے
زنگ اتارا جائے گا
محبت کی کہانی
ختم ہو چکی ہوگی۔

عبید صدیقی

☆

خوف کی زنجیر میں یا خواہشوں کے جال میں
ہم بہت الجھے رہے تقویمِ ماہ و سال میں

خون کے سیلاب میں ڈوبی ہوئی دنیا مری
جیسے جنگل جل رہا ہو آتشِ سیّال میں

موسمِ گل آئے گا تو سب پتہ چل جائے گا
جان کتنی بچ گئی ہے سبزۂ پامال میں

وقت آنے پر بتائیں گے ذرا سا صبر کر
ہم نے کیا لکھا ہے تیرے نامۂ اعمال میں

جن کے بدلے زندگی کیا موت بھی ملتی نہیں
کیسے سکّے ڈھل رہے ہیں یہ تری ٹکسال میں

دل بڑی الجھن میں ہے یہ چاہتا ہے جاننا
آج کی شب کیا کریں ہم تیرے استقبال میں

سردیوں کی دھوپ میں ٹھنڈی ہوا کے درمیاں
وہ بہت پیارا لگا تھا زعفرانی شال میں

☆

دھوپ چھن کر آ رہی ہے سایۂ اشجار سے
اور سائے میں پڑے ہیں لوگ کچھ بیمار سے

چاک دل کے ہم بھلا اس سے کرائیں کیا رفو
کام سوئی کی جگہ لیتا ہے جو تلوار سے

خوف ہے یہ پھر کہیں وہ راہ کھوٹی کر نہ دے
اس سفر میں بچ رہا ہوں سایۂ دیوار سے

میں نے آخر اس کے دل میں جو لکھا تھا پڑھ لیا
وہ چھپانا چاہتا تھا گرمیٔ گفتار سے

کھل گئے یادوں کے دفتر آج اس کو دیکھ کر
دل فسردہ ہوگیا ہے شوخیِ دیدار سے

اس کے بس کی ہی نہیں جب دوستی یا دشمنی
پھر توقع کیا کریں ہم ایک دنیادار سے

تھک گئے ہیں چلتے چلتے منزلوں کی چاہ میں
لوگ شاکی ہوگئے ہیں قافلہ سالار سے

یہ نظامِ زندگی ہوجائے گا زیر و زبر
جب زمیں گردش کرے گی اک نئی رفتار سے

کس کے گل دانوں کی زینت یہ بنیں گے کیا پتہ
پھول توڑے جا رہے ہیں دل کے لالہ زار سے

کیا یہی قسمت میں لکھا تھا ہمارے واسطے
پوچھ کر دیکھو کبھی یہ ثابت و سیّار سے

☆

سبزے کی طرح ہوتے رہے پائمال ہم
کرتے ہیں رات دن یہی اکثر ملال ہم

جو تجھ سے ہو سکے تو ہمارا جواب دے
اب تیرے سامنے ہیں مجسّم سوال ہم

ویسے تو کاروبارِ عبث میں ہیں کھو چکے
مل جائیں گے جہاں میں مگر خال خال ہم

دیوانہ کردیا تھا طلسمِ خیال نے
پھر رفتہ رفتہ ہونے لگے ہیں بحال ہم

اب خود سے بھی مکالمہ دشوار ہوگیا
پہلے کبھی نہیں رہے اتنے محال ہم

وہ جاتے جاتے ہم کو عجب کام دے گیا
دھوتے رہیں گے ہجر میں داغِ وصال ہم

لگنے لگی ہے اب یہ ہمیں قید کی طرح
توڑیں گے ایک روز تمنا کا جال ہم

آنکھوں میں بس گیا ہے کوئی اور خوب رو
گو اب بھی مانتے ہیں تجھے بے مثال ہم

دنیا کے ہر سوال پہ خاموش ہم رہے
اب اور کتنا تیرا کریں گے خیال ہم

ہم کیا کریں جو تجھ کو خبر ہی نہ ہوسکی
کچھ کم نہیں صاحبِ عزّ وکمال ہم

☆

زندگی کا نشہ کچھ زیادہ رہا
میں کہ خود سے خفا کچھ زیادہ رہا

رات سے تو شکایت بجا تھی مگر
دن سے لیکن گلہ کچھ زیادہ رہا

کیسی تاریکی تھی کم نہیں ہوسکی
روشنی میں دیا کچھ زیادہ رہا

کوئی موسم کبھی راس آیا نہیں
زخم دل کا ہرا کچھ زیادہ رہا

ایک شامِ ستم ایک صبحِ بلا
درد کا سلسلہ کچھ زیادہ رہا

☆

تجھ کو پانا ہے ترا ارمان کرنا ہے مجھے	مرحلہ دشوار ہے آسان کرنا ہے مجھے
چاند تاروں سے سجانا ہے درودیوار کو	کیا بتاؤں میں کسے مہمان کرنا ہے مجھے
کن شرائط پر کروں گا کیا تجھے معلوم ہے	زندگی تجھ سے جو اک پیمان کرنا ہے مجھے
وہ کہانی لکھ رہا ہوں جس کا آخر ایک دن	اک ادھورے خواب کو عنوان کرنا ہے مجھے

پہلے شامِ گریہ کا کرنا ہے مجھ کو انتظار
پھر ترا ماتم دلِ نادان کرنا ہے مجھے

☆

جی رہے ہیں کس لیے اس بے دلی سے	لوگ کیا نا آشنا ہیں زندگی سے
یہ جہاں میرے تصرف میں نہیں	دیکھنا پڑتا ہے کیا کیا بے بسی سے
کوئی موسم ہو سماں ہے ایک سا	رنگ خالی ہوگئے ہیں دلکشی سے
سُن رہا ہوں دل دھڑکنے کی صدا	خوف آتا ہے مجھے اس راگنی سے
کیوں لیے پھرتا ہے اے دل در بدر	باز آئے ہم تری آوارگی سے
کون اس گھر کو گیا ہے چھوڑ کر	بام و در تک ہوگئے ہیں اجنبی سے
چاند دریا کا نظارہ کر رہا ہے	اور پانی بہہ رہا ہے دلبری سے

کھو گئے ہیں گرد میں سب قافلے
راستے لگنے لگے دستِ تہی سے

☆

ذرا سوچو تمہیں کتنی پریشانی رہے گی ہمارے بعد جب محفل میں ویرانی رہے گی
یقیناً دوستوں کے سامنے شرمندگی ہوگی ہمیں اک دوسرے سے بھی پشیمانی رہے گی
یہاں جو ہو رہا ہے وہ فلک ہی جب نہ دیکھے گا زمیں بھی اپنے باشندوں سے بیگانی رہے گی
ارادہ ترک کرتے ہیں زمانے کو بدلنے کا اسی میں عافیت ہے اور آسانی رہے گی
ہم اپنی آنکھیں دنیا کے حوالے کر چکے ہیں
ہمیں معلوم تھا خوابوں کی ارزانی رہے گی

☆

صدا صحرا میں کھوتی جا رہی ہے ہوا ساکت سی ہوتی جا رہی ہے
فلک نے اس کے ذمے کر دیا ہے زمیں اک بوجھ ڈھوتی جا رہی ہے
یہ کیسی آرزو ہے جو ابھی سے خیال خام ہوتی جا رہی ہے
یہاں کس کا جنازہ اُٹھ رہا ہے یہ دنیا کس کو روتی جا رہی ہے
خزاں اب کے بہار آنے سے پہلے
دلوں میں خوف بوتی جا رہی ہے

☆

ہوا زنجیر پہنانے لگی ہے   تو کیا منزل قریب آنے لگی ہے
گھٹا چھائی تو اچھی لگ رہی تھی   مگر اب قہر برسانے لگی ہے
شگوفوں میں نمو ہونے سے پہلے   خزاں کیوں اتنا گھبرانے لگی ہے
تمہیں گر جاگنا ہو اور جاگو   مجھے تو نیند سی آنے لگی ہے
سمندر سے بلاوا آرہا ہے   یہ کشتی کس طرف جانے لگی ہے

نہ جانے اس نے ایسا کیا کیا ہے
کہ دنیا خود سے شرمانے لگی ہے

کبھی ایسا سماں دیکھا ہے تم نے؟   کہیں جشنِ خزاں دیکھا ہے تم نے؟
بجھیں گے دل تو کیا ہوگا پتہ ہے؟   چراغوں کا دھواں دیکھا ہے تم نے؟
میں دل کا حال تم کو کیا بتاؤں   کسی کو بے اماں دیکھا ہے تم نے؟
زباں پر اس کی کیا ہے جانتا ہوں   جو دل میں ہے نہاں دیکھا ہے تم نے؟

مری تنہائی کا عالم نہ پوچھو
ہجومِ رفتگاں دیکھا ہے تم نے؟

☆

دیارِ خواب سے آگے سفر کرنے کا دن ہے
تو کیا یہ قصۂ جاں مختصر کرنے کا دن ہے

بلاوا آ گیا ہے دشت سے صحرا نوردی کا
یہی تو زندگی کو ہم سفر کرنے کا دن ہے

مجھے رقصِ جنوں کرنا پڑے گا شام ہونے تک
مداراتِ ہجومِ دیدہ ور کرنے کا دن ہے

خزاں کی بدحواسی اس کے چہرے سے عیاں ہے
جہاں کو موسمِ گل کی خبر کرنے کا دن ہے

یہ خاشاکِ سماعت منتظر ہیں خاک ہونے کا
زباں کو آج اپنی شعلہ گر کرنے کا دن ہے

ہوا ہے دیدنی منظر زمیں سے آسماں کا
قفس میں آرزوئے بال و پر کرنے کا دن ہے

☆

آؤ دیکھیں اس قدر کیوں سرگرانی کر رہا ہے
کون ہے جو موت سستی خون پانی کر رہا ہے

بے اماں بے چین دنیا چاہتی ہے جاننا
اے فلک کیا تو زمیں کی پاسبانی کر رہا ہے

دل تقاضے جانتا ہے زندگی کے اس لیے
رنج میں ہوتے ہوئے بھی گل فشانی کر رہا ہے

خون گردش کر رہا ہے یا ہمارے جسم میں
کوئی دریا موج میں آ کر روانی کر رہا ہے

خوف سے سایوں کے میں اب ہر طرح آزاد ہوں
ہاں مرا ہمزاد مجھ پر مہربانی کر رہا ہے

کون ہے وہ اور کہاں ہے یہ نہیں مجھ کو خبر
اک پری چہرہ جو دل پر حکمرانی کر رہا ہے

چاند تارے دم بخود ہیں سن رہے ہیں غور سے
آسمان پر کون ہے جو قصہ خوانی کر رہا ہے

☆

جو باتیں سب کہنے سے گھبراتے ہیں
ہم کہنے پر آئیں تو کہہ جاتے ہیں

دنیا تجھ کو لاج نہیں آتی لیکن
تیرے حال پہ اکثر ہم شرماتے ہیں

ہم کو دل کی فکر ستانے لگتی ہے
شہر پہ جس دن کالے بادل چھاتے ہیں

محکوموں سے پوچھو وہ بتلائیں گے
حاکم کتنا ظلم یہاں پر ڈھاتے ہیں

اسی لئے تو اتنی افراتفری ہے
ہجو کے بدلے لوگ قصیدے گاتے ہیں

ہم لوگوں کا اناج اگانے والے بھی
روکھی سوکھی کھا کر کام چلاتے ہیں

کھیتوں میں کرتے ہیں خون پسینہ ایک
بدلے میں ہم لوگوں سے کیا پاتے ہیں

اس کے پرتو سے ہوا ہے زعفرانی رنگ کا
آئینہ تو آج بھی ہے کہکشانی رنگ کا

ہجر کے بادل چھٹے تو وصل کی تقویم میں
دل ہُویدا ہو رہا ہے گلستانی رنگ کا

پیرہن اس کا ہے ایسا یا جھلکتا ہے بدن
اک پری وش رقص میں ہے ارغوانی رنگ کا

آج کی شب خاص ہوگی جب سناؤں گا اُسے
ایک قصہ اپنا ذاتی، داستانی رنگ کا

اس کی محفل میں بنانی ہے جگہ اپنے لیے
مرحلہ دشوار ہے یہ امتحانی رنگ کا

دوستوں کی مہربانی سے ہوا یہ کام بھی
میں نے دیکھا ہی نہیں تھا خون پانی رنگ کا

گردلوں سے یوں دھواں اُٹھتا رہے گا رات دن
آسماں کیسے بچے گا آسمانی رنگ کا

ہاں اُسی نے پھول ٹانکے ہوں گے ان اشجار پر
جس نے مٹی کو دیا ہے جبہ دھانی رنگ کا

صابر وسیم

*

گم ہونے کا خوف ہو کیوں کر اِتنی بھیڑ سے ڈرنا کیا
سب کا حاصل ایک سفر ہے جینا کیا اور مرنا کیا

دل کی شاخ سے اُڑنے والا سات سمندر پار گیا
اُس کی یاد میں بیٹھے رہنا اور ہمیں اب کرنا کیا

دُوری تو تقدیر ہے لیکن کس کو کب یہ راس آئی
کچھ بیتی، کچھ بیت رہی ہے، رونا آہیں بھرنا کیا

شہر عجب ہے، لوگ ہیں اتنے ،پھر بھی تنہا لگتا ہے
سب کی اپنی تنہائی ہے شہر پہ تہمت دھرنا کیا

آخری بار ملے جب اُس سے پہلی بار کہا ہم نے
تم کو بھول نہیں پائیں گے، سچ ہے سچ سے مکرنا کیا

ہم تو یوں بھی عشق کے بہتے دریا کی ان لہروں میں
سطحِ آبِ رواں پہ خوش ہیں گہرائی میں اُترنا کیا

ہم نے اُس کا مان رکھا اور اپنے دل کو سمجھایا
جس رستے کو چھوڑ چکے ہیں اس رستے سے گزرنا کیا

نا ملنے پر اُس نے ہم کو دھمکی دی ہے، دھمکی میں
پہلا ''ورنہ'' ٹھیک ہے لیکن دوسری بار یہ ''ورنہ'' کیا

*

سیرِ باغ سے جب بھی واپس آتا ہوں
اپنے اندر آگ دہکتی پاتا ہوں
میں اس شہر کی بھیڑ میں شامل ہوکے بھی
تنہائی کی شدت سے مر جاتا ہوں
دن بھر زخم بھرا کرتا ہوں جھولی میں
رات گئے پھر ان سے پھول کھلاتا ہوں
دیکھا نہیں ہے اس کو اب تک خود میں نے
لیکن سب کو اس کے خواب دکھاتا ہوں
آئے نہ آئے اُس کی مرضی ہے صابرؔ
میں تو اپنے فرش و بام سجاتا ہوں

*

رہتے ہیں کچھ لوگ ہمارے سات سمندر پار
روتے ہیں بے آنسو سارے سات سمندر پار

ساتھ ہمارے رکھا اُس نے ریت بھرا صحرا
بادل، بوندیں، پھول اتارے سات سمندر پار

خوب نکھرتے، خوب دمکتے، خوب چمکتے ہیں
اپنے گھر کے چاند ستارے سات سمندر پار

وصل کے خواب سجائے اپنی سونی آنکھوں میں
کیا کیا سب نے ہجر گزارے سات سمندر پار
سات سمندر پار سے جب بھی آتا ہے پیغام
جاتے ہیں اِس دل کے شرارے سات سمندر پار

جانے والے جیسے بھیڑ میں گم ہو جاتے ہیں
آخر کیسے ہیں نظّارے سات سمندر پار

سات سمندر پار تو سب نے جیت لیا میلہ
لیکن ہم جو بازی ہارے سات سمندر پار

آخر آخر ہو جاتا ہے وہیں کی رزقِ خاک
اپنوں کو اب کون پکارے سات سمندر پار

*

اس نگر کی تمنا سواروں میں ہے
جو کہیں بھی نہیں خواب زاروں میں ہے
آگ سی اک بھڑکتی ہے دل کے تئیں
کس بلا کا فسوں ماہ پاروں میں ہے
ملکۂ دل رُبا! تجھ کو معلوم کیا

ایک عاشق بھی تیرے کہاروں میں ہے
جس میں کم خواب تھے، اطلسی فرش تھا
وہ شبستاں ابھی ریگ زاروں میں ہے
جو تری جستجو میں بہایا گیا
اس لہو کی چمک بھی نظاروں میں ہے
جس کو دیکھے بنا چین آتا نہیں
کوئی ایسا ترے پاس داروں میں ہے
منتظر منزلیں بے نشاں ہو گئیں
حُسن کا قافلہ رہ گزاروں میں ہے
کون آیا ہے اور کون رخصت ہوا
اک نئی بے کلی دل فگاروں میں ہے
اُس کی رہداریوں میں خموشی ہے کیوں؟
ایک تشویش قصہ نگاروں میں ہے
فخر کر اپنی تقدیر پہ فخر کر
ایک شاعر ترے جاں نثاروں میں ہے

*

شور نہ ہو تو خاموشی کے سائے ڈرانے لگتے ہیں
سنّاٹے تنہائی میں طوفان اٹھانے لگتے ہیں

شام کی نرم ہَوا چلتے ہی سینے میں دم گھٹتا ہے
یاد کے جھونکے اس دل پر دیوار گرانے لگتے ہیں

برسوں بعد ملا کرتے ہیں، ملتے ہیں ، چپ رہتے ہیں
چپ رہتے ہیں اور آنکھوں سے اشک بہانے لگتے ہیں

ریل کے چلتے ہی لوگوں میں دکھ کی لہر سی اٹھتی ہے
کچھ پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں کچھ ہاتھ ہلانے لگتے ہیں

ماضی کی اک یاد لیے میں روز ادھر سے جاتا ہوں
ہر بار وہ ساکت بام و در کچھ اَور پرانے لگتے ہیں

دل جوئی کا دھوکا دے کر تیرے شہر کے منصب دار
نوحہ گروں کو رونے کے آداب سکھانے لگتے ہیں

اندھیارے جب گھرے ہوں تو ہم جیسے کچھ دیوانے
اپنے گھر کو آگ لگا کر جشن منانے لگتے ہیں

عرفان ستار

☆

بام پر جمع ہَوا، ابر، ستارے ہوئے ہیں
یعنی وہ سب جو ترا ہجر گزارے ہوئے ہیں

شوقِ واماندہ کو درکار تھی کوئی تو پناہ
سو تمھیں خلق کیا، اور تمہارے ہوئے ہیں

حوصلہ دینے جو آتے ہیں، بتائیں انھیں کیا؟
ہم تو ہمت ہی نہیں، خواب بھی ہارے ہوئے ہیں

روزنِ چشم تک آ پہنچا ہے اب شعلۂ دل
اشک پلکوں سے چھلکتے ہی شرارے ہوئے ہیں

زندگی، ہم سے ہی روشن ہے یہ آئینہ ترا
ہم جو مشاطۂ وحشت کے سنوارے ہوئے ہیں

خود شناسی کے، محبت کے، کمالِ فن کے
سارے امکان اُسی رنج پہ وارے ہوئے ہیں

ڈر کے رہ جاتے ہیں کوتاہیٔ اظہار سے چپ
ہم، جو یک رنگیٔ احساس کے مارے ہوئے ہیں

ہم کہاں ہیں، سرِ دیوارِ عدم، نقشِ وجود
اُن نگاہوں کی توجہ نے ابھارے ہوئے ہیں

بڑھ کے آغوش میں بھر لے ہمیں اے رُوحِ وصال
آج ہم پیرہنِ خاک اُتارے ہوئے ہیں

☆

ترے جمال سے ہم رُونما نہیں ہوئے ہیں
چمک رہے ہیں، مگر آئینہ نہیں ہوئے ہیں

بتا نہ پائیں تو خود تم سمجھ ہی جاؤ کہ ہم
بلا جواز تو بے ماجرا نہیں ہوئے ہیں

دھڑک رہا ہے تو اک اسم کی ہے یہ بَرکت
وگرنہ واقعے اس دل میں کیا نہیں ہوئے ہیں

ترا کمال، کہ آنکھوں میں کچھ، زبان پہ کچھ
ہمیں تو معجزے ایسے عطا نہیں ہوئے ہیں

یہ مت سمجھ، کہ کوئی تجھ سے منحرف ہی نہیں
ابھی ہم اہلِ جنوں لب کشا نہیں ہوئے ہیں

خود آگہی بھی کھڑی مانگتی ہے اپنا حساب
جنوں کے قرض بھی اب تک ادا نہیں ہوئے ہیں

بنامِ ذوقِ سخن خود نمائی آپ کریں
ہم اس مرض میں ابھی مبتلا نہیں ہوئے ہیں

ہمی وہ، جن کا سفر ماورائے وقت و وجود
ہمی وہ، خود سے کبھی جو رہا نہیں ہوئے ہیں

کسی نے دل جو دُکھایا کبھی تو ہم عرفانؔ
اُداس ہوگئے، لیکن خفا نہیں ہوئے ہیں

کاشف حسین غائرؔ

*

دن کہاں اب وہ مزے داری کے دن
کاٹتا ہوں گھر میں بے کاری کے دن

کس لیے یہ خواہشِ ترکِ سفر
اور وہ بھی عین تیاری کے دن

دھوپ میں بیٹھی ہوئی روتی تھی دھوپ
حشر برپا تھا شجر کاری کے دن

دل کو دنیا کی ضرورت پڑگئی
ایک دن، اپنی طرف داری کے دن

اب تو کاٹے سے نہیں کٹتا ہے وقت
کیا ہوئے وہ تیز رفتاری کے دن

میں تو آوازوں میں بٹ کر رہ گیا
خوش کہاں آئے صدا کاری کے دن

*

کسی کو کچھ، کسی کو کچھ بتاتے
وہ ملتا تو اسی کو کچھ بتاتے

ہماری بات جو سنتی وہ دل سے
تو ہم بھی بے دلی کو کچھ بتاتے

اگر ہوتے در و دیوار اپنے
در و دیوار ہی کو کچھ بتاتے

ہمی جاگے نہیں اُس رات ورنہ
ستارے کیوں کسی کو کچھ بتاتے

ہماری ہم زباں تھی، رازداں تھی
مگر کیا خامشی کو کچھ بتاتے

کھلا، دہلیز سے احوال گھر کا
دریچے کیوں گلی کو کچھ بتاتے

لیے بیٹھی تھی وہ اپنی کہانی
سو کیا دیرانگی کو کچھ بتاتے

ہمیں معلوم ہی کچھ کب تھا غائرؔ
جو ہم اِس زندگی کو کچھ بتاتے

*

سُن کے میری کہانی کو
دُکھ پہنچا ویرانی کو

ڈھانپ سکیں گی پلکیں کیا
منظر کی عریانی کو

تشنہ لبی سے پیاس بجھا
آگ لگا دے پانی کو

مشکل ہی سے سمجھا ہوں
دنیا کی آسانی کو

آئینے سے ملیے اور
کم کیجے حیرانی کو

اک صحرا سے نسبت ہے
دل کی اِس طغیانی کو

تتلی باغ میں آنکلی
پھولوں کی نگرانی کو

یاد کرے گا زنداں بھی
مجھ ایسے زندانی کو

*

تیرا خیال، تیری تمنا تک آ گیا
میں دل کو ڈھونڈتا ہُوا دنیا تک آ گیا

کیا اِتنا بڑھ گیا مری تشنہ لبی کا شور
سیلاب دیکھنے مجھے صحرا تک آ گیا

لیکن خزاں کی نذر کیا آخری گلاب
ہر چند اس میں مجھ کو پسینا تک آ گیا

آگے رہِ فراق میں آنا ہے اَور کیا
آنکھوں کے آگے آج اندھیرا تک آ گیا

کیا ارتقا پذیر ہے انسان کا ضمیر
رشتوں کو چھوڑ چھاڑ کے اشیا تک آ گیا

لیکن کسی دریچے سے جھانکا نہ کوئی رات
سُن کے مری پکار ستارہ تک آ گیا

کاشفؔ حسین یار اٹھو، اب تو چل پڑو
چل کے تمھارے پاؤں میں رستا تک آ گیا

جان برگر
ترجمہ: احمد مشتاق

اگر مَیں لفظ ہوتا

(جنوری ۲۰۰۲ء)

جمعہ۔

ناظم، میں سوگ میں ہوں اور تمہیں بھی اس سوگ میں شریک کرنا چاہتا ہوں، جیسے تم ہمیں شریک کیا کرتے تھے اپنی بہت سی امیدوں اور بہت سی سوگواریوں میں۔

رات کے وقت تار آیا
صرف تین لفظ:
''وہ مر گیا''

میں اپنے دوست وان مُونو کا سوگ منا رہا ہوں، ایک نہایت عمدہ فنکار، جو مجسمے بناتا تھا اور چبوترے، اور جو کل مر گیا اسپین کے ایک ساحل پر، اڑتالیس برس کی عمر میں۔

میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایک بات جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے: قدرتی موت کے بعد، اگر مرنے والا ایک طویل عرصے تک بیمار نہ رہا ہو، پہلے تو صدمہ ہوتا ہے، پھر ایک انتہائی خوف ناک احساسِ زیاں، خاص طور پر جب وہ شخص جوان ہو۔

''پو پھٹ رہی ہے
لیکن میرا کمرہ
ایک لمبی رات سے تعمیر کیا گیا ہے''

پھر درد، جو خود کہتا ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ تاہم اس درد کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز مخفی

طور پر لگی ہوتی ہے جس پر ٹٹھول کا گمان ہوسکتا ہے لیکن وہ ٹٹھول ہوتی نہیں (وان ایک اچھا ٹٹھولیا تھا) کوئی گمراہ کن چیز، کسی شعبدہ باز کے کرتب کے بعد اس کے رومال کے اشارے سے تھوڑی مماثل، آدمی جو محسوس کر رہا ہوتا ہے اس کے بالکل برعکس ایک طرح کی خوش وضعی۔ تم سمجھ گئے ہو، نا کہ میرا کیا مطلب ہے؟ تم سے یہ پوچھنے کے کوئی پانچ منٹ بعد مجھے میرے بیٹے یولیس کا ایک فیکس موصول ہوا جس میں یہ چند مصرعے بھی تھے جو اس نے وان کے لیے لکھے تھے:

تم ہمیشہ آئے، ایک قہقہہ اور ایک نیا کرتب لے کر
تم ہمیشہ غائب ہوئے، چھوڑ کر اپنے ہاتھ ہماری میز پر
تم غائب ہو گئے ہو
اپنے پتے، ہمارے ہاتھوں میں چھوڑ کر
تم ایک بار پھر آ ؤ گے
ایک نئے قہقہے کے ساتھ
جو ایک کرتب ہو گا۔

اتوار۔

مجھے یقین نہیں کہ میں نے ناظم حکمت کو کبھی دیکھا ہو لیکن میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے اُسے دیکھا ہے اگرچہ میرے پاس کوئی مبنی پر قرائن شہادت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لندن کا واقعہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں، اُس کے جیل سے رہا ہونے کے تین سال بعد اور اس کی موت سے نو سال پہلے۔ وہ ایک سیاسی جلسے میں تقریر کر رہا تھا جو ریڈ لائن اسکوائر میں منعقد ہوا تھا۔ اُس نے چند الفاظ کہے اور پھر کچھ نظمیں سنائیں۔ کچھ انگریزی میں اور باقی ترکی زبان میں۔ اس کی آواز میں توانائی تھی اور سکون۔ وہ ایک انتہائی ذاتی اور بڑی سُریلی آواز تھی۔ لیکن وہ اس کے گلے سے آتی ہوئی یا اس لمحے اس کے گلے سے آتی ہوئی نہیں لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے اپنے سینے میں ریڈیو لگا رکھا ہو جسے وہ اپنے بڑے بڑے اور تھوڑا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کبھی کھولتا تھا اور کبھی بند کر دیتا تھا۔ میں اس منظر کو ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر پا رہا کیونکہ اس کی موجودگی اور خلوص دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ایک طویل نظم میں وہ ۱۹۴۰ء کے شروع میں ترکی میں چھ اشخاص کو ریڈیو پر شوسٹا کووچ کی ایک سمفنی کو سنتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ اُن چھ سے تین (اس کی طرح) جیل میں

ہیں۔ نشر یہ زندہ سنایا جارہا ہے۔ سمفنی عین اسی لمحے ہزاروں کلومیٹر دور ماسکو میں بجائی جارہی ہے۔
ریڈ لائن اسکوائر میں اس کی نظموں کو سُنتے ہوئے میرا تاثر یہ تھا کہ وہ الفاظ بھی جو اس وقت اس کے مُنھ سے نکل رہے تھے کہیں دنیا کی دوسری جانب سے آرہے تھے اس لیے نہیں کہ اُن کا سمجھنا مشکل تھا (مشکل وہ نہیں تھے) نہ اس لیے کہ وہ افسردہ اور دھندلائے ہوئے تھے (وہ تحمل کی صلاحیت سے بھرپور تھے) بلکہ اس لیے کہ وہ فاصلوں پر فتح پانے اور بے انت جدائیوں سے ماورا ہونے کے لیے کہے جارہے تھے اُس کی تمام نظموں کا ''یہاں'' کہیں اور ہے۔

''<u>پراگ میں ایک گاڑی</u>
ایک یک اسپی ویگن
یہودیوں کے پرانے قبرستان سے گزر رہی ہے
گاڑی بھری ہوئی ہے
کسی اور شہر کی آرزوؤں سے
میں گاڑی بان ہوں۔''

اس وقت بھی جب وہ چبوترے پر بیٹھا تھا، نظمیں سنانے کے لیے اُٹھنے سے پہلے، وہ ایک لمبا تڑنگا اور لحیم شحیم شخص نظر آرہا تھا۔ اس کو ''نیلی آنکھوں والا درخت'' کے نام سے یونہی تو نہیں پکارتے تھے۔ وہ جب کھڑا ہوا تو بہت سبک خرام بھی لگتا تھا۔ اتنا ہلکا پھلکا کہ ڈر لگتا تھا کہیں اُڑ نہ جائے ہوا میں — شاید میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اس لیے کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بین الاقوامی امن تحریک کے جلسے میں ناظم حکمت کو طنابوں کے ساتھ باندھ کر رکھا جاتا۔ تا کہ وہ زمین سے بندھا رہے۔ پھر بھی یہ میری واضح یاد ہے الفاظ اس کے مُنھ سے نکلنے کے بعد آسمان کی طرف اُٹھ رہے تھے — یہ جلسہ کھلے میں ہو رہا تھا — اس کا جسم اس کے لکھے ہوئے الفاظ کی پیروی کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ الفاظ بلندیوں کی طرف اُڑتے چلے جارہے تھے۔ چوک کے اوپر۔ اُن یک وقتی ٹراموں کی چنگاریوں کے اوپر، جنہیں تین چار برس پہلے تھیوبالڈ روڈ کے کنارے کنارے روک دیا گیا تھا۔۔۔

''تم ایک پہاڑی گاؤں ہو
اناطولیہ میں
تم میرے شہر ہو

انتہائی خوبصورت اور انتہائی ناخوش
تم ایک پکار ہو مدد کے لیے—
میرا مطلب ہے تم میرا وطن ہو
تمہاری طرف دوڑتے ہوئے قدم میرے ہیں"

پیر کی صبح۔

تقریباً تمام معاصر شعرا کو، جو میری طویل زندگی میں، میرے لیے اہم رہے ہیں، میں نے ترجمے میں پڑھا ہے اُن کی اصلی زبانوں میں بہت ہی کم۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات بیسویں صدی سے پہلے والے زمانے میں کہنا ممکن نہ ہوتا۔ یہ بحث کہ کسی ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ترجمہ ہو سکتا ہے یا نہیں، صدیوں سے جاری ہے۔ لیکن یہ تمام خلوت گاہی بحثیں تھیں— خلوت گاہی موسیقی کی طرح۔ بیسویں صدی کے دوران اکثر خلوت گاہیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ اظہار کے نئے وسائل۔ عالمی سیاست۔ امپیریلزم۔ عالمی منڈیاں وغیرہ نے کروڑوں لوگوں کو اکٹھا کیا اور کروڑوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ بلا امتیاز اور اس انداز میں جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور اس کے نتیجے میں شاعری کی توقعات بھی بدل گئیں۔ بہترین شاعری زیادہ بلکہ اور زیادہ ان قارئین پر انحصار کرنے لگی جو بہت دور تھے بہت ہی دور۔

"ہماری نظموں کو چاہیے
سڑک کے کنارے
قطار بنالیں
میلی پتھروں کی طرح"

بیسویں صدی کے دوران شاعری کے کئی برہنہ مصرعے مختلف براعظموں کے درمیان تنے ہوئے تھے۔ بے یار و مددگار دیہاتی علاقوں اور دور دراز دارالحکومتوں کے درمیان۔

تم سب یہ جانتے ہو، تم سب: حکمت، بریخت، ولیجو، اتلا جوزف، اڈونس، وان گیلمان۔۔۔

پیر کی دوپہر۔

میں اٹھارہ اُنیس برس کا تھا جب میں نے پہلی بار ناظم حکمت کی نظمیں پڑھیں۔ جو لندن

سے شائع ہونے والے ایک غیر معروف بین الاقوامی ادبی ریویو میں چھپی تھیں جسے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی۔ میں اس ریویو کا ایک باقاعدہ قاری تھا۔ شاعری کے بارے میں پارٹی لائن تو انتہائی فضول تھی لیکن اس میں شائع ہونے والی کہانیاں اور نظمیں اکثر دل کو لگتی تھی۔ اس وقت تک میئر ہولڈ کو ماسکو میں گولی مار کر ہلاک کیا جاچکا تھا۔ اگر آج مجھے میئر ہولڈ بطورِ خاص یاد آرہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ناظم حکمت اُس کا بڑا مداح تھا اور جب وہ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں پہلی بار ماسکو گیا تو اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ کہتا ہے ''میں میئر ہولڈ کے تھیٹر کا بڑا احسان مند ہوں۔ ۱۹۲۵ء میں ترکی واپس آکر میں نے استنبول کے صنعتی علاقے میں پہلے ورکرز تھیٹر کو منظم کیا۔ اس تھیٹر میں لکھاری اور ہدایت کار کے طور پر کام کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ یہ میئر ہولڈ ہی تھا جس نے ہمارے لیے تماشائیوں کی خاطر اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے امکانات کو اجاگر کیا۔'' ۱۹۳۷ء میں انہی نئے امکانات کی وجہ سے اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن لندن میں ریویو کے قارئین کو ابھی یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔

جب میں نے حکمت کی نظموں کو پہلی بار دریافت کیا تو جس چیز نے مجھے چونکایا وہ ان نظموں کی فضائے بسیط تھی۔ اس وقت تک میں نے جتنی بھی شاعری پڑھی تھی اس کے مقابلے میں زیادہ فضا کی حامل تھیں۔ وہ فضا کو بیان نہیں کرتی تھیں، اس میں سے گزر کر آئی تھیں پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی۔ وہ عمل یا چارہ جوئی کے بارے میں تھیں۔ ان میں شکوک، تنہائی، موت اور اداسی کا بیان تھا لیکن یہ احساسات عمل کا متبادل بننے کی بجائے خود عمل کا تقاضہ کرتے تھے۔ فضا اور عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کا نقیض (Antithesis) جیل خانہ ہے اور یہ ترکی کے جیل خانے تھے جن میں ایک سیاسی قیدی کے طور پر اس نے اپنی زندگی کا آدھے سے زیادہ کام مکمل کیا۔

بدھ وار۔

ناظم، میں تم سے اس میز کا احوال بیان کرنا چاہتا ہوں جس پر میں اس وقت بیٹھا لکھ رہا ہوں یہ ایک سفید رنگ کی دھاتی گارڈن ٹیبل ہے بالکل ویسی جیسی آجکل باسفورس کے ساحل پر واقع یالی کے سرسبز احاطوں میں پڑی نظر آجاتی ہیں۔ یہ والی ایک چھوٹے سے گھر کے چھتے ہوئے برآمدے میں رکھی ہے۔ یہ گھر پیرس کے جنوب مشرق کے مضافاتی علاقے میں ہے اور ۱۹۳۸ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس زمانے میں اسی نمونے کے بہت سے مکانات اہلِ حرفہ کے لیے، تاجروں اور

ہنرمند کاریگروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں تم جیل میں تھے۔ تمہارے بستر کے اوپر ایک گھڑی کیل کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ تمہارے وارڈ کے اوپر والے وارڈ میں تین ڈاکو اپنی موت کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔

اس میز پر ہمیشہ ہی بہت سے کاغذات بکھرے ہوتے ہیں۔ ہر صبح کوفی کے گھونٹ بھرتے ہوئے میں انہیں سلیقے سے واپس ان کی جگہ پر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے دائیں طرف گملے میں ایک پودا ہے جو مجھے معلوم ہے کہ تمہیں پسند آئے گا۔ اس کے بڑے گہرے رنگ کے پتّے ہیں۔ زیریں سطح کا رنگ آلو بخارے جیسا ہے۔ بالائی سطح پر روشنی پڑنے کی وجہ سے سیاہی مائل بھورے رنگ کے دھبّے سے بن گئے ہیں۔ تین تین پتّے اکٹھے ہیں جیسے رات کی تتلیاں ہوں — اور ان کا حجم بھی تتلیوں جتنا ہے — ایک ہی پھول سے غذا حاصل کرتی ہوئی — پودے کے اپنے پھول تو بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ گلابی اور اتنے معصوم جیسے پرائمری اسکول میں گانا سیکھتے بچوں کی آوازیں۔ یہ ایک طرح کی بہت قد آور تپتیا گھاس ہے۔ یہ خاص پودا پولینڈ سے لایا گیا تھا۔ جہاں اسے کونی زائنا کہا جاتا ہے۔ مجھے یہ پودا میرے ایک دوست کی ماں نے دیا تھا جس نے اسے یوکرین کی سرحد کے قریب اپنے باغ میں اُگایا تھا۔ اُس کی دل میں کُھبنے والی نیلی آنکھیں ہیں اور جب وہ اپنے باغ سے گزرتی ہے یا گھر کے گرد چکر لگاتی ہے تو اپنے پودوں کو چُھوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ جیسے بعض نانیاں دادیاں اپنے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرنے سے باز نہیں آتیں۔

”میری پیاری، میری گلاب
پولینڈ کے میدانوں میں، میرا سفر شروع ہو چکا ہے
میں ایک ننھا لڑکا ہوں، حیران اور مسرور
ایک ننھا لڑکا اپنی پہلی باتصویر کتاب کو دیکھتا ہوا
جس میں تصویریں ہیں لوگوں کی جانوروں کی
اشیا کی اور پودوں کی۔“

داستان گوئی میں ہر چیز کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ایک واقعے کے بعد کیا واقع ہوتا ہے اور حقیقی تسلسل بمشکل ہی ظاہر ہوتا ہے۔ تجربہ اور غلطی۔ اکثر کئی بار۔ اسی لیے قینچی اور اسکاچ ٹیپ کی چرخی بھی میز پر رکھی ہیں۔ ٹیپ کو چرخی میں نہیں بٹھایا یا تاکہ اسے آسانی سے کاٹا جا سکے۔

ٹیپ کو قینچی سے کاٹنا ہوتا ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب یہ پتہ نہیں چلتا کہ ٹیپ کا سِرا کہاں ہے اور پھر اسے کھولنا۔ میں بڑی بے صبری کے ساتھ جھنجھلاتے ہوئے اپنے ناخنوں سے سِرا تلاش کرتا ہوں اور آخرکار جب یہ ایک بار میری پکڑ میں آجاتا ہے تو میں اسے میز کے کنارے پر چپکا دیتا ہوں اور ٹیپ کو کھلتے چلے جانے دیتا ہوں جب تک کہ وہ فرش کو چھو نہیں لیتی۔ پھر میں اُسے وہیں لٹکتا چھوڑ دیتا ہوں۔

بعض اوقات میں برآمدے سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ جہاں میں باتیں کرتا ہوں یا کھاتا ہوں یا اخبار پڑھتا ہوں۔ کچھ دن پہلے میں اس کمرے میں بیٹھا تھا کہ مجھے کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی دکھائی دی۔ جھلملاتے ہوئے پانی کی ایک مہین سی آبشار گر رہی تھی۔ برآمدے کے فرش کی جانب لہریں بناتی، میری میز کے سامنے پڑی میری خالی کرسی کی ٹانگوں کے قریب۔ الپس کے ندی نالوں کا آغاز بھی اسی طرح قطرہ قطرہ ہوا تھا۔ کھڑکی میں سے آتی موج ہوا میں، لرزتی ہوئی اسکاچ ٹیپ کی چرخی، کبھی کبھی پہاڑوں کو ہلا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

جمعرات کی شام۔

کوئی دس برس پہلے، استنبول میں، حیدر پاشا اسٹیشن کے قریب میں ایک عمارت کے سامنے کھڑا تھا جہاں پولیس ملزموں سے پوچھ گچھ کرتی تھی۔ یہاں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا اور ان پر جرح کی جاتی تھی، بعض اوقات ہفتوں، بالائی منزل پر۔ ۱۹۳۸ء میں اسی جگہ ناظم حکمت پر جرح کی گئی تھی۔ اس عمارت کو جیل خانے کے طور پر نہیں بلکہ ایک بہت بھاری انتظامی قلعہ بندی کے طور پر بنایا گیا تھا۔ یہ ناقابلِ شکست و ریخت لگتی ہے اور اس کی تعمیر میں اینٹوں اور خاموشی کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ اس طور پر بنائے ہوئے جیل خانوں کی فضا میں ایک قسم کی نحوست لیکن اکثر خوف زدگی بھی ہوتی ہے جو ایک طرح کی دفع الوقتی کا تاثر بھی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ''برصا'' کی جیل، جس میں حکمت نے دس برس کاٹے، ''سنگی ہوائی جہاز'' کے نام سے جانی جاتی تھی اپنے بے ہنگم پھیلاؤ کی وجہ سے۔ اس کے برعکس وہ پختہ مزاج قلعہ بندی جس کو میں استنبول میں اسٹیشن کے قریب کھڑا دیکھ رہا تھا اس میں ایک ''خاموشی کی یادگار'' کی سی خود اعتمادی اور طمانیت پائی جاتی تھی۔

''جو کوئی بھی اس کے اندر ہے اور یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے — عمارت بڑے نپے تلے لہجے میں اعلان کر رہی تھی — بھلا دیا جائے گا۔ ریکارڈ سے نکال دیا جائے گا، دفن کر دیا جائے گا

یوروپ اور ایشیا کے درمیان ایک شگاف میں ہ'' اس وقت میری سمجھ میں آئی اُس کی شاعری کی انوکھی اور ناگزیر حکمت عملی: اسے اپنی اسیری کو مسلسل جُل دینا تھا! ہر جگہ کے قیدیوں نے ہمیشہ عظیم فرار کا خواب دیکھا ہے لیکن حکمت کی شاعری نے ایسا خواب نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے آغاز سے پہلے ہی دنیا کے نقشے پر، جیل خانے کے لیے ایک چھوٹا سا نقطہ لگا دیا تھا۔

انتہائی خوب صورت سمندر
ابھی عبور نہیں کیا گیا
انتہائی خوب صورت بچہ
ابھی بڑا نہیں ہوا
اپنے انتہائی خوب صورت دن
ہم نے ابھی نہیں دیکھے
اور جو انتہائی خوب صورت الفاظ میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں
ابھی میں نے نہیں کہے
انہوں نے ہمیں قیدی بنا لیا ہے
ہمیں جیل میں ڈال دیا ہے
مجھے دیواروں کے اندر
تمہیں باہر
لیکن تو کچھ بھی نہیں
بدترین بات وہ ہوتی ہے
جب لوگ، دانستہ یا غیر دانستہ
اپنے اندر جیل خانہ لیے پھرتے ہیں......

اکثر لوگوں کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے، دیانت دار، محنتی اور بھلے مانس لوگوں کو جو حق دار ہیں اتنی ہی محبت کے جتنی میں تم سے کرتا ہوں۔

اُس کی شاعری، جیومیٹری کی پرکار کی طرح دائرے کھینچتی تھی، کبھی انتہائی ذاتی کبھی کشادہ اور کائناتی صرف اس کی تیز نوک جیل کی کوٹھڑی میں نصب ہوتی تھی۔

جمعہ کی صبح۔

ایک بار میں میڈرڈ کے ایک ہوٹل میں وان مُونو کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے آنے میں دیر کر دی تھی۔ کیونکہ، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، جب وہ رات کو اپنے محنت طلب کام میں مصروف ہوتا تھا تو اس کا حلیہ دیکھنے والا ہوتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کاروں کے نیچے کام کرنے والا کوئی مکینک ہو۔

اُسے ملنے کا وقت ہی یاد نہیں رہا تھا۔ آخر جب وہ آیا تو میں نے اُسے ''کمر کے بل کار کے نیچے لیٹنے والا'' کہہ کر چھیڑا۔ بعد میں اس نے مجھے ایک دل لگی بازی کا فیکس بھیجا جو میں تمہیں بھیجنا چاہتا ہوں، ناظم۔ پتہ نہیں کیوں۔ ہوسکتا ہے ''کیوں'' میرا دردِ سر ہی نہ ہو۔ میں تو محض ایک ڈاکیے کا کردار ادا کر رہا ہوں دو مردہ آدمیوں کے درمیان۔

''میں تم سے اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں— میں ایک ہسپانوی مکینک ہوں (صرف کاروں کا، موٹر سائیکلوں کا نہیں) جو اپنا بیشتر وقت انجن کے نیچے کمر کے بل لیٹ کر اسے ڈھونڈھنے میں صرف کرتا ہے! لیکن— اور یہ ایک اہم مسئلہ ہے— میں کبھی کبھی آرٹ کا کام بھی کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں کوئی فن کار ہوں۔ نہیں۔ لیکن میں چکنائی دار کاروں کے نیچے رینگنے کی بیہودگی سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں اور فن کی دنیا کا کیتھ رچرڈ بننا چاہتا ہوں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پادریوں کی طرح کام کرنا، صرف آدھا گھنٹہ اور انگوری شراب کے ساتھ—

یہ میں تمہیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ دو دوست (ایک پورٹو میں اور اور ایک روٹرڈیم میں) تمہیں اور مجھے دعوت دینا چاہتے ہیں ''بوائے مین کار میوزیم'' کے تہ خانے میں اور پورٹو کے پرانے شہر کے دوسرے سردابوں (Cellars) میں (جہاں ممکن ہے زیادہ شراب ہو)۔

انہوں نے لینڈ اسکیپ کا بھی کچھ ذکر کیا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لینڈ اسکیپ! میرے خیال میں، ہوسکتا ہے اس سے اُن کی مراد کار چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر رکھنے سے ہو یا اِدھر اُدھر نظر ڈالتے ہوئے کار چلانے سے۔ معاف کیجیے گا جناب، ابھی ابھی ایک اور گاہک اندر آیا ہے واؤ! ٹرائمف سپٹ فائر''

مجھے اسٹوڈیو میں وان کا قہقہہ گونجتا سنائی دے رہا ہے جہاں وہ اپنے خاموش پیکروں کی معیت میں اکیلا ہے۔

جمعہ کی شام۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ بیسویں صدی کی عظیم ترین نظموں میں سے کئی — چاہے وہ عورتوں کی لکھی ہوئی ہوں چاہے مردوں کی — اُخوت سے اتنی مملو ہیں کہ شاید ہی ان کی کوئی مثال موجود ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کا تعلق سیاسی نعروں سے ہرگز نہیں۔ اس کا اطلاق رِلکے پر ہوتا ہے جو غیرسیاسی تھا، بورخیس پر جو ایک رجعت پسند تھا اور حکمت پر جو زندگی بھر کا اشتراکی تھا۔ ہماری صدی میں ایسے ایسے قتلِ عام ہوئے ہیں تاریخ میں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ تاہم اس صدی نے جس مستقبل کا خواب دیکھا (اور کبھی کبھی اس کے لیے جنگ بھی لڑی) وہ ایک باہمی رشتۂ اخوت کا منصوبہ تھا۔ اس سے پہلے کی بہت ہی کم صدیوں نے ایسا منصوبہ پیش کیا ہوگا۔

"یہ لوگ، دینو،
جن کے ہاتھوں میں روشنی کی دھجیاں ہیں
کہاں جا رہے ہیں یہ
اس اندھیرے میں، دینو؟
تم، میں بھی:
ہم اُن کے ساتھ ہیں، دینو
ہم نے بھی دینو
دیکھ لی ہے جھلک، نیلے آسمان کی۔"

سوموار۔

شاید، ناظم، میں اس بار بھی تمھیں نہیں دیکھ رہا لیکن میں قسمیہ کہتا ہوں کہ تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ تم برآمدے والی میز کے اُس طرف میرے سامنے بیٹھے ہو۔ کیا کبھی غور کیا ہے تم نے کہ ایک سر کی بناوٹ اُس کے اندر عادتاً جاری سوچ کے انداز کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے؟ بعض سر ایسے ہوتے ہیں جو بے دردی کے ساتھ بتاتے رہتے ہیں جمع تفریق کی رفتار کو۔ دوسرے پرانے افکار پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنے کا تاثر دیتے ہیں۔ اس زمانے میں بیشتر سر احساسِ زیاں کے ادراک سے عاری نظر آتے ہیں۔ تمہارا سر — اس کا قد و قامت اور تمہاری متوالی نیلی آنکھیں — مختلف آسمانوں والی کئی دنیاؤں کی بقائے باہمی کا اظہار کرتا ہے۔ ایک دوسرے میں شامل، ایک دوسرے

کے اندر، ڈرانے دھمکانے سے گریزاں، پُرسکون، لیکن پُرہجوم۔

میں تم سے اِس عہد کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جس میں ہم آج موجود ہیں۔ جن باتوں پر تمھیں یقین تھا کہ تاریخ میں وقوع پذیر ہو رہی تھیں یا انہیں ہونا چاہیے، ان میں سے بیشتر نظر کا دھوکہ ثابت ہوئیں۔ جس اشتراکیت کا تصور تمہارے ذہن میں تھا اس پر اب کہیں بھی عمل نہیں ہو رہا۔ منظم سرمایہ دارانہ نظام کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں — اگرچہ اس کا مقابلہ کرنے والی قوتوں میں اضافہ ہو رہا ہے — اور نیویارک کے جُڑواں مینار اُڑا دیے گئے ہیں۔

پُرہجوم دنیا ہر برس غریب سے غریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ کہاں ہے وہ نیلا آسمان جو تم نے اور دینو نے دیکھا تھا؟ تمہارا جواب ہوگا کہ ہاں، وہ امیدیں تار تار ہوگئی ہیں تاہم اس سے درحقیقت تبدیل کیا ہوا؟ انصاف اب بھی ایک لفظی التماس ہے۔ پوری کی پوری تاریخ بھری پڑی ہے امیدوں کو زندہ رکھنے، انہیں کھو دینے اور ان کے ازسرِ نو زندہ ہونے کی مثالوں سے۔ اور نئی امیدیں نئے نظریات ساتھ لے کر آتی ہیں۔ لیکن پُرہجوم آبادیوں کے لیے، ان کے لیے جن کے پاس بہت ہی کم ہے یا کچھ بھی نہیں سوائے حوصلہ مندی اور محبت کے، اُمید کا عمل مختلف ہوتا ہے۔ اُمید ان کے لیے کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس میں دانت گڑوئے جاسکیں، جسے دانتوں کے درمیان رکھا جاسکے۔ اِس بات کو مت بھولو۔ حقیقت پسند بنو۔ دانتوں کے درمیان امید کے ساتھ وہ قوت آتی ہے جو مددگار ثابت ہوتی ہے، کبھی ختم نہ ہونے والی تھکن کے باوجود، سفر جاری رکھنے میں، اگر ضروری ہو تو غلط وقت پر نہ چیخنے چلانے کا فیصلہ کرنے میں اور سب سے بڑھ کر، واویلا کرنے میں کوئی بھی شخص، چاہے مرد ہو یا عورت، اگر اُس کے دانتوں کے درمیان امید ہے تو وہ ایسا بھائی یا بہن ہے جس کا احترام واجب ہے۔ وہ جو حقیقی دنیا میں امید کے بغیر ہیں تنہائی اُن کی سزا ہے سوائے ترس کھانے کے اُن کے پاس دینے کو اور کچھ نہیں۔ چاہے دانتوں کے درمیان یہ امیدیں نئی نکور ہوں یا پھٹی پرانی، زیادہ فرق نہیں پڑتا جب معاملہ راتیں زندہ رہ کر گزارنے کا اور نئے دن کے خوابوں کا ہو۔

تمہارے پاس کوفی ہے؟ ابھی بنا کر لاتا ہوں۔

میں برآمدے سے اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔ جب باورچی خانے سے ترکی کوفی کی دو پیالیاں اٹھائے واپس آتا ہوں، تم جا چکے ہوتے ہو۔ کنارے چپکی اسکاچ ٹیپ کے نزدیک ایک کتاب رکھی ہے میز پر جو کھلی ہوئی ہے اس نظم پر جو تم نے ۱۹۶۲ء میں لکھی تھی۔

''اگر میں چنار کا درخت ہوتا،
تو آرام کرتا اس کی چھاؤں میں
اگر میں ایک کتاب ہوتا
تو پڑھتا، بیزار ہوئے بغیر، بے خواب راتوں میں
پنسل تو میں ہرگز نہ ہونا چاہتا، چاہے میری اپنی انگلیوں کے درمیان
ہی کیوں نہ ہوتی
اگر میں دروازہ ہوتا
تو نیکوکار کے لیے کُھلتا اور بدکار کے لیے بند رہتا
اگر میں کھڑکی ہوتا، ایک پوری کھلی ہوئی کھڑکی، پردوں کے بغیر
تو شہر کو اپنے کمرے میں لے آتا
اگر میں ایک لفظ ہوتا
تو حُسن کا، خیر کا صداقت کا طلب گار ہوتا
اگر میں لفظ ہوتا
تو دھیمے لہجے میں بیان کرتا اپنی محبت۔''

اشوک واجپئی
ترجمہ: احمد مشتاق

چمکیلی چیزوں کی کشش

(زیسلا میلوش سے ایک انٹرویو)

واجپئی۔ آپ کا شمار اس وقت دنیا کے بزرگ ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کے خیال میں بیسویں صدی کے شعری سفر کا ماحصل کیا ہے۔ ذاتی حوالے سے بھی اور عمومی طریقے پر بھی؟

میلوش۔ ہم نے بہت سے تجرباتی دھاروں اور پیش خیمہ (Avant-Garde) تحریکوں کا مشاہدہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخر میں صرف افراد ہی اپنی دیرپا تخلیقات کی بدولت زندہ رہتے ہیں۔ نہ بلند بانگ اعلانات نہ ہنگامہ خیز رجحانات۔

واجپئی۔ کیا آپ چند ایسے افراد کے نام بتا سکتے ہیں جو آپ کی دانست میں زندہ رہیں گے؟

میلوش۔ حال ہی میں 'کراکو' کے ایک اشاعتی ادارے نے میرے تراجم کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے جو ٹی.ایس.ایلیٹ کی ''ویسٹ لینڈ'' اور ڈبلیو.بی.ییٹس کی ''ٹاور'' اور ''سیلنگ ٹو بازنطیم'' کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ میں ان شاعروں کو عالمی ادب کی تاریخ میں زندہ رہنے والے شاعر سمجھتا ہوں۔

واجپئی۔ یوروپ کی دوسری زبانوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جیسے پولستانی، روسی اور فرانسیسی؟

میلوش۔ اچھا، پولستانی — اسے علیحدہ ہی رکھیں۔ دوسری زبانوں میں...... میرا خیال ہے کہ فرانس سے میں پنجوں گا سینڈرارس کو اور روس سے اوسپ مینڈل اسٹام کو۔

واجپئی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے بیسویں صدی جیسی ظالم ترین صدی میں بھی شاعری کو محفوظ

رکھا؟

میلوش۔ میرا خیال ہے شاعری، بنیادی طور پر زندگی کے حق میں ہوتی ہے اور موت کے خلاف۔ ہمیشہ زندگی اور اُمید سے جڑی ہوتی ہے۔

واچیئی۔ کیا اپنے طریقِ عمل میں شاعری نے اپنی شائستگی کو تھوڑا کھویا نہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے انسانی عظمت کے احساس کو، لافانیت سے گہرے تعلق کو جیسا کہ کبھی تھا؟

میلوش۔ بیسویں صدی میں ہم نے مایوسی کے خلاف مسلسل جدوجہد کی ہے اور اس عمل میں شاعری نے حسنِ کائنات کے کچھ آرائشی ساز و سامان کو گم کیا ہے اقدار کو بچانے کی خاطر، دنیا کے حسن میں اضافہ کرنے والے کچھ عناصر سے ہاتھ دھونا لازمی تھا۔

واچیئی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی شاعری میں بدی اور صعوبت پر غالب آنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے زمانے میں بدی نے جو انتہائی جابرانہ اور بھاری بھرکم نظام وضع کیے ہیں کیا انہوں نے انسانی مصائب کو کچھ غیر اہم نہیں بنا دیا؟ اگر بالکل ہی خارج از بحث نہیں تو؟

میلوش۔ جہاں تک میرا تعق ہے دُکھ ہی میرے طریق حیات اور میری شاعری کا مرکز ہے۔ لیکن میں اپنی توجہ صرف انسانی دکھ پر ہی مرکوز نہیں رکھتا۔ میرا اندازہ ہے کہ میری سوچ میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو مشرقی ہے اور وہ ہے اپنے مصائب کو تمام مخلوقات کے مصائب تک پھیلا دینے کی استعداد۔ یہ وہ خصوصیت ہے جسے عیسوی روایت کی اصطلاح میں مانیکی یا نظریۂ مانی کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں رومن کیتھولک مذہب زیادہ بشر مرکزی ہے جو مجھے تھوڑا بدعتی بنا دیتا ہے۔

واچیئی۔ موجودہ زمانے میں اس کے پیچیدہ غیر معمولی پن کے پیشِ نظر، کیا آپ کی شاعری، مصائب پر غور و فکر کرنے کے نئے طریقے وضع کرنے کے سلسلے میں دباؤ میں رہی ہے؟

میلوش۔ وارسا پر نازی قبضے کے دوران میں نے ایک ہی موضوع پر مشتمل نظموں کا ایک سلسلہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''دنیا''۔ یہ ایک قسم کا بچکانہ تصور تھا دنیا کا۔ شاید میں یہ سمجھا کہ یہ خیال مجھے ہی سوجھا ہے اور اس پر ولیم بلیک کا کوئی اثر نہیں لیکن یہ خیال کسی نہ کسی طور پر وہی تھا جو بلیک کے ''معصومیت کے گیت'' اور ''تجربے کے گیت'' میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ نازی تسلط کے زمانے میں بطورِ مداوا، راہِ نجات کی تلاش میں، میں نے معصومیت کے گیت لکھے اقدار کی اس تذلیل کے دوران۔ یہ دنیا کی از سرِ نو بحالی کا عمل تھا ایک بچکانہ تصور کے ذریعے۔ یہ ''چار بیتی'' کی صنف میں لکھے گئے تھے جیسے بچوں کی کتابوں میں ہوتا ہے۔

واچیئ۔ آپ کی شاعری ''انسانی شائستگی کے ذرّے'' کو ایک سلیقۂ اظہار ایک مقام و مرتبہ عطا کرتی ہے۔ کیا تلافی کا یہ عمل شاعری کو ایک روحانی مفہوم اور ایک ایسی اہمیت دیتا ہے جس سے سیکولر اقدار پہلے بالکل ہی ناآشنا اور بے خبر تھیں؟

میلوش۔ میرے نزدیک تو یہ ''مقدس شاعری'' کا تصور ہے — اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایسی شاعری کرسکتا ہوں لیکن یہ میرا نصب العین ضرور ہے۔ شاعری میں یہی وہ بات ہے جس کا میں احترام کرتا ہوں۔ خاص طور پر اگر کسی شاعر میں مقدس متن لکھنے کی صلاحیت ہو۔ شاید یہی وجہ ہے میرے انجیل مقدس سے تراجم کرنے کی۔ میں اس اعلیٰ اسلوب اور زبان کو گرفت میں لانا چاہتا ہوں جو ممکن ہے ''زبانِ مقدس'' ہو۔

واچیئ۔ آپ نے کئی دھائیوں تک جلاوطنی کی زندگی بسر کی ہے۔

میلوش۔ ہاں، میں چالیس برس تک برکلے (کیلیفورنیا) میں رہا ہوں۔

واچیئ۔ کیا اس درد بھری صورت حال سے آپ کو ایک طرح سے تفوق حاصل نہیں ہوا آمریت اور لبرل جمہوریت دونوں کو محسوس کرنے، کریدنے اور چھان بین کرنے میں۔ میرا مطلب ہے شخصی نظام اور روحانی خلا کے حوالے سے؟

میلوش۔ آپ شاید جانتے ہوں، مجھ پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں اپنی شاعری چھپوا نہیں سکتا تھا۔ جب میں پیرس میں تھا۔ مجھے نثر لکھنے پر مجبور کیا گیا۔ تب میں نے شخصی نظام کے خلاف ایک کتاب لکھی ''ذہنِ اسیر۔'' میں کہوں گا کہ یہ تھا میرا حصہ شخصی نظاموں کے خلاف جدوجہد میں۔ ہوسکتا ہے یہ نازی مخالف نظموں کے ایک انتخاب کے مساوی ہو جسے میں نے ترتیب دیا تھا جنگ کے زمانے میں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اس ہنگامے میں، میں بھی شریک رہا ہوں۔ اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ میرے تخلیقی کام کا اہم ترین حصہ ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ میں اپنے اردگرد ہونے والے واقعات سے اثر پذیر ہوتا تھا۔

واچیئ۔ لیکن آپ جلاوطنی میں رہے۔ اپنے وطن کی زبان سے دور۔ کیا اس سے آپ کے ذہن میں کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا؟ یا اس دوری کی وجہ سے آپ کو فائدہ پہنچا؟

میلوش۔ بے شمار مسائل۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ مجھے اپنی زبان کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں اپنی زبان میں پوری طرح قائم تھا۔ میری جڑیں تھیں اپنی زبان میں۔ اس لیے کسی دوسری زبان میں لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ اگرچہ میں تکنیکی طور پر فرانسیسی یا انگریزی

میں بھی لکھ سکتا تھا، میں اپنی زبان ہی میں لکھتا رہا۔

واچیئ۔ کچھ برس پہلے آپ کو اپنی شاعری کے لیے کسی ''وسیع تر صنف'' کی تمنا تھی (کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے) آپ کی تقریباً تمام نظمیں مختصر ہیں۔ زیادہ طویل کوئی نہیں۔ ''وسیع تر صنف'' سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ کیا آپ کی یہ تمنا پوری ہوئی؟

میلوش۔ کسی حد تک۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اصناف میں تبدیلی کے ایک دور سے گزر رہے ہیں یا کچھ دیر پہلے گزرے ہیں۔ مثلاً اب تعقل پر مبنی شاعری کی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھی بعض نظمیں ہلکے پھلکے فلسفیانہ مضامین کی طرح لگتی ہیں۔ علاوہ ازیں ناول اور رسالہ (Treatise) کے درمیان حدِ فاصل غائب ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ بے شمار تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور اصناف میں ایک خاص طرح کا بہاؤ (Fluidity) ہے۔ میں خود مختلف تجرباتی اصناف کو استعمال میں لاتا ہوں۔ مثلاً میں نے تین رسالے لکھے ہیں۔ ''رسالہ در معرفت اخلاق''، ''رسالہ در معرفتِ شعر'' اور ''رسالہ در معرفت دینیات''۔

واچیئ۔ آپ نے کہا ہے کہ ''مصیبت میں تھوڑا نظم و ضبط اور حسن لازمی ہے'' کیا شاعری نے ہمارے بدنصیب زمانے کو تھوڑا نظم و ضبط اور حسن عطا کیا ہے؟ کیسے؟

میلوش۔ ہاں۔ یہ باتیں ایسی شاعری میں بھی مل جاتی ہیں جو مایوسی کی طرف میلان رکھتی ہے جیسے روزے وِچ کی بعض نظموں میں۔

واچیئ۔ ''بے قابو مواد میں سے کیا سمیٹا جا سکتا ہے؟ کچھ نہیں، بہت ہوا تو حسن......'' کیا ہمارے زمانے میں نظریۂ حسن تھوڑا مشکوک نہیں ہو گیا؟ اگر بالکل ہی بے محل نہیں تو؟ کیا شاعری کسی طور حسن کو بحال کرنے کے قابل ہو گئی ہے؟

میلوش۔ میں نے زندگی بھر جمال پسندی کے خلاف جنگ کی ہے۔ ہمیشہ مشکوک سمجھا ہے اُس شاعری کو جو ترغیبِ جمال میں آ جاتی ہے۔ اگر مجھے انتخاب کرنا پڑے تو میں خالص اور لاتعلق شاعری پر اخلاقی تلقین کو ایک طرح سے ترجیح دوں گا۔

واچیئ۔ تمام اقدار کی سیالیت کے زمانے میں شاعری وہ فضا کیسے تخلیق کر سکتی ہے جہاں اقدار کی اہمیت بھی ہو اور انہیں آزادانہ باہمی تعامل کی اجازت بھی؟

میلوش۔ آپ کو پتہ ہے میں تمام اقدار کے سیال پن کا قائل نہیں۔ میں ''مابعد جدیدیت'' کا کبھی ہمدرد نہیں رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقدار کے سیال پن کی اصطلاح ایک کلیشے بن چکی ہے۔

اس لیے میں اس معاملے میں بہت احتیاط برتنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

واچیئی۔ کیا بطور شاعر آپ کو بھی، مینڈل اشتام کے لفظوں میں اکسایا گیا ہے "ترغیب کار" (Seducer) بننے پر؟ یعنی اپنی صلاحیتوں کے ذریعے قاری کو کسی کٹر نظریے کی طرف راغب کرنے پر؟

میلوش۔ ہاں، شاعروں کو "ترغیب کاری" کی طرف سے خطرات لاحق رہے ہیں۔ عموماً شیطانی ترغیبات جو چاپلوسی اور مدح سرائی کا روپ دھار کر آتی ہیں۔ خاص طور پر ایک نوجوان شاعر ان باتوں کے بارے میں بڑا حساس ہوتا ہے جو لوگ اس کے بارے میں کرتے ہیں۔ میں خود بطور ایک نوجوان شاعر اس تجربے سے گزرا ہوں جب میں نے چند انقلابی نظمیں لکھی تھیں۔ ان نظموں کو بے حد سراہا گیا کیونکہ ایک تو وہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی تھیں دوسرے ان کے موضوعات پیش پا افتادہ تھے۔ لیکن بعد میں مجھے خود شرم آئی اور میں نے پھر کبھی اس ترغیب پر عمل نہیں کیا۔

واچیئی۔ لگتا ہے آپ نے نظریاتی طور پر ہیگل ازم اور مارکسزم سے پنجہ آزمائی کی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی تحریریں ہیگل اور مارکس کے ساتھ ایک عظیم مباحثے پر مشتمل ہیں۔ کیا آپ ان باتوں سے اتفاق کریں گے؟ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ اور بتانا پسند کریں گے؟

میلوش۔ میں بائیں بازو کے نظریے کی طرف راغب رہا ہوں۔ دائیں بازو کی طرف کبھی نہیں۔ ایک زمانے میں ہیگل مجھے مارکس سے زیادہ مرغوب تھا۔ ہیگل کے نظریات مجھ میں اس قدر سرایت کر گئے تھے کہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے مجھے ایک ناول لکھنا پڑا۔ اپنے بچپن کے متعلق۔ جس کا نظریے سے کوئی تعلق نہیں۔

واچیئی۔ مارکس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

میلوش۔ یہ ذرا پیچیدہ معاملہ ہے۔ زندگی میں بہت پہلے ہی مجھے سوویٹ یونین کے بارے میں علم تھا۔ اس ریاست کے غیر انسانی پن کا۔ اس لیے میں سوشلسٹ ضرور تھا کیمونسٹ کبھی نہیں رہا۔ اسی وجہ سے مارکسی ترغیبات سے مجھے کم واسطہ پڑا۔

واچیئی۔ آپ نے ہمارے زمانے میں مذہبی قوتِ متخیلہ کے زوال پر افسوس کا اظہار کیا ہے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے قدیم مذہبی خیالات کی آرزومندی پر بھی اعتراض کیا ہے کیا یہ تضاد بالقصد ہے؟ آپ کے پیچیدہ شاعرانہ تصور کا حصہ؟ یا محض ایک اتفاق؟

میلوش۔ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹیکنولوجی کے اثرات ہماری مذہبی قوت متخیلہ کو محدود کر دیتے ہیں۔ میں اس حقیقی صورتِ حال پر تاسف کا اظہار کرتا ہوں اور میں نے اس سلسلے میں ہاں اور ناں کے درمیان ایک قسم کا توازن قائم کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر میرے تازہ ترین شعری مجموعے کا نام ہے ''فضائے دیگر'' اور اس میں ہماری فضائے دیگر کے زیاں پر تاسف کیا گیا ہے اور ہمارے تجربے میں آنے والی چیزوں کی صورتِ حال پر۔ کیونکہ ہماری مذہبی قوت متخیلہ پر ٹیکنولوجی کے دباؤ کی وجہ سے ہم سب ایک ہی صورت حال میں ہیں۔ صاحبِ عقیدہ بھی اور بے عقیدہ بھی۔

واچیئ۔ عاشقی سایۂ گناہ میں اور عاشقی احساسِ گناہ کے بغیر— کیا یہ دو مرحلے ہیں آپ کی شاعری میں جب یہ محبت سے معاملہ کرتی ہے؟ عیسوی محبت کے سیاق و سباق سے آپ ایک طرح سے فاصلے پر کیوں رہے؟

میلوش۔ میری تعلیم کیتھولک عقیدے کے مطابق ہوئی اور تصور گناہ میری جڑوں تک میں اُترا ہوا تھا اس لیے میں اسے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ میں محبت کو احساسِ گناہ سے علیحدہ کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ ہوسکتا ہے یہ برا اثر ہو۔ بُرا یہ تھا......

واچیئ۔ کیا آپ نے ایسی محبت کی آرزو کی ہے جو گناہِ آدم کے احساس سے پاک ہو؟

میلوش۔ ایک بار میں نے اپنے آپ کو ''وجدآور قنوطی'' کا نام دیا تھا۔

واچیئ۔ آپ کی شاعری کسی گہرے رنگ میں انسانی صورتِ حال پر ایک طویل مراقبہ ہے۔ تقدیر۔ ناگوار صورتِ حال۔ مصائب۔ شفاعت یہ سب کسی نہ کسی رنگ میں کلاسیکی خصوصیات ہیں۔ پھر بھی آپ کو ہمارے زمانے میں رومانیت کا احیاء کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

میلوش۔ پولستانی شاعری میں رومانیت کی روایت بہت مضبوط ہے۔ میرے خیال میں کوئی بھی پولستانی شاعر مکمل طور پر رومانیت کے اثر سے آزاد نہیں ہے۔ میری جڑیں رومانیت میں ہیں خاص طور پر مکی وکز (Mickiewicz) میں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ میں رومانیت سے آلودہ رہا ہوں۔

واچیئ۔ لیکن آپ تو بہت ہی کلاسیکی شاعر ہیں۔ درحقیقت آپ ایک جدید کلاسیکی ہیں......

میلوش۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ رومانیت سے کیا مراد لیتے ہیں۔ رومانیت کئی مراحل سے گزری ہے۔

واچیئ۔ بیسویں صدی میں پولستانی شاعری زیادہ تر آپ کی کوششوں کی بدولت ایک بڑی روایت کے طور پر پہنچائی گئی۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں پولستانی زبان میں عالمی معیار کے کئی شاعر پیدا ہوئے۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کا دعویٰ دنیا کی کوئی دوسری زبان نہیں کرسکتی؟ آپ کے علاوہ تین اور شاعر ہیں: ہربرٹ، روزے وِچ اور زمبورسکا۔

میلوش۔ یہ بڑا دل چسپ سوال ہے اور یہ جُڑا ہوا ہے پولستانی شاعری کی تاریخ اور ہمارے تاریخی تجربے سے۔ میں پولستانی شاعری میں ایک تقطیر (Distillation) کا عمل دیکھتا ہوں۔ تاریخی تجربات کی تقطیر اس حد تک کہ زمبورسکا کی انتہائی لاتعلق مختصر نظموں میں بھی جن کا جنگ یا مصائب کے تجربے— تاریخی مصائب سے دور کا بھی تعلق نہیں، اُن میں بھی اس تہ نشین تجربے کے نشانات نمایاں ہیں جس سے مدد ملتی ہے شاعری کو غیر موضوعی بنانے میں، جس سے مدد ملتی ہے اپنے تجربے کو معروضی بنانے میں اور یہی وجہ ہے کہ بعض امریکی نقاد نام نہاد پولستانی مدرسہ شعر کو ایک ایسی شاعری کے طور پر دیکھتے ہیں جو ذاتی تجربے کو تاریخی تجربے سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوئی اور یہ بات ان ناموں پر بھی صادق آتی ہے جو ابھی آپ نے لیے۔

واچیئ۔ ''بیسویں صدی میں دھرتی کے قدرتی عجائبات اور تاریخ کے ابلیسی کارناموں کے گواہ'' کے طور پر کیا آپ کی شاعری بھی کسی گہرے اور اضطراب انگیز مفہوم میں شریکِ جرم رہی ہے؟

میلوش۔ یہ مجھے آپ سے پوچھنا ہے آپ جو ایک بالکل مختلف روایت کے شاعر ہیں۔ ہندومت کی روایت کے۔ تاریخ کی ابلیسی قوتوں کو غالباً مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ فطرت صدیوں بلکہ لاکھوں برس تک ابلیسی قوتوں کا نشانہ رہی ہے۔ لہٰذا ہماری صدی کی ابلیسیت اور فطرت کی لکھوکھا برس کی ابلیسیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

واچیئ۔ ''اس لیے شاعری، ضرورت کے تحت، ہستی کی طرفدار ہے اور نیستی کی مخالف'' آپ نے یہ فقرہ اتنی طباعی کے ساتھ ''منور اشیا کی کتاب'' کے تعارف میں لکھا ہے لیکن بحران کے لمحوں میں کیا آپ نے ذاتی طور پر نیستی کی طرف یا نفی کی طرف کبھی کوئی کشش محسوس کی؟

میلوش۔نہیں۔ کیونکہ مجھے یہ بات ہمیشہ ناشائستہ محسوس ہوئی۔

واچیئ۔ بدھ مت کے پیروکاروں میں نفی کا تصور ہے— کہ اپنی ذات کو ہیچ (Nothing) میں تبدیل کرلینا چاہیے......

میلوش۔ میں بدھ مت کے بارے میں اتنا نہیں جانتا کہ اسے سمجھ سکوں اور اس پر اپنی رائے دے سکوں۔

واچیئی۔ کیا ہندوستان آپ کے لیے کوئی خاص معنی رکھتا ہے؟ آپ کی ایک نظم ہے ''راجہ راؤ کے لیے'' جس میں آپ نے اتنے متاثر کن پیرائے میں اپنی دوری کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کی بعض دوسری نظموں میں کچھ تمثالیں ہیں۔ زیادہ تر بدھ کے حوالے سے۔ آپ ہندوستان سے اپنے تعلق کو کیسے بیان کرنا پسند کریں گے؟

میلوش۔ میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے کبیر کی چند نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے کبیر کی نظمیں انگریزی ترجمے میں ملیں۔ اور پھر میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے کیے ہوئے ترجمے دیکھے۔ ٹیگور کے ترجمے اپنے انگریزی محاورے میں مجھے عامیانہ لگے لیکن دوسرے انگریزی تراجم کے مقابلے میں اصل کے زیادہ قریب اس لیے انگریزی سے ترجمہ کرتے ہوئے میں نے ٹیگور کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ اور بلاشبہ میں اصل نظموں کی فارم کا اندازہ ہی لگا سکا۔ لیکن کبیر ایک مخصوص روایت ہے بہت ہی مخصوص۔ وہ نمائندہ نہیں ہے۔ چنانچہ ہندوستان سے میرا تعلق کبیر کے واسطے سے ہے لیکن دوسری طرف ہندوستان میں میرے لیے وہ روایت تھا جس کی جڑیں ہندو مت اور بدھ مت میں پیوست ہیں۔ تمام چیزوں کی وحدت اور تمام مخلوقات کے مصائب کا احساس۔ تو یہ تھا میرا تعلق جو زندگی بھر رہا ہے۔ چنانچہ ہوسکتا ہے یہ ایک بے حد گہرا تعلق ہو۔ مصنوعی نہ ہو۔

واچیئی۔ اپنے نوبیل لیکچر میں آپ نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ ''ایک گہری سطح پر مجھے یقین ہے کہ میری شاعری نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ایک تاریک دور میں امن اور انصاف کی بادشاہت کی آرزو کا اظہار کیا ہے'' بیس برس بعد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی یہ آرزو پہلے کی طرح پوری نہیں ہوئی یا کم از کم شاعری میں ایک سطح پر پوری ہوئی ہے؟

میلوش۔ میں نے دو شخصی نظاموں میں زندگی گزاری ہے۔ چھ برس کا تھا جب میں نے ایک رُوسی قصبے میں انقلاب کو برپا ہوتے دیکھا۔ پھر ۱۹۳۳ء میں اپنی جوانی کے زمانے میں نازی نظام کو شروع ہوتے دیکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دونوں نظاموں کو زوال بھی ہوا جو مجھے تھوڑا پُرامید رکھنے کے لیے کافی ہے۔

واچیئی۔ شیمس ہینی کی دانست میں آپ کی شاعری ''ترجمے میں بھی اُس عتیقی توقع کو پورا

کرتی ہے کہ شاعری محظوظ بھی کرے گی اور ہدایت بھی دے گی'' کیا آپ نے یہی نمونہ پیش کرنے کے لیے آغاز کیا تھا؟ کیا آپ اس بات سے آگاہ رہے ہیں کہ آپ کی شاعری دونوں باتوں میں کامیاب ہوئی ہے محظوظ کرنے میں بھی اور ہدایت دینے میں بھی؟

میلوش۔ شیمس ھینی میرا اچھا دوست ہے اور مجھے بہت خوشی ہے کہ اُسے میری شاعری میں اپنے لیے بھی کچھ ملا ہے۔ وہ شمالی آئرلینڈ کی خانہ جنگی کے مسئلے سے نبرد آزما تھا اور اُسے نہ صرف میری شاعری میں بلکہ پولستانی شاعری میں اُن مشکل اور الم ناک سوالوں کے حل کا کوئی طریقِ عمل ہاتھ لگا جو خود اس کے لیے بھی الم ناک تھے ذرا فاصلے سے۔ اسے ہماری شاعری میں کوئی ایسی چیز مل گئی جو آئرلینڈ کے مسئلے پر قابو پانے میں اس کے لیے مددگار ثابت ہوئی۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اخلاقی تلقین کو پسند کرتا ہوں۔ یہ ایک قسم کی کلیسائی درجہ بندی کا نتیجہ تھی ایک ایسی درجہ بندی جو ہمارے تاریخی تجربے کی پیدا کردہ تھی — سوالوں اور جوابوں کی درجہ بندی۔

واچیئی۔ ھینی پھر کہتا ہے کہ آپ کے کام میں یہ بھی مضمر ہے کہ ''ثقافتی حافظہ انسانی وقار اور اس کی بقا کے لیے لازمی ہے'' کیا آپ اتفاق کریں گے؟

میلوش۔ ہاں، میں اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ میں نے کئی برس تک جلاوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اور میں نے اپنی جڑوں میں پیوستہ ہونے کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ میری قوت بھی لتھوانیا کے ایک چھوٹے سے ضلعے کی جڑوں میں پیوستگی کی دین ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا وہ میرے لیے آج بھی حقیقتیں ہیں — میرے آباؤ اجداد، ان کی قبریں، ان کی روایت۔ مثال کے طور پر حال ہی میں مجھے انیسویں صدی کے ایک کلیسائی حلقے کی کتاب موصول ہوئی جو میرے اجداد کے بارے میں تھی۔ تو یہ ہے روایت کی جڑوں سے پیوستگی۔ چاہے وہ ایک چھوٹے سے ضلعے کی روایت ہی کیوں نہ ہو۔ واقعی اس نے مجھے زندہ رہنے اور جن فیشنوں اور نظریات میں گھرا ہوا تھا ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے میں مدد دی۔

واچیئی۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی مصائب پر کافی توجہ نہیں دی گئی — وہ مصائب جن کی آپ کے کام میں اتنے گہرے اور ناگزیر طور پر تجسیم ہوئی ہے؟

میلوش۔ اگر میں اپنے آپ کو کسی بات پر ملامت کرسکتا ہوں تو وہ یہ ہے کہ میری شاعری میں زیادہ انسانی مصائب کو گرفت میں لینے اور انہیں پیش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ چلیے ہم پھر روایت کے بارے میں پچھلے سوال کی طرف چلتے ہیں۔ لتھوانیا جو میری جنم بھومی ہے وہاں ایک

فاؤنڈیشن ہے جس کا نام ہے ''چیسلا میلوش جنم بھومی فاؤنڈیشن''۔ ایک پرانا کوٹھا تھا جسے دوبارہ تعمیر کر کے ایک کانفرنس ہال بنا دیا گیا ہے جس میں پولینڈ اور لتھوانیا کے تعلقات پر سیمینار منعقد ہوتے ہیں چنانچہ یہ ایک اور پہلو ہے اپنے اور اپنے خاندان کے ماضی سے میری دل بستگی کا۔

واچیئی۔ ''میں دوبارہ کبھی دوزانو ہو کر نہ بیٹھوں گا، اپنے چھوٹے سے وطن میں ایک دریا کے کنارے، تاکہ میرے اندر کا پتھر تحلیل ہو سکے، تاکہ کچھ بھی باقی نہ رہے۔ سوائے میرے آنسوؤں کے، میرے آنسوؤں کے......'' اس پختہ عمر میں کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ پتھر تحلیل ہو چکا ہے اور یہ کہ صرف آنسو بچے ہیں؟

میلوش۔ باون برس کی ہجرت کے بعد میں اپنی جنم بھومی میں واپس آیا تھا۔ میں نے دریا کے کنارے گھاس کو دیکھا اور پھولوں کو، اور مجھ پر ایک گہری رقت طاری ہوئی اور اس کیفیت کے بارے میں ایک نظم لکھی۔ میرا خیال ہے اس کا عنوان ہے ''مرغزار''۔ یہ نظموں کے اس سلسلے سے تعلق رکھتی ہے جس کا نام ہے ''باون برسوں کے بعد واپسی'' رہے آنسو...... (وہ مسکراتا ہے)

واچیئی۔ ''سڑک کنارے کا کتا'' میں ایک اندراج ہے جس میں آپ یہ کہتے معلوم ہوتے ہیں کہ شاعری کے برعکس دینیات (Theology) اُس کا اظہار نہیں کرتی جو ''زندگی میں گہراترین ہے اور انتہائی گہرائی میں محسوس کیا جاتا ہے'' بیسویں صدی کی شاعری نے بقول آپ کے انسانی صورتِ حال کے بنیادی اعداد و شمار اکٹھے کیے ہیں۔ کیا یہ جدید دینیات پر ایک شاعرانہ پھٹکار ہے؟

میلوش۔ نہیں۔ میرا خیال ہے شاعری اور دینیات کا آپس میں بندھن ہے۔ میری نظر میں دینیات تھوڑی زیادہ ہی مجرد ہے لیکن شاعری میں دینیات کے لیے تیار کرنے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی اہلیت ہے اور مجھ پر ایک پادری نے کافی ضخیم کتاب بھی لکھی ہے جو دینیات کے لیے میری شاعری کی اہمیت کو ثابت کرتی ہے۔

واچیئی۔ کیا شاعری نے، حقائق تک اپنی رسائی، اخلاقی دادرسی اور اشک شوئی کی استعداد کی وجہ سے کسی اہم اور دیرپا رنگ میں روایتی مذہب کی جگہ لے لی ہے؟

میلوش۔ نہیں۔ شاعری مذہب کی جگہ نہیں لے سکتی۔ تاہم نعم البدلی کے اس عمل کو ہم بیسویں صدی کے آغاز سے دیکھ رہے ہیں۔ کمزور پڑتے ہوئے عقیدے کے نتیجے کے طور پر شاعری کو مذہب کی جگہ پر بٹھانے کا رجحان رہا ہے۔ بہرحال یورپی شاعری میں ایسا ہوا ہے۔ مجھے ہندوستان کے بارے میں علم نہیں کہ وہاں کیا ہوا۔ چنانچہ شاعری کو مذہب کی جگہ دینے کا رجحان رہا ہے۔ میں

محسوس کرتا ہوں کہ شاعری کا مذہب کی جگہ لینا خود شاعری کے لیے خطرناک ہے۔ کیونکہ یہ شاعری کو زیادہ ہی اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیتا ہے۔

واچیئی۔ ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے کہا ہے کہ 'ڈبلیو۔بی۔ییٹس ان چند لوگوں میں سے تھا جن کی تاریخ اُن کے اپنے زمانے کی تاریخ ہے۔ جو اپنے عہد کے شعور کا ایک حصہ ہیں جسے اُن کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔'' یہ بات آپ پر بھی برابر صادق آتی ہے۔ تاہم کیا اس بات سے آپ کسی قسم کے اخلاقی دباؤ یا بوجھ تلے تو نہیں آ گئے؟

میلوش۔ ایسے لمحے بھی آئے— ہم کچھ دیر پہلے ترغیبات کے بارے میں بات کر رہے تھے— جب میں نے اپنے آپ کو ایک ایسا ادیب خیال کیا جو اپنے زمانے کا ذمے دار ہوتا ہے اور جسے اس کی توقعات پر پورا اترنا چاہیے۔ لیکن خوش قسمتی سے میں اب بوڑھا ہوں اور مجھے اب ایسی ترغیبات سے کوئی خطرہ نہیں۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ جب میں اخلاقی ذمے داری بھی محسوس کرتا تھا تو انتہائی مختصر وقفوں میں۔ مثال کے طور پر جب ۱۹۴۳ء میں وارسا کا باڑا (Warsaw Ghetto) جل رہا تھا اور قریب ہی رنگ رلیاں جاری تھیں اور لڑکیاں گھڑ سواری کے کرتب دکھا رہی تھیں اُس وقت میں نے ایک نظم لکھی تھی اس لیے نہیں کہ میں نے اپنے آپ کو تاریخ کا ذمے دار محسوس کیا۔ یہ محض ایک اخلاقی برہمی کا عمل تھا۔

واچیئی۔ اگر شاعری، بقول آپ کے ''آخری جائے پناہ'' ہے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کی شاعری نے اپنی اخلاقی قوت اور اپنے حوصلے اور تحمل کی بنا پر اسے سچ ثابت کر دکھایا ہے؟

میلوش۔ میں شاعری کے مستقبل کے بارے میں نا اُمیدی کا میلان نہیں رکھتا۔ بیسویں صدی کی شاعری نے اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے اور یہ سلسلہ میری موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ خیر اگر کوئی بیکٹ کو قنوطیت پسند ادیب سمجھتا ہے تو بیکٹ کی قنوطیت کے آہنگ میں مکتی بھی ہے۔ میرے خیال میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان میں آہنگ (Rhythm) آخری جائے پناہ ہے لیکن زبان کا آہنگ جیسا کہ آپ خود جانتے ہیں چونکہ آپ خود شاعر ہیں، نجات کا وسیلہ ہے۔

واچیئی۔ ''ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے'' آپ کی شاعری کے بارے میں پوپ کا یہ کہنا ہمارے سیکولر زمانے میں شاعری کے روحانی کردار کے متعلق ایک مستند بیان ہو سکتا ہے۔ کیا ہمارے عہد میں شاعری کو صرف یہی ایک مذہبی کردار تفویض نہیں کیا گیا؟

میلوش۔ ہاں، پوپ نے یہ کہا تھا مجھ سے اور میں نے پوچھا۔ مقدس باپ! کیا بیسویں صدی میں کسی اور طریق سے مذہبی شاعری لکھنا ممکن ہے؟

واچیئ۔ اور انہوں نے کیا کہا؟

میلوش۔ وہ مسکرا دیے۔ لیکن میرا ''رسالہ در معرفتِ دینیات'' بھی کچھ ایسا ہی ہے کیوں کہ میں موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی اسٹینوگرافر اُن باتوں کو لکھتا جائے جو آج بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ تضادات سے بھرے ہوئے ہیں وہ اعتقاد اور بے اعتقادی کے درمیان معلق ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں چاہے وہ کیتھولک مذہب کے ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے، بے اعتقادوں کے ساتھ اعتقاد کی ترغیبات لگی ہیں۔

حوزے سارا ماگو

ترجمہ: احمد مشتاق

اندھے لوگ

(دوسرا باب)

اندھے آدمی کو مدد کی پیش کش کرتے وقت اُس آدمی کے دل میں، جو بعد کو اس کی کار لے اُڑا، کوئی بدنیتی نہیں تھی، بلکہ اس کے بالکل برعکس اُس نے جو بھی کیا تھا وہ ایثار اور کریم النفسی کے جذبے کے تحت کیا تھا جو جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے، انسانی فطرت کے دو بہترین وصف ہیں اور اس سے زیادہ سنگ دل مجرموں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ تو ایک سیدھا سادھا کار چور تھا جسے اس پیشے میں ترقی کی کوئی امید نہیں تھی اور اس کاروبار کے حقیقی مالک، جس کا استحصال کرتے رہتے تھے کیونکہ یہی لوگ غریبوں کی ضروریات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو کسی اندھے آدمی کی دست گیری کرنے کے بعد اُسے لُوٹنے اور کسی لڑکھڑاتے، ہکلاتے آدمی کے ورثے پر نظر رکھتے ہوئے اس کی دیکھ بھال کرنے میں کوئی ایسا بڑا فرق نہیں۔ یہ خیال تو عین اس وقت، قدرتی طور پر اس کے دل میں آیا تھا، جب وہ اندھے آدمی کے گھر کے قریب پہنچنے ہی والا تھا، کوئی شاید یہ کہے کہ جیسے اس نے لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے کو دیکھتے ہی ٹکٹ خریدنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے جبلّی طور پر کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اُس نے اِس لیے ٹکٹ خریدا تھا کہ دیکھیں کچھ ہاتھ بھی آتا ہے یا نہیں۔ من موجی قسمت جو بھی دکھائے اس کے لیے پہلے سے تیار، دوسرے کہیں گے کہ اس کا محرک اُس کی شخصیت کا لاشعوری ردعمل تھا۔ تشکیک پسندوں کا جو تعداد میں بھی زیادہ ہوتے ہیں اور ہٹ دھرم بھی، یہ دعویٰ ہوگا کہ انسانی فطرت کے معاملے میں اگر ایک طرف یہ سچ ہے کہ موقع ہمیشہ چور کو چور نہیں بناتا، تو دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس میں مددگار رہتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے

ہم یہ خیال کریں گے کہ اگر اندھے آدمی نے اُس جعلی سامری کی دوسری پیش کش قبول کر لی ہوتی تو ہوسکتا ہے اس آخری لمحے میں، اس کی کریم النفسی برقرار رہتی، ہمارا اشارہ اس پیش کش کی طرف ہے جو اندھے آدمی کو اس وقت تک ساتھ رہنے کے لیے کی گئی تھی جب تک کہ اس کی بیوی گھر نہیں آجاتی۔ کون جانتا ہے کہ کار چور پر کیے گئے اس اعتماد سے پیدا ہونے والی اخلاقی ذمے داری نے اسے اِس مجرمانہ ترغیب سے باز رکھا ہوتا اور ان روشن اور نیک جذبات کی فتح کا سبب بنتی، جن کی اخلاق سے انتہائی عاری روحوں میں بھی موجودگی کا ہمیشہ امکان ہوتا ہے۔ بات اس پرانی کہاوت پر ختم کرتے ہیں، جو یہ سکھاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتی کہ اپنے اوپر صلیب کا نشان بناتے ہوئے اندھا اپنی ہی ناک توڑ بیٹھا۔

اخلاقی ضمیر جسے اکثر نادان لوگوں نے آزردہ کیا ہے اور بہت سوں نے رد کیا ہے، واقعی اپنا وجود رکھا ہے اور ہمیشہ سے رکھتا آیا ہے، یہ چار عنصری فلسفیوں کی ایجاد نہیں تھا، جب کہ روح ایسا مسئلہ نہیں تھی کہ جس کے بارے میں تیر تکّے سے کام چلایا جاتا۔ وقت کے گزران کے ساتھ، معاشرتی ارتقا اور باہمی نسلی تبادلوں کی وجہ سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ اپنے ضمیر کو اپنے لہو کے رنگ اور آنسوؤں کے نمک میں ڈھال سکیں اور جیسے یہ کافی نہیں تھا، ہم نے اپنی آنکھوں کو ایک قسم کے آئینے بنا لیا اور اُن کا رُخ اندر کی طرف کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ بلا کم و کاست وہی دکھاتے ہیں جس سے ہم زبانی منکر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمومی مشاہدے میں مخصوص صورتِ حال کا اضافہ کرلیں کہ سادہ نفوس میں کسی برے کام کے ارتکاب سے پیدا ہونے والی پشیمانی، ہر قسم کے آبائی خوف کے ساتھ مل کر اکثر گڈمڈ ہو جاتی ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ رحم اور معافی کے بغیر، گول مول باتیں کرنے والے کی سزا اس سے دوگنی ہو جائے گی جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔ اس معاملے میں یہی ہوا۔ اس لیے یہ دیکھنا ناممکن ہے کہ خوف اور آفت زدہ ضمیر کے درمیان وہ کیا تناسب تھا جو ہراساں کرنے لگا چور کو، جس لمحے اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور اُسے چلا کر لے گیا۔ بلاشبہ وہ اُس شخص کی جگہ پر بیٹھ کر کبھی سکون میں نہیں رہ سکتا تھا جو سٹیئرنگ وہیل کو تھامے اچانک اندھا ہو گیا تھا، جس نے کار کے اگلے شیشے میں سے دیکھا اور اچانک کچھ نہ دیکھ سکا۔ ایسے خیالات کو، خوف کے فاسد اور پُرفریب عفریت کو ابھارنے کے لیے جو ہمیشہ اپنا سر اٹھاتا ہے، کسی بڑے تخیل کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو وہاں پہلے ہی سر اٹھا رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ پشیمانی بھی تھی، ضمیر کا پُرملال اظہار، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یا اگر ہم اشاراتی اصطلاحوں میں بیان کرنے کو

ترجیح دیں، ایک ایسا ضمیر، جس کے کاٹنے کے دانت بھی ہوتے ہیں، اس کی آنکھوں کے سامنے اس بے بس آدمی کا تصور لانے ہی والا تھا جب وہ اپنی کار کا دروازہ بند کر رہا تھا، کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں، بیچارے نے کہا تھا اور اس کے بعد وہ مدد کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کے قابل نہ ہوگا۔

چور نے ٹریفک پر زیادہ سخت اور پہلے دوگنی توجہ مرکوز رکھی تاکہ ایسے خوف ناک خیالات کو اپنے دماغ پر مکمل قبضہ جمانے سے باز رکھ سکے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ذرا سی غلطی یا معمولی سے بے توجہی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہاں پولیس ہمیشہ آس پاس ہوتی تھی اور ان میں سے کوئی ایک سپاہی بھی اسے روک سکتا ہے، کیا میں آپ کا شناختی کارڈ یا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟ پھر جیل خانے میں واپس، کیسی کٹھن زندگی تھی۔ وہ ٹریفک کی بتیوں کی تعمیل میں بے حد محتاط تھا۔ کسی بھی صورت حال میں بتی کے سرخ ہونے کے بعد نہ گزرنا، پیلی بتی کا احترام کرنا، اور جب تک بتی سبز نہ ہو صبر سے انتظار کرنا۔ ایک موقع پر تو اُسے لگا کہ جیسے اس نے خطیبوں کی طرح ٹریفک کی بتیوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے کار کی رفتار کو کچھ ایسے منضبط کرنا شروع کیا کہ اسے اپنے سامنے ہمیشہ سبز بتی ملے چاہے اس کے لیے اسے اپنی رفتار اتنی زیادہ یا اتنی کم کیوں نہ کرنی پڑی کہ پیچھے آنے والے ڈرائیور غصے میں آ جائیں۔ بالآخر چونکہ وہ ذہنی طور پر پریشان اور ناقابلِ برداشت حد تک تناؤ میں تھا، وہ اپنی کار کو ایک چھوٹی سڑک پر لے گیا جہاں وہ جانتا تھا کہ ٹریفک کی بتیاں نہیں ہیں اور کار کو بغیر اِدھر اُدھر دیکھے ایک جانب کھڑا کر دیا۔ وہ اتنا اچھا ڈرائیور تھا— اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اعصاب پھٹ جائیں گے۔ بالکل یہی الفاظ تھے جو اس وقت اس کے ذہن سے گزرے۔ میرے اعصاب پھٹنے ہی والے ہیں۔ کار میں سخت گرمی تھی، اس نے دونوں طرف کی کھڑکیوں کے شیشے نیچے کر دیے لیکن باہر کی ہوا، اگر چل بھی رہی تھی، تو وہ اندر کے ماحول کو تروتازہ کرنے کے لیے کچھ نہ کر سکی۔

مجھے کیا کرنا چاہیے، اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ شیڈ جہاں اس کار کو اُسے لے جانا تھا، بہت دور تھا، شہر سے باہر، ایک گاؤں میں اور اپنی موجودہ ذہنی حالت میں وہ وہاں کبھی نہ پہنچ پائے گا۔ یا تو پولیس مجھے پکڑ لے گی یا، یا اس سے بھی بدتر، مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے گا، وہ بڑبڑایا۔

تب اسے خیال آیا کہ سب سے بہتر یہ ہوگا کہ تھوڑی دیر کے لیے کار سے باہر نکل کر اپنے خیالات کو صاف کرنے کی کوشش کی جائے، شاید تازہ ہوا مکڑی کے ان جالوں کو اڑا لے جائے،

محض اس لیے کہ وہ بے چارہ مصیبت کا مارا اندھا ہوگیا، کوئی وجہ نہیں کہ میرے ساتھ بھی وہی ہو۔ یہ کوئی زکام نہیں کہ دوسرے کو لگ جائے۔ میں اس بلاک کا ایک چکر لگاؤں گا اور یہ سب ختم ہوجائے گا۔ وہ باہر آیا اور کار کو تالہ لگانے کی بھی پرواہ نہیں کی، وہ ایک منٹ میں واپس آجائے گا اور چلنے لگا۔ وہ ابھی تیس قدم بھی نہ چلا ہوگا کہ اندھا ہوگیا۔

ڈاکٹر کے کلینک میں جو آخری مریض رہ گیا تھا وہ، وہی خوش طبع بوڑھا تھا جس نے بیچارے اچانک اندھے ہوجانے والے شخص کے بارے میں بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ وہ وہاں اس لیے موجود تھا کہ اسے اپنے موتیا بند کے آپریشن کی تاریخ طے کرنا تھی، جو اس کی واحد آنکھ میں اُتر آیا تھا، دوسری آنکھ کے خلا پر سیاہ کپڑے کا ایک پیوند لٹک رہا تھا اور موجودہ معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جو بڑھاپے کے ساتھ لگی آتی ہیں، کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا اور جب یہ موتیا بند پختہ ہوجائے گا تو ہم اسے ہٹا دیں گے۔ تب تم اُس جگہ کو بھی نہ پہچان پاؤ گے جہاں تم رہتے ہو۔ جب آنکھ پر کالے پیوند والا بوڑھا چلا گیا اور نرس نے کہا کہ اب کمرۂ انتظار میں کوئی مریض نہیں تو ڈاکٹر نے اندھے ہوجانے والے آدمی کی فائل نکالی اور اسے ایک بار پڑھا، دوسری بار پڑھا، کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اپنے ایک ہم پیشہ ساتھی کو فون کیا اور اس سے یہ گفتگو کی: میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج مجھے ایک بہت ہی عجیب مریض سے سابقہ پڑا۔ یہ شخص ایک سیکنڈ سے دوسرے سیکنڈ تک کے وقفے میں مکمل طور پر اپنی بینائی کھو بیٹھا تھا، معائنے کے دوران آنکھوں کی ساخت میں کوئی قابلِ فہم خلل یا پیدائشی نقص ظاہر نہیں ہوا، وہ کہتا ہے کہ اسے ہر چیز سفید نظر آتی ہے، ایک قسم کی گاڑھی، دودھیا سفیدی کہ اس کی آنکھوں سے چمٹی ہوئی ہے، جیسے اس نے مجھ سے بیان کیا میں اپنی بساط کے مطابق جتنا بہتر طور پر بتا سکتا ہوں، تمہیں بتا رہا ہوں، ہاں واقعی یہ کوئی اندرونی مسئلہ ہے، نہیں، آدمی نسبتاً جوان ہے، اڑتیس برس کا، کیا تم نے ایسے مرض کے بارے میں کبھی سُنا ہے؟ یا پڑھا ہو، یا کسی سے ذکر سنا ہو، میں نے بہت سوچا، فی الحال مجھے اس کا کوئی حل سجھائی نہیں دیتا، تھوڑا وقت حاصل کرنے کیلیے، میں نے کچھ ٹیسٹ تجویز کیے ہیں، ہاں، ہم انہی دنوں میں اکٹھے اس کا معائنہ کرسکتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں کچھ کتابیں دیکھوں گا، کتابیات پر ایک بار پھر نظر ڈالوں گا، شاید کوئی سراغ مل جائے، ہاں مجھے بے نظری (Agnosia) کے بارے میں علم ہے یہ روحانی بے بصری ہوسکتی ہے لیکن پھر، ان خصوصیات والا یہ پہلا مریض (Case) ہوگا، کیونکہ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہ آدمی واقعی اندھا ہے، اور

جیسا کہ ہم جانتے ہیں بے نظری کے مرض میں مبتلا آدمی دیکھی بھالی چیزوں کو پہچاننے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے، کیونکہ مجھے یہ بھی خیال آیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مکمل اندھے پن کا مرض ہو لیکن یاد ہے میں نے تمہیں شروع ہی میں بتا دیا تھا، یہ اندھا پن سفید ہے، مکمل اندھے پن کے برعکس، جس میں مکمل تاریکی ہوتی ہے۔ بجز اس کے کہ کسی نوع کا سفید اندھا پن ہو، ایک سفید تاریکی، جیسی کہ یہ ہے، ہاں مجھے معلوم ہے، جس کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا، ٹھیک ہے، میں اسے کل فون کروں گا اور بتا دوں گا کہ ہم دونوں اکٹھے معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کرسی کی پشت سے اپنی کمر لگا دی، کچھ منٹ تک وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا، اپنا سفید کوٹ افسردگی کے ساتھ آہستہ آہستہ اتار دیا۔ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں گیا، لیکن اس بار اُس نے آئینے سے مابعد الطبیعاتی انداز میں نہیں پوچھا، یہ کیا ہوسکتا ہے، اس کا سائنسی نقطۂ نظر واپس آ گیا تھا، یہ حقیقت کہ بے نظری اور مکمل بے بصری کی تشخیص اور تعریف، کتابوں میں بھی اور عمل میں بھی، پوری صحت کے ساتھ متعین ہو چکی ہے، پھر بھی ان میں نوعی تبدیلیوں، اگر یہ لفظ مناسب ہے اور دوسرے نمونوں کی نمود کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا، اور لگتا ہے کہ وہ دن آ گیا ہے۔ دماغ کے بند ہوجانے کی ہزاروں وجوہات ہوسکتی ہیں، صرف یہ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، جیسے کوئی لوگوں کے ہاں دیر سے جانے والا واپسی پر اپنا ہی دروازہ بند پائے۔ یہ ماہر آشوبِ چشم ادبی ذوق بھی رکھتا تھا اور موزوں کہاوت استعمال کرنے کی وجدانی صلاحیت بھی۔

اس شام، ڈنر کے بعد اُس نے اپنی بیوی کو بتایا، آج ایک عجیب کیس (Case) سے واسطہ پڑا، ہوسکتا ہے یہ نفسی بے بصری (Psychic Blindness) یا مکمل اندھے پن (Amaurosis) کی کوئی قسم ہو، لیکن اس طرح کی علامات کے تسلیم کیے جانے کی کوئی شہادت نہیں ملتی، یہ کیا بیماریاں ہیں، مکمل اندھا پن اور وہ دوسری چیز، اس کی بیوی نے پوچھا۔ ڈاکٹر نے عام فہم زبان میں اسے بتایا تاکہ اُس کے تجسس کی تشفی ہوسکے، پھر وہ کتابوں والی الماری کی طرف گیا جہاں اس کی طبی کتابیں رکھی تھیں، کچھ اس کے یونیورسٹی کے زمانے کی تھیں، دوسری زیادہ قریبی زمانے کی اور بعض حال ہی میں شائع ہونے والی، جن کا مطالعہ کرنے کا ابھی اسے وقت نہیں ملا تھا۔ اس نے فہرست مضامین پر نظر دوڑائی اور باقاعدہ وہ ہر چیز پڑھنی شروع کی جس کا بے نظری اور مکمل بے بصری سے تعلق تھا، ایک بے چین سے تاثر کے ساتھ کہ وہ اپنی اہلیت سے ماورا میدان میں دخل اندازی کر رہا ہے، اعصابی جراحت کے پُراسرار خطے میں، جس کا اس کے ذہن میں انتہائی مبہم سا خیال تھا۔ اس رات

کافی دیر گئے اس نے زیرِ مطالعہ کتابوں کو ایک طرف رکھا، تھکی ہوئی آنکھوں کو ملا اور اپنی کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس لمحے ایک متبادل خود بخود اس کے ذہن میں آیا پوری وضاحت کے ساتھ، اگر یہ بے نظری کا معاملہ ہے تو مریض اس وقت وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوگا جو وہ اب تک دیکھتا رہا تھا، مطلب یہ کہ اس کی قوتِ بینائی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی ہوتی صرف اس کا دماغ، کرسی کو، جہاں کہیں بھی وہ پڑی ہو، شناخت کرنے کی اہلیت کھو بیٹھا ہوتا دوسرے لفظوں میں وہ بصری نس کی طرف رہنمائی کرنے والے منور ہیجان کے خلاف اپنا درست ردِعمل جاری رکھتا۔ عام فہم اصطلاحات میں یوں سمجھ لیجیے کہ وہ اُس چیز کو جاننے کی، جسے وہ جانتا تھا، اور مزید برآں، اُسے بیان کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوتا۔ مکمل بے بصری یا اندھا پن تو شک و شبہ سے بالا ہے، اگر واقعی ایسا ہوتا تو مریض کو ہر چیز سیاہ دکھائی دیتی، مکمل بے بصری کے حوالے سے، اگر آپ میرے دیکھنے کے فعل کے استعمال کو معاف فرمائیں۔ اندھے آدمی نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ دیکھ سکتا ہے، اگر آپ اس فعل کے دوبارہ استعمال کو معاف فرمائیں، ایک گاڑھا، اور ایک ہی طرح کا سفید رنگ، جیسے وہ ایک دودھیا سمندر میں غوطے لگا رہا ہو۔ سفید مکمل بے بصری، علم صَرف کے مطابق متضاد تو ہے ہی، ایک عصبیاتی امرِ محال بھی ہے کیونکہ وہ دماغ، جس کے لیے حقیقی تمثالیں، شکلیں اور رنگ ناقابلِ ادراک ہوں گے، ویسے ہی سفیدی میں مسلسل سفیدی کے غلاف میں لپٹا ہوا ہونا بھی ناقابلِ ادراک ہوگا، جیسے رنگوں، شکلوں، تمثالوں کے بغیر کوئی سفید تصویر درست بینائی والے کسی شخص کو نظر آئے، چاہے درست بینائی کے بارے میں کسی حتمی انداز سے کہنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ صاف ضمیر کے ساتھ ایک بند گلی میں رُک جانے پر ڈاکٹر نے مایوسی سے اپنا سر ہلایا اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی پہلے ہی اپنے بستر کی طرف جا چکی تھی، اُسے دھندلا سا یاد آیا کہ وہ ایک لمحے کے لیے اُس کے پاس آئی تھی، اُس نے اس کے سر کو چوم کر یقیناً بتایا ہوگا میں تو چلی سونے، فلیٹ میں اب خاموشی تھی، کتابیں میز پر بکھری ہوئی، یہ کیا ہوا، اس نے دل ہی دل میں کہا اور اچانک اُسے خوف محسوس ہوا، جیسے اب کسی بھی لمحے وہ خود بھی اندھا ہونے والا ہو اور اُسے یہ پہلے سے معلوم تھا۔ وہ اپنا سانس روکے انتظار کرتا رہا۔ کچھ نہیں ہوا۔ یہ ایک لمحے کے بعد ہوا جب وہ الماری میں واپس رکھنے کے لیے کتابیں اکٹھی کر رہا تھا۔ پہلے اس نے محسوس کیا کہ اُسے اپنے ہاتھ نظر نہیں آتے، پھر وہ جان گیا کہ وہ اندھا ہو چکا ہے۔

کالے چشمے والی لڑکی کا مرض کچھ ایسا سنگین نہیں تھا، اس کی آنکھ کے ڈھیلے کی جھلی پر معمولی

ورم تھا، جو ڈاکٹر کے تجویز کردہ قطروں (Drops) کے استعمال سے فوراً ختم ہوجائے گا، تمہیں پتہ ہے کیا کرنا ہے؟ آئندہ چند روز سونے سے پہلے صرف اپنا چشمہ اتار دیا کرو، یہ مذاق وہ برسوں سے دہراتا چلا آرہا تھا، ہم یہ بھی فرض کرسکتے ہیں کہ یہ مذاق ماہرینِ آشوبِ چشم کو نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آیا ہے لیکن ناکام کبھی نہیں ہوا، ڈاکٹر بھی کہتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور مریضہ بھی سُنتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس موقع پر یہ مسکراہٹ کارآمد بھی تھی کیونکہ لڑکی کے دانت خوبصورت تھے اور وہ اُن کی نمائش کرنا بھی جانتی تھی، مردم بیزاری کی وجہ سے یا زندگی میں بہت سی مایوسیوں سے واسطہ پڑنے کے سبب، کوئی بھی عام شکی مزاج جو اس عورت کی زندگی کی تفصیلات سے واقف ہو، اشارتاً کہہ سکتا ہے کہ اُس کی حسین مسکراہٹ اُس کے پیشے کا ایک گُر تھی، ایک خواہ مخواہ کا ظالمانہ دعویٰ، اس لیے کہ اُس کی مسکراہٹ اس وقت بھی ایسی ہی تھی جب وہ ابھی دودھ پیتی تھی۔ یہ الفاظ اب کم کم ہی سننے میں آتے ہیں، جب اُس کا مستقبل ایک بند کتاب تھا اور اُس کو کھول کر دیکھنے کا تجسس ابھی پیدا نہیں تھا۔ سادہ لفظوں میں اس عورت کو طوائفوں کے طبقے میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ جس زمانے کا یہاں ذکر ہے، اُس کے سماجی تعلقات کے تانے بانے کی پیچیدگی، چاہے دن کے معاملات ہوں یا رات کے، اُفقی ہوں یا عمودی، ہم سے، جلد بازی اور حتمی فیصلے سنانے کے رجحان سے احتراز کرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ ایک ایسا جنون جس سے ہم اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بنا پر شاید کبھی چھٹکارا نہ پاسکیں گے۔ اگرچہ یہ جاننے کا امکان تو ہوسکتا ہے کہ جونو (Juno) میں بادل کی مقدار کتنی ہے لیکن یونانی دیوی کے ساتھ خلط ملط پر اصرار کلیتاً جائز نہ ہوگا جو کہ ماحول میں ڈولتے ہوئے پانی کے قطروں کے معمولی ارتکاز سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ عورت پیسوں کی خاطر مردوں کے ساتھ ہم بستر ہوتی ہے، یہ حقیقت بغیر کسی مزید سوچ بچار کے ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ہم اسے طوائفوں کے طبقے میں شمار کریں۔ لیکن چونکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ صرف اُسی وقت کسی مرد کے ساتھ جاتی ہے جب اُس کا جی چاہتا ہے اور جس کے ساتھ جانے کو اُس کا جی چاہتا ہے، اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس حقیقی فرق کی وجہ سے پیش بینی کے طور پر اُسے طوائفوں کے طبقے سے علیحدہ رکھا جانا چاہیے۔ اُس کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک پیشہ ہے اور عام لوگوں کی طرح وہ اپنے وقت کا فائدہ اٹھاتی ہے، اپنے جسم سے لطف اندوز ہونے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کی خاطر، انفرادی اور عمومی دونوں اگر ہم اسے کسی ابتدائی تعریف تک محدود کرنے کی کوشش نہ کریں، تو بالآخر ہم وسیع تر معنوں میں یہ کہیں گے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق

زندگی گزارتی ہے، مزید برآں زندگی سے جتنا لطف اندوز ہو سکتی ہے، ہوتی ہے۔

جب وہ ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکلی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنا کالا چشمہ نہیں اُتارا، سڑک کی روشنیاں اسے پریشان کر رہی تھیں، خاص طور پر روشن اشتہارات۔ وہ ایک دوا فروش کی دوکان میں داخل ہوئی تاکہ ڈاکٹر کے تجویز کردہ قطرے خرید سکے، اس نے کوئی توجہ نہ دینے کا فیصلہ کیا جب اس شخص نے جو اسے دوا دے رہا تھا، کہا کہ بعض آنکھوں کو کالے چشمے کے پیچھے چھپائے رکھنا کتنی بے جا بات ہے، ایک فقرہ جو نامناسب ہونے کے علاوہ، اور ایک دوا فروش کے ملازم کے مُنھ سے نکلا ہوا اس کے اس یقین کے خلاف بھی تھا کہ سیاہ چشمہ اس میں ایک پُر اسرار کشش پیدا کرتا ہے اور راہ چلتے مردوں کی دلچسپی کو ابھار سکتا ہے، شاید وہ اس کا جواب دیتی اگر آج واقعی کوئی شخص اس کا انتظار نہ کر رہا ہوتا، ایک مڈبھیڑ جو اس کے لیے کسی اچھی چیز کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی، مادی منفعت اور دوسری تسکین دونوں کے لحاظ سے وہ شخص جس سے کہ ملنے والی تھی اس کا پرانا شنا سا تھا، وہ اسے پہلے ہی بتا دیتی تھی کہ وہ چشمہ نہیں اتارے گی اور وہ برا نہیں مانتا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر نے اُسے ابھی یہ حکم نہیں دیا تھا اور یہ بات اُس شخص کو دلچسپ بھی لگتی تھی اور جداگانہ بھی۔ دوا فروش کی دوکان سے نکلنے کے بعد لڑکی نے ایک ٹیکسی والے کو روکا اور اسے ہوٹل کا نام بتایا۔ سیٹ سے ٹیک لگائے لگائے وہ تصور ہی تصور میں لطف اندوز ہونے لگی، اگر یہ اصطلاح موزوں ہے، متعدد اور گونا گوں حسّی لذتوں کی سنسنی خیزیوں سے، اُس پہلے آشنا بوسۂ لب سے، اُس پہلی بے تکلف ہم آغوشی سے، عالم مستی کے پے در پے ہونے والے دھماکوں تک، جو اُسے مضمحل اور مسرور چھوڑ جائیں گے، جیسے وہ مصلوب ہونے والی ہو۔ خدایا، ہماری حفاظت کر، چکراتی چکا چوند کرتی آتش بازی میں۔ اس لیے ہمارے پاس یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کئی وجوہات ہیں کہ اگر کالے چشمے والی لڑکی کا ساتھی، اپنی ذمے داری کو پورا کرنا جان گیا ہے، صحیح وقت کے تعین اور تکنیک کے لحاظ سے تو وہ ہمیشہ پیشگی اور اس کے مُنھ مانگے معاوضے سے دوگنا ادا کرتا ہے۔ ان خیالوں میں کھوئے کھوئے، چونکہ وہ ابھی ابھی ڈاکٹر کی فیس ادا کر کے آ رہی تھی، اس نے اپنے آپ سے پوچھا آیا یہ اچھا نہ ہوگا اگر وہ آج ہی سے اپنا معاوضہ بڑھا دے، جس بات کو وہ ہنسی ہنسی میں کرنے کی عادی تھی۔

اُس نے ٹیکسی والے کو اپنی منزلِ مقصود سے ایک گلی پہلے ٹیکسی روکنے کا حکم دیا۔ اُتر کر اُسی طرف جانے والے لوگوں میں شامل ہو گئی جیسے وہ انہی کے ساتھ چلی جا رہی ہو۔ گمنام اور احساسِ جرم اور شرم کے ظاہری آثار کے بغیر، وہ فطری انداز سے ہوٹل میں داخل ہوئی اور بار کی طرف

جانے والے گلیارے میں سے گزرتی بار میں پہنچ گئی۔ وہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آ گئی تھی اس لیے اُسے انتظار کرنا تھا، ملاقات کا باقاعدہ وقت طے کیا گیا تھا۔ اُس نے ایک ہلکے مشروب کا آرڈر دیا اور کسی طرف دیکھے بغیر مزے مزے سے پیتی رہی، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے غلطی سے مردوں کی تلاش میں رہنے والی عام کسبی سمجھا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد جیسے کوئی سیاح لڑکی دوپہر کسی میوزیم میں گزارنے کے بعد آرام کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف جاتی ہے، وہ لفٹ کی جانب بڑھی۔ نیکوکاری کو، اگر کوئی شخص اب بھی اس حقیقت کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا، تکمیل کے کٹھن راستے میں ہمیشہ گڑھے ملتے ہیں، لیکن بدکاری اور گناہ قسمت کے اتنے چہیتے ہیں کہ وہ ابھی وہاں پہنچی ہی تھی کہ لفٹ کا دروازہ کھلا۔ دو مہمان باہر آئے، بڑی عمر کا ایک جوڑا، وہ اندر داخل ہوئی، تیسرے فلور کا بٹن دبایا، کمرہ نمبر تین سو بارہ اُس کا منتظر تھا، یہی ہے، اس نے احتیاط سے دروازے پر دستک دی، دس منٹ کے بعد وہ برہنہ تھی، پندرہ منٹ بعد کراہ رہی تھی، اٹھارہ منٹ بعد وہ سرگوشیوں میں محبت کی باتیں کر رہی تھی کہ اسے اب کسی تصنع کی ضرورت نہیں تھی، بیس منٹ بعد وہ دیوانی ہونے لگی، اکیس منٹ کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اُس کا جسم لذت. اور مستی سے پاش پاش ہوا جاتا ہے، بائیس منٹ کے بعد وہ پکار اُٹھی، اب، اب، اور جب دوبارہ اپنے حواس میں آئی تو تھکن اور مسرت کے عالم میں بولی، مجھے اب تک ہر چیز سفید دکھائی دیتی ہے۔

ظفر اقبال

یادش بخیر

چودھری نذیر احمد (مرحوم) صحیح معنوں میں ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے جو خود کم ہنستے اور دوسروں کو زیادہ ہنساتے تھے۔ میری شاعری ابھی نہایت ابتدائی مراحل میں تھی جب میں دیکھتا تھا کہ وہاں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بدین، کرشن چندر اور ناصر کاظمی وغیرہ اس طرح حاضری دیتے جیسے کسی بارگاہ میں آئے ہوئے ہوں۔ پاک ٹی ہاؤس کی رونقیں شام کے بعد شروع ہوتیں لیکن شاعروں، ادیبوں کا جمگھٹا دن بھر یہیں لگا رہتا تھا۔ حنیف رامے ان دنوں مکتبۂ جدید کی بالائی منزل پر بیٹھا کرتے جبکہ نیا ادارہ چودھری صاحب سے معمور رہتا۔

میں ایک بار، جب میں گورنمنٹ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا، ڈرتے ڈرتے اپنی کچھ غزلیں سویرا کے لیے رامے صاحب کے پاس لے گیا۔ غزلیں انہوں نے رکھ لیں اور کہا کہ چند روز بعد آ کر معلوم کر لیں۔ میں گیا تو وہ بولے کہ ان میں کہیں ناصر کاظمی بولتا ہوا نظر آتا ہے تو کہیں منیر نیازی۔ بہرحال ایک غزل انہوں نے رکھ لی جو ''آبِ رواں'' کی پہلی غزل ہے اور جو سویرا میں غزلوں کے آخر پر شائع ہوئی جب کہ سامنے والے صفحے پر، جہاں سے افسانے شروع ہوتے تھے، کرشن چندر کا افسانہ تھا۔ اس نام کے سامنے اپنا نام دیکھ کر میں نے اپنے اندر ایک نشہ سا اُترتا ہوا محسوس کیا۔

میری ایک غزل میں یہ شعر دیکھ کر چودھری صاحب ہنس پڑے ۔

چُپ رہو گر معترض بھی ہوں مدیرانِ کرام
مستند سمجھو انہی کو شاعری کے باب میں

اور بولے، اچھا..... ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں؟ اور کافی دیر تک ہنستے رہے، حالانکہ

انہوں نے کسی بھی شعر پر کبھی انگلی نہ رکھی تھی۔ میں چونکہ زیادہ تر اوکاڑے ہی سے آتا تھا، اس لے اگر وقت ملتا ہی تو سویرا کا چکر لگاتا۔ میری کتاب چھاپنے کی حامی تو انہوں نے بھر لی لیکن جب کچھ زیادہ ہی تاخیر ہوگئی تو میں نے کہا، اگر آپ اجازت دیں تو ایک اور پبلشر سے چھپوالوں جو آمادہ ہے تو بولے، یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ کتاب میری "منگ" ہے اور کبھی کسی نے اپنی منگ (منگیتر) کو بھی چھوڑا ہے؟ یہ کتاب میں ہی چھاپوں گا۔ انہوں نے "آبِ رواں" نام بھی خود ہی رکھا جس پر حنیف رامے نے ایک یادگار ٹائٹل بنایا جو بعد کے تین ایڈیشنوں تک بھی چلا۔

جس دن انہوں نے مجھ سے کتاب کا مسودہ لیا، وہ مجھے سامنے "نعمت کدہ" ہوٹل میں لے گئے اور کھانا کھلایا جس میں مرغ بھی شامل تھا۔ ان دنوں مرغ کا سالن باقاعدہ ایک عیاشی ہوا کرتی تھی کیونکہ اس وقت برائلر کا ابھی نام ونشان تک نہ تھا اور مرغ کی اتنی بے قدری نہ ہوئی تھی۔ یاد ہے کہ یہ کھانا ہی میری پہلی کتاب کی رائلٹی تھی۔ کتاب چھپی تو اسے بہترین کتاب کا پروڈکشن پرائز بھی دیا گیا جبکہ آدم جی ایوارڈ جعفر طاہر لے گئے کیونکہ وہ سینئر تھے اور ان کے ہاتھ بھی کافی لمبے تھے۔ واضح رہے کہ آبِ رواں کا پہلا ایڈیشن ٹائپ میں شائع ہوا تھا۔

بعد میں جب پرچے کا انتظام ریاض احمد چودھری کے کاندھے پر آن پڑا تو حنیف رامے کے علاوہ محمد سلیم الرحمٰن اور صلاح الدین محمود بھی ادارت میں آشامل ہوئے تھے جبکہ سویرا کا ایک شمارہ میری ادارت میں بھی شائع ہوا۔ سویرا ایک ترقی پسند جریدہ تھا جو چودھری صاحب کی زندگی تک پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اسی ڈگر پر قائم رہا۔ سمن آباد میں واقع چودھری صاحب کے گھر بھی جانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ پھر رامے صاحب سیاست میں پڑ گئے لیکن ہر بار سویرا کا ٹائٹل اُنہی کے موقلم کا نتیجہ ہوا کرتا تھا۔

میں لاء کالج میں تھا تو ہم نے راوی کی طرز پر وہاں سے بھی ایک ادبی میگزین "میزان" کا اجراء کیا جس کا ایڈیٹر میں تھا اور اسسٹنٹ ایڈیٹر افتخار جالب جو لاء کالج ہی میں میرے کلاس فیلو تھے۔ لاء کرنے کے بعد میں نے اوکاڑہ میں پریکٹس شروع کردی جبکہ افتخار جالب الائیڈ بینک میں ملازم ہوگئے۔ بہرحال میزان کا وہ پہلا شمارہ ایک یادگار تھا جس میں ناصر کاظمی، منیر نیازی، انجم رومانی، صفدر میر اور شہرت بخاری وغیرہ کی تخلیقات بطور خاص شامل تھیں۔ ہمارے بعد اس کے چند شمارے شائع تو ہوئے لیکن وہ معیار باقی نہ رکھا جاسکا۔

خود حنیف رامے ایک بے پناہ شخصیت کے حامل تھے جو ان کے پدری جینز کا تقاضا بھی تھا۔

مصوری اور بالخصوص خطاطی میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انہی دنوں انہوں نے لاہور سے ایک صاف ستھرا ہفت روزہ ''نصرت'' کے نام سے بھی نکالا، ہر ماہ جس کا ادبی شمارہ بھی شائع ہوا کرتا جس کا ایک اپنا معیار تھا اور جو بہت جلد شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا اور اس کا شمار انتہائی قابلِ ذکر رسالوں میں ہونے لگا۔ لیکن بعد میں جب رائے صاحب سیاست میں گوڈے گوڈے دھنس گئے تو یہ پرچہ بند کرنا پڑا۔

ایک دفعہ بیٹھے تھے کہ وہ آہستہ آہستہ کسی سے مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ اب ٹھیک بھی ہو جاؤ، کیوں مجھے تنگ کر رہے ہو، ایسے تو نہیں کیا کرتے، آخر اتنے برسوں کا ساتھ ہے۔ پاس میرے سوا کوئی بھی بیٹھا نہ تھا، میں نے حیران ہوکر پوچھا، کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ بولے، یہ گوڈا مجھے تنگ کر رہا ہے، اسے سمجھا رہا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں جب انہوں نے کتابوں کے ٹائٹل بنانا چھوڑ دیے تھے تو میری خصوصی فرمائش پر انہوں نے میری زیرِ طبع تین کتابوں کے ٹائٹل بنا دیے جن میں ''تفاوت'' ہی شائع ہو سکی جبکہ بقیہ دونوں ٹائٹل کہیں اِدھر اُدھر ہوگئے۔

رائے صاحب بتاتے ہیں کہ جب ۷۰ء میں پیپلز پارٹی نے الیکشن جیتا تو غالباً پہلا جلسہ انہوں نے سرگودھا میں رکھا جہاں اسٹیج پر مصطفیٰ کھر نے ایک ایس پی کو تھپڑ نکال مارا تھا۔ بھٹو صاحب جب تقریر کر چکے تو دیکھا کہ اسٹیج کے سامنے ہی ایک عورت اپنے بچے کو بازوؤں میں لہراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ بھٹو صاحب نے رائے صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے تو رائے صاحب نے کہا کہ یہ آپ کی تقریر سے متاثر ہوکر اپنا بیٹا آپ پر قربان کرنے کا اعلان کر رہی ہے تو بھٹو صاحب بولے:

"The bitch doesn't know I don't mean what I say."

یہ دونوں اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی اور ہماری غلطیاں معاف کرے۔ بھٹو صاحب جیسے کہ خوش طبع آدمی تھے، زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ بات انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے ہی کہی ہو۔

سویرا کی چودھری صاحب نے ایسی بنیاد رکھی کہ اس کا شمار برصغیر کے ممتاز ترین اور ثقہ ترین ادبی رسائل میں ہوتا تھا بلکہ یہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا تھا جس میں شائع ہونا اردو دنیا کا ہر شاعر، ادیب اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہم عصر اور چوٹی کے ادبا کی نظم و نثر پر مشتمل معیاری کتابیں بھی شائع کیں جو اپنے معیارِ طباعت میں بھی بے مثال تھیں،

بلکہ زیادہ اہم کتابوں کے پیپر بیک ایڈیشن چھاپنے کی بھی طرح اُنھی نے ڈالی۔ ''گلافتاب'' کے مجلد کے ساتھ ساتھ اس کا پیپر بیک ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا جس کا ٹائٹل بھی رامے صاحب ہی کا تیار کردہ تھا۔

رامے صاحب نے ایک وقت میں شاعری بھی کی۔ میں نے چند سال پیش تر جب ''ادبیات'' کا ایک شمارہ ترتیب دیا تو اس میں ان کے خاص رفیقِ کار شیخ صلاح الدین پر لکھی ہوئی ان کی ایک نظم بھی شائع کی گئی تھی۔ بعد میں انھوں نے مجھے رائے کے لیے اپنی نظموں کا مسودہ بھجوایا جس پر میں نے انھیں کہا کہ آپ اتنا عظیم کام کر چکے ہیں کہ آپ کو شاعر ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ تاہم ان کی وفات سے پہلے ان کا مجموعۂ منظومات زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مارکیٹ میں آ چکا تھا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

O

فکر و ادب سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں ان دنوں ایک بحث بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ اس بحث کے مضمرات وسیع ہیں مگر اس کا آغاز ایک ادبی انعام کے اعلان سے ہوا۔ عصر جدید کے دو اہم ناول نگاروں مارگریٹ ایٹ وڈ اور امیتاو گھوش کو اسرائیل میں ڈین ڈیوڈ انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ زور دار مخالفت اور رائے عامہ کے شدید دباؤ کے باوجود ان دونوں ادیبوں نے اعلان کیا کہ وہ انعام قبول کرنے سے انکار نہیں کریں گے اور پھر چند ماہ بعد اسرائیل جا کر یہ انعام وصول کر لیا۔

کینیڈا سے تعلق رکھنے والی ناول نگار مارگریٹ ایٹ وڈ، جنہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غیر افسانوی مضامین بھی، اس وقت انگریزی زبان کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے ناول اپنے سماجی سروکار اور فکری صلابت کی وجہ سے نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے ایک ناول کا تلخیص شدہ ترجمہ حال ہی میں فہمیدہ ریاض نے کیا ہے اور ان کا ایک افسانہ، دنیا زاد میں شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی ناول نگار امیتاو گھوش نے ایک سے ایک عمدہ ناول لکھ کر صفِ اول کے ادیبوں میں اپنے لیے جگہ بنا لی ہے۔ چند سال قبل وہ لاہور بھی آئے تھے اور ایٹمی دھماکے کے بعد پاکستان کا احوال انہوں نے ایک فکر انگیز مضمون میں درج کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ نمایاں ادیب ہیں اور عالمی شہرت کے حامل۔ لیکن یہ معاملہ دو ادیبوں کی ذاتی رائے کا نہیں بلکہ اس بحث میں کئی سوال زیر گفتگو آئے ہیں۔ کیا ادیب کی کوئی نمائندہ حیثیت ہے؟ اور اس حیثیت کے تحت وہ اپنے پڑھنے والوں کے وسیع حلقے کے سامنے جواب دہ ہے؟ کسی بھی ادیب کے سیاسی، سماجی رویے سے بڑھ کر اس کا 'عوامی کردار' (پبلک رول) کیا ہے اور اس کو نبھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

''ادیب جو نہیں کہتے یا نہیں کرتے، کبھی کبھار وہ بھی اتنا ہی معنی خیز ہوتا ہے جتنا کہ ان کا کہا ہوا یا لکھا ہوا...'' معروف اخبار ''ہندو'' کی ذیلی اشاعت لٹریری ریویو میں چھ جون ۲۰۱۰ء کو پریمودا گوپال نے لکھا۔ ان کے مطابق، اس تنازعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان کے استعمال اور کہانی کے ہنر کے حامل وہ لوگ جن کے گرد ان کے پسند کرنے والوں کا حلقہ بن جاتا ہے، بعض دفعہ ''انہیں حقیقی زندگی میں ان اخلاقی معاملات کی نمائندگی کی مشکل ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے جو ان کی افسانوی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔'' معروف ادیب اور صحافی مسعود اشعر نے، جنہوں نے حال ہی میں فلسطین کی ابتلاء پر سوزن ابوالہوا کے ناول ''زخم کے نشان'' کا ترجمہ کیا ہے، ہماری

توجہ اس بحث کی طرف مبذول کرائی اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ادیب کے عوامی روپ اور عالمی ضمیر کے سامنے جواب دہی کے ساتھ ساتھ اس دور میں ناول کی دسترس اور طاقت کے بھی کئی زاویے اس بحث کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔

اس نزاعی معاملے سے متعلق چند تحریریں دنیا زاد کے قارئین کے لیے حاضر ہیں۔ مارگریٹ ایٹ وڈ اور امیتاوگھوش نے اس انعام کے لیے ایک مشترکہ تقریر کی جس کا متن شائع بھی ہوا۔ مارگریٹ ایٹ وڈ کے نام غزہ کے طلباء کا کھلا خط، اس طرح کی اپیلوں میں سے ایک ہے جو انٹرنیٹ پر جاری کی گئی ہیں۔ ایسے بہت سے مراسلے خطابت اور جذبات سے معمور ہیں اور ممکن ہے کہ اپنے طور پر حق بجانب ہوں لیکن یہ کھلا خط اپنی متانت کے ساتھ بہت موثر ہے اور اپنی دستاویزی اہمیت کی وجہ سے بحث کے ایک جزو کے طور پر یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ امیتاوگھوش نے ہندوستان کے رسالے آؤٹ لک انڈیا کے ایک نجی ای میل کے جواب میں باضابطہ بیان کے بجائے اپنا جوابی ای میل پیش کیا جو اسی رسالے میں شائع ہوا۔ گوئین ایکرمین صحافی ہیں جو بلوم برگ نیوز سے وابستہ ہیں۔ مارگریٹ ایٹ وڈ سے ان کی گفتگو (۱۰ مئی ۲۰۱۰ء) بلوم برگ کی ویب سائٹ سے لی گئی ہے۔

امیتاو گھوش اور مارگریٹ ایٹ وڈ
ترجمہ: آصف فرخی

ڈین ڈیوڈ انعام کی تقریر اور اس کا تناظر

امیتاو گھوش: چوں کہ ہم اس فراخ دلانہ انعام میں شراکت دار ہیں، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مشترکہ تقریر کریں۔ ہم دونوں ان مہربان الفاظ کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں جو آپ نے ہمارے بارے میں اور ہماری تحریروں کے بارے میں ادا کیے۔

مارگریٹ ایٹ وڈ: یہ انعام محض افراد کو نہیں بلکہ کارکردگی کے مختلف علاقوں کو اعزاز بخشتا ہے۔ اس سال آپ نے دو ناول نگاروں کو دعوت دینے کا انتخاب کیا ہے اور یوں ناول کے فن کو مختلف علوم وفنون کی بہت ہی معزز فہرست میں شامل کر لیا ہے جس میں ایسٹروفزکس سے لے کر طب اور موسیقی اور امورِ ریاست شامل ہیں۔

امیتاو گھوش: ہم میں سے ایک کا تعلق ہندوستان سے ہے اور دوسرے کا کینیڈا سے۔ ان میں سے کوئی ملک بھی تاریخ کے خون خرابے اور موجودہ دور کی عدم مساوات سے عاری نہیں۔

مارگریٹ ایٹ وڈ: ہم میں سے کوئی بھی برخود غلط ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

امیتاو گھوش: ہم دونوں سے مختلف لوگوں اور گروہوں نے اصرار کیا کہ اس موقعے پر اسرائیل نہ آئیں۔ ہم کو بتایا گیا کہ کسی فن کار کو یہاں منعقد کسی ثقافتی تقریب میں شریک نہیں ہونا چاہیے — وہ تقریب چاہے کتنی امید افزا اور میانہ روی کی حامل کیوں نہ ہو — اس خیال سے کہ مقبوضہ علاقوں میں فلسطینی عوام کی حالت غیر منصفانہ، عدم مساوات کی حامل، دُرشت اور خطرناک ہے۔

مارگریٹ ایٹ وڈ: جب ہم نے یہ کہا کہ ہمیں بہت ہمدردی ہے مگر اس کے باوجود ہم دروازے کھلے رکھنے کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں — جس طرح بعض ایسی تنظیمیں بھی جن کے

ساتھ ہم کام کرتے آئے ہیں— ہمیں اطلاع دی گئی کہ ہم مبتلائے فریب ہیں اور اسے بھی بدتر۔

امیتاو گھوش: مگر ناول نگار ہٹ دھرم ہوتے ہیں: جب کم عمر تھے تو انہوں نے ناول نگاری ترک کر دینے سے انکار کیا، اپنے خاندان کے پریشان مشوروں کے باوجود۔ جتنا زیادہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ان معاملات کو پسِ پشت ڈال دیں، اسی قدر ہم اپنے طور پر دیکھنا اور گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔
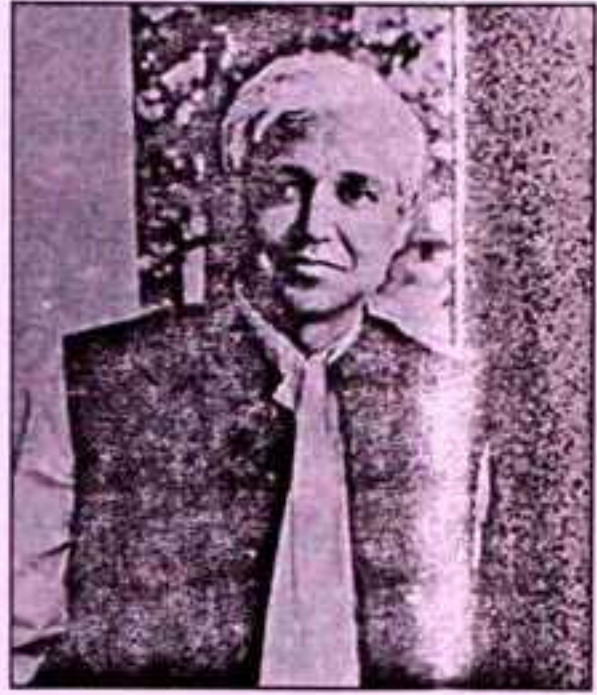
مارگریٹ ایٹ وڈ: پروپیگنڈا مطلق کیفیات سے منسلک ہوتا ہے: ہاں اور نہیں میں۔ مگر ناول تو نازک معاملات کی مخلوق ہے: شاید اور ہو سکتا ہے کی مخلوق۔ وہ اپنا معاملہ، دیوتاؤں اور راکششوں سے نہیں بلکہ اخلاق برتنے والے لوگوں سے رکھتا ہے، ان کے نقص زدہ کرداروں سے، ان کے غیر اطمینان بخش جسموں سے، ان کے دکھ درد سے، ان کے محدود اور اکثر غلط فیصلوں سے، ان کے عمل کی بے اعتباری سے اور ان کی تقدیر کی بے انصافی سے۔

امیتاو گھوش: ناول لکھنے کے لیے بسا اوقات آپ کو زندگی کو ان لوگوں کی آنکھوں سے بھی دیکھنا پڑتا ہے جن سے آپ اتفاق نہیں رکھتے۔ یہ کثیر آواز والی (Polyphonic) صنف ہے۔ یہ تمام انسانوں کی پیچیدہ انسانیت کے لیے التجا کرتی ہے۔

مارگریٹ ایٹ وڈ: وہ عوامی علاقہ جس کا ناول نگار دفاع کرتا ہے، بہت مختصر سا ہے، ایک جمہوری معاشرے میں بھی۔ یہ آزادانہ تخلیق، امکانات کا منطقہ ہے۔ یہ منطقہ ان تمام باتوں کی یادآوری کی اجازت دیتا ہے جن کو فراموش کر دیا گیا، جسے دفن کر دیا گیا اسے کھود کر نکالنے کی اجازت۔

امیتاو گھوش: ساری دنیا میں ناول نویسی مستقل دباؤ میں ہے، ان سیاسی گروہوں کی طرف سے بھی جو اسے زیرِ دام لانا چاہتے ہیں اور ان طاقت ور حکومتوں کی طرف سے بھی جو اسے خاموش کر دینا چاہتی ہیں۔ دنیا بھر میں ناول نگاروں کو گولی ماری گئی ہے، قید خانے میں ڈالا گیا ہے اور جلاوطن کیا گیا ہے محض اس وجہ سے کہ وہ کسی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں ناکام رہتے ہیں۔ مگر وہ کہانیاں لکھنا جاری رکھتے ہیں۔

مارگریٹ ایٹ وڈ: شاید ہمارا یہ ہنر بہت جلد متروک ہو جائے۔ اس لیے کہ ہمارے سیارے

میں ایک ڈراؤنی تبدیلیِ ماحول ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ سیلاب اور خشک سالی، صحرا اور قحط اور وبائیں — کیا یہ دنیا کو اور بھی زیادہ تباہ کن تصادم میں مبتلا کر دیں گی؟

اینتاوگھوش: یا پھر ہم آزادانہ طور پر اکٹھے ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی مدد کریں گے، جیسے بہت سی تنظیمیں اور مذہبی گروہ اور ماہرینِ ماحولیات اور سائنس داں اور فن کار آج بھی کر رہے ہیں؟

مارگریٹ ایٹ وڈ: ہم دونوں یہاں نیک نیتی سے موجود ہیں اس لیے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہاں بھی اور پوری دنیا میں بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس طرح سوچتے ہیں جس طرح ہم سوچتے ہیں۔

اینتاوگھوش: امید وہاں کہیں ہم سے الگ نہیں۔ لوگ جو کہانیاں سناتے ہیں، ان کہانیوں کی طرح یہ بھی اندر سے آتی ہے۔ ان کہانیوں کی طرح امید کو بھی دوسروں تک منتقل کرنا چاہیے۔ امید چھوڑ دیں تو ہم واقعی کام سے گئے۔

تناظر

یہ مشرقِ وسطیٰ میں بڑا کانٹے کا وقت ہے۔ فلسطین اور اسرائیل میں قربت کے (proximity) مذاکرات عین اسی وقت بحال ہو رہے ہیں، جن کو امریکا کے جارج مچل کی وساطت سے عمل میں لایا جا رہا ہے۔

وہ تمام لوگ جو فلسطینی عوام کے لیے موقع چاہتے ہیں کہ وہ ایک باوقار زندگی گزار سکیں، زیادتی کے نتیجے میں جو کھو دیا ہے اور اپنے انفرااسٹرکچر کی تباہی اس کا معاوضہ حاصل کر سکیں، اور وہ تمام لوگ جو امید رکھتے ہیں کہ اسرائیلی بھی راکٹ حملے، بم باری اور اس سے بھی بدتر کے خوف کے بغیر زندگی گزار سکیں گے — ان مذاکرات کے خیر خواہ ہوں گے اور یقین کرنا چاہیں گے کہ جو لوگ ان میں شامل ہیں وہ پوری سنجیدگی اور نیک نیتی کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ دو ریاستوں پر مشتمل منصفانہ اور مستحکم حل آخرکار سامنے آئے گا۔

دریں اثناء ہم دونوں افسانہ نگار اپنے آپ کو اسرائیل میں پاتے ہیں جہاں ہم میں سے ہر ایک کو ڈین ڈیوڈ انعام کے "موجودہ" شعبے میں نصف ملا ہے۔

یہ انعام ایک نجی فرد نے قائم کیا ہے اور اس کا انتظام اس کا علیحدہ دفتر چلاتا ہے جو تل ابیب یونی ورسٹی میں واقع ہے۔ اس پر حملہ کرنے والوں نے ہمیں جو بتایا ہے اس کے برخلاف یہ انعام

اسرائیل کی ریاست کا مترادف نہیں ہے۔ اس سال پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ یہ انعام دو ناول نگاروں کو دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ان تین مذاہب کا رُکن نہیں ہے جو کرّہ زمین کے اس حصے کو اپنی ارض مقدس سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہم دو ناول نگار ان عہد آفریں سیاسی واقعات کے سامنے واقعی معمولی حیثیت رکھتے ہیں جو اب برپا ہو رہے ہیں۔ مگر ہر جگہ ادیب ایک آسان ہدف بن جاتے ہیں۔ ان پر حملہ کرنا آسان ہے۔ ان کے پاس فوج نہیں ہوتی، وہ جوابی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ہم دونوں کو کئی خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں اصرار کیا گیا ہے بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ شرکت نہ کریں، اس وجہ سے کہ اسرائیل سے منسلک ہر شے ممنوعہ ہے۔ (عجیب بات یہ ہے کہ نہ تو اٹلی کے صدر جیورجو ناپولی ٹانو— ''ماضی'' کے شعبے میں سیاسی کاموں میں منطق اور میانہ روی کی بنا پر انعام یافتہ— اور نہ تین کمپیوٹر سائنس داں، لیونارڈ کلائن روک، گورڈن مور اور مائیکل رابن— جن کو ''مستقبل'' کے شعبے میں انعام دیا گیا— ان خطوط نویسوں کا ہدف نہیں بنے۔) ہم دونوں نے ان میں سے سب نہیں مگر بہت سے اصرار کرنے والوں اور حکم دینے والوں کو خط لکھے ہیں۔ (سب کو نہیں، اس لیے کہ بعض عرض داشت وغیرہ ایسی تھیں جو ہم کو پہلے بھیجے جانے کے بجائے آن لائن آ گئیں۔) جو خطوط ہمیں ملے ہیں وہ بااخلاق اور دل گرفتہ سے لے کر حقیقت پر مبنی اور عملی سے لے کر الزام تراشی پر مبنی، برافروختہ اور اپنے بیانات اور دعووں میں غلط فہمی پر مبنی خطوط شامل ہیں، بعض تو ازالہ حیثیتِ عرفی کے زمرے میں آ سکتے ہیں اور دھمکانے والے ہیں۔ بعض ہماری بات سننے کے لیے تیار ہیں اور بعض نہیں۔ وہ محض ہمارے بظاہر قابلِ قدر ''نام'' استعمال کرنا چاہتے ہیں مگر ہماری اصلی آواز نہیں۔

دوسرے الفاظ میں، یہ ''سب کچھ یا کچھ نہیں'' ہم پر دھونس جما کر ہمیں اپنی ملکیت کی کٹھ پتلیوں میں بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہماری جانب سے ایسے کسی فیصلے کا نتیجہ— علاوہ اور باتوں کے— یہ ہوگا کہ ہمیں ایسی لکڑی میں تبدیل کر دیں جس سے دوسرے فن کاروں کو ضرب لگا کر تسلیم ورضا پر مجبور کیا جا سکے، اور اس سے ہم کو انکار ہے۔ ہم خوب واقف ہیں کہ ایسے حالات کے تحت دوسرے ممالک میں بہت سے فن کاروں کو کس صعوبت سے گزرنا پڑا ہے۔

ہم نے شاید ضرورت سے زیادہ جاسوسی ناول پڑھ ڈالے ہیں، اس وجہ سے ہم نے یہ بھی گمان کیا کہ یہ جوشِ خطابت کے مارے مراسلہ نویس شاید ہمیں اکسانے پر مامور مُفسد ہوں جو ہمیں فلسطینی عوام کے خلاف صف آراء کر دینا چاہتے ہوں۔ (جیسا کہ اکثر بتایا جاتا ہے، انٹرنیٹ پر یہ

کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ درحقیقت آپ ہیں کون؟) بعضوں نے اپنے آپ ہمارے دوست اور مداح ہونے کا دعویٰ کیا ہے جب کہ وہ ایسی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض نے ہم سے اصرار کیا ہے کہ اسرائیل اور اس کے اداروں کو ہاتھ بھی نہ لگائیں جب کہ وہ خود ان سے تعلق قائم کیے رہے ہیں۔ بعض لوگ، جب ہم نے اپنی پوزیشن بیان کردی تو سمجھ دار اور معاون ثابت ہوئے اور پُرمعنی تبادلے کے لیے سہولت فراہم کرنے کے لیے تیار۔ بعض لوگوں نے ہمیں مطلع کردیا کہ وہ بائیکاٹ کے چند حصوں کی توثیق کرتے ہیں مگر ثقافتی حصے کے بائیکاٹ کی توثیق نہیں کرتے، اور اسے ایک نوع کی سنسر شپ سمجھتے ہیں۔ بعض نے عوامی عرض داشتوں پر دستخط کیے — جو ہمیں دکھائی نہیں گئیں — جس کے لیے بعد میں انہوں نے — ہمارے نام نجی خطوط میں — معذرت پیش کی۔ بعض نے ہمیں حکم دیا کہ انعام کی رقم مختلف پارٹیوں کو دے دی جائے، جن میں ان کے دوست بھی شامل ہیں، یا پھر بعض فلسطینی تنظیموں کو دے دی جائے جو درحقیقت ہم سے ایسی کوئی رقم وصول نہیں کریں گی۔ بعض نے ہم سے اس کے سوا کچھ اور نہیں مانگا کہ ہم ان کی بات سمجھیں اور یاد رکھیں۔

ہم ان سب سے کہتے ہیں: ہم انصاف کے خلاف نہیں ہیں اور نہ فلسطینی ریاست کے قیام کے خلاف، جس میں بہت تاخیر ہوچکی ہے۔ ہم نہ کسی کو ''للکار'' رہے ہیں اور نہ کسی کو ''مسترد'' کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہم کسی بھی حکمت عملی پر مبنی کلیہ سازی کی توثیق نہیں کرسکتے، گو کہ ہم اس دباؤ کو سمجھتے ہیں جو اس قسم کی کلیہ سازی کو جنم دیتا ہے اور ہم آپ کو خود بہ خود برا، جاہل، احمق، دوغلا یا کینہ توز نہیں سمجھتے محض اس وجہ سے کہ ذرائع اور منزل کے بارے میں ہمارا تصور وہ نہیں ہے جو آپ کا ہے۔

تو پھر ہماری پوزیشن کیا ہے؟ اس کا خلاصہ اس اقتباس میں بیان کیا جاسکتا ہے جو پی ای این کے امریکی مرکز کے صدر انتھونی آپیہ نے ۲۷/اپریل کو دیا:

> ''آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ مارگریٹ ایٹ وڈ اور امیتاو گھوش جارحیت کا شکار ہوئے ہیں جو ان سے اصرار کیے جارہی ہے کہ اس انعام کو مسترد کردیں، اس عالمی مہم کے حصے کے طور پر جو اسرائیل کو ثقافتی حیثیت میں سب سے الگ کردینا چاہتی ہے۔ اس ملک کی ادبی برادری فلسطین کے مسئلے پر یک آواز گفتگو نہیں کرتی۔ مگر میں اس بارے میں بات صاف کرنا چاہتا ہوں کہ اس آزردہ مسئلے کے ایک پہلو پر پین امریکی سنٹر پر کس جانب کھڑا ہے۔ ثقافتی بائیکاٹ کے تصور ہی

کے خلاف ہمیں کھڑا ہونا ہے، جس طرح ہم شروع سے کرتے آئے ہیں۔ ہمیں یہ کہتے رہنا ہے: بس سلسلہ ملائے رکھو۔

ہمیں اپنے بنیادی عقیدے پر ثابت قدم رہنا ہے کہ ادیبوں کو قومی حد بندیوں سے آگے بڑھا چاہیے۔ کسی اور مقام پر کھڑے ہونا ہماری تاریخ اور ہمارے مشن سے غداری ہوگا۔''

ہم دونوں پین کے رُکن ہیں۔ مارگریٹ پین کینیڈا کی شریک بنیادگزار تھیں اور اب اس کی بین الاقوامی نائب صدر ہیں۔ ہمارے مراسلہ نویس جو مطالبہ کر رہے ہیں، اس پر عمل کرنا اس کام کو برباد کردے گا جو ہم کئی عشروں سے پین کے ساتھ کرتے آرہے ہیں۔ وہ کام کو دنیا بھر کے ہزاروں ادیبوں سے تعلق رکھتا ہے— جو پابندِ سلاسل ہوئے، جلا وطن ہوئے، سنسرشپ کا شکار ہوئے یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ادیبوں کے پاس فوج نہیں ہوتی۔ ان کے پاس عسکریت پسند بازو نہیں ہوتے۔ ظلم اور بندش کا شکار ہونے والے ادیبوں کی فہرست لمبی ہے پرانی بھی اور بین الاقوامی بھی۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتے اس آزاد مقام کا دفاع کرنا چاہیے جہاں مکالمہ، تبادلہ اور نسبتاً آزاد اظہار ابھی تک ممکن ہے۔

ترجمہ: آصف فرخی

مارگریٹ ایٹ وڈ کے نام غزہ سے ایک کھلا خط:
تاریخ کی مخالف سمت میں نہ کھڑی رہیے

محترمہ مزایٹ وڈ،

ہم غزہ کے طالب علم ہیں جو وہاں کے دس سے زیادہ تعلیمی اداروں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد وہ پناہ گزین ہیں جنھیں ۱۹۴۸ء کے نکبہ میں گھروں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ ان کے پاس ابھی تک گھروں کی چابیاں الماریوں میں بند ہیں اور یہ چابیاں وہ اپنے بچوں، یعنی ہمارے والدین تک منتقل کریں گے۔ ہم میں سے بہت سوں نے اپنے باپ کو کھو دیا، بعض نے اپنے ماؤں کو کھو دیا اور ہم میں سے بعض نے ماں باپ دونوں کو غزہ میں شہریوں کے خلاف اسرائیلی جارحیت میں کھو دیا۔ ہم میں سے بعض جلتی ہوئی سفید فاسفورس کی وجہ سے اپنے جسم کے کسی حصے سے محروم ہوگئے جو اسرائیل نے استعمال کیا اور اس کے بعد سے مستقل طور پر جسمانی مشکلات کا شکار ہیں۔ ہم میں سے اکثر اپنے گھروں سے محروم ہوگئے اور اب خیموں میں رہ رہے ہیں اس لیے کہ اسرائیل نے بنیادی تعمیر کے ساز و سامان کے غزہ میں داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم سب اس حالت میں زندہ ہیں جو انسانیت کے ضمیر پر ایک اُبلتا ہوا ناسور بن کر رہ گئی ہے— وحشت ناک اور ازمنۂ وسطیٰ کے انداز کا وہ محاصرہ جو اسرائیل نے ہم لوگوں، غزہ میں رہنے والے ۱۵ لاکھ فلسطینیوں کے خلاف قائم کر رکھا ہے۔

ہم میں سے بہت سوں کی آپ کی تحریروں سے واقفیت یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران ہوئی۔ حالاں کہ آپ کی کتابیں غزہ میں دستیاب نہیں ہیں— کیونکہ اسرائیل کتابیں، کاغذ اور لکھنے پڑھنے کا سامان اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا— مگر ہم آپ کی دائیں بازو سے منسلک، فیمی نسٹ اور واضح طور پر سیاسی تحریروں سے مانوس ہیں اور سب سے بڑھ کر ہم "اپارتھیڈ" کے خلاف آپ کے زور دار روّیے سے واقف ہیں۔ آپ نے بڑے قابلِ تحسین طریقے سے اپارتھیڈ والے جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیوں کی مخالفت کی تھی اور جبر کی تمام شکلوں کے خلاف مزاحمت کا مطالبہ کیا تھا۔

اب ہم نے سُنا ہے کہ اس سال کے موسم بہار میں آپ کو تل ابیب یونی ورسٹی میں ایک انعام دیا جا رہا ہے۔ محصور غزہ کے ہم طالب علم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ وہاں نہ جائیں۔ جیسے کہ ہمارے پروفیسر، اساتذہ اور اپارتھیڈ مخالف ساتھی ہمیں بتایا کرتے تھے، جنوبی افریقہ کی وحشی، نسل پرست حکومت سے کوئی مذاکرات نہ ہوتے تھے اور نہ کوئی رابطہ تھا۔ بس ایک لفظ: بائیکاٹ۔ آپ کو تو علم ہوگا کہ ۱۹۹۴ء سے پہلے اس اپارتھیڈ ریاست کی جڑواں بہن اسرائیل ہی تھا۔ جنوبی افریقہ کے کئی اپارتھیڈ مخالف ہیروز نے، جن میں نیلسن منڈیلا اور آرچ بشپ ڈیزمنڈ ٹوٹو شامل ہیں، اسرائیل کی جارحیت کو اپارتھیڈ قرار دیتے ہیں۔ بعض لوگ اسرائیل کے نوآبادکاروں کے نوآبادیاتی قبضے کو برائی میں اپارتھیڈ سے بھی بڑھا ہوا قرار دے رہے ہیں۔ ایف ۱۶، ایف ۱۵، اپاچی ہیلی کاپٹر، میرکاوا ٹینک اور سفید فاسفورس تو سیاہ فام بستیوں کے خلاف استعمال نہیں کیے گئے تھے۔

محترمہ ایٹ وڈ، غزہ کے نظر بندی کیمپ میں محصور طالب علم جن کو باہر کی یونیورسٹی میں وظیفہ ملا، ہر سال باہر جانے سے محروم ہو کر بڑی مشکل سے حاصل ہونے والے موقعے کو گنوا دیتے ہیں۔ غزہ پٹی کے اندر جو لوگ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بڑھتی ہوئی غربت اور آمدورفت کے لیے ایندھن کی کمی کی وجہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور یہ دونوں اسباب اسرائیل کے ازمنۂ وسطیٰ والے محاصرہ کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ تل ابیب یونی ورسٹی کی اس طرح کی غیر قانونی اجتماعی سزا کے بارے کیا رائے ہے جسے مقبوضہ علاقوں میں فلسطینی انسانی حقوق کے خصوصی مبصر رچرڈ فاک نے ''نسل کشی کا پیش خیمہ'' قرار دیا ہے۔ مذمت کا ایک لفظ بھی کسی اسرائیلی درس گاہ سے سنائی نہیں دیا ہے!

تل ابیب یونی ورسٹی کے ساتھ عام طرح کے تعلقات میں شرکت، اسرائیل کے فلسطینی شہریوں کے خلاف نسلی پابندی کی پالیسی کی خاموش تائید ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ایسے ادارے کی موافقت سے نفرت کریں گی جو اپنی ریاست کے اپارتھیڈ نظام کو اتنی وفاداری کے ساتھ نبھائے جا رہا ہے۔ تل ابیب یونی ورسٹی کی اسرائیل کے فوجی اور خفیہ اداروں سے تعاون کی طویل اور دستاویزی تاریخ موجود ہے۔ مقبوضہ غزہ پر اسرائیل کے خون آلود حملے کے بعد یہ خاص طور پر زیادہ شرم ناک ہے، انسانی حقوق کی بین الاقوامی اور مقامی تنظیموں کے مطابق جس میں ۱۴۴۰ سے زیادہ فلسطینی ہلاک ہوئے اور ۵۳۸۰ زخمی۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ایسے ادارے کی تائید نہیں کریں گی جس نے اس فوجی انتظام کی تائید کی جو ۴۳۰ سے زیادہ بچوں کا قاتل تھا۔

تل ابیب یونی ورسٹی میں انعام قبول کر کے آپ نسل کشی کی اسرائیلی پالیسی کو بالواسطہ طور پر، غفلت پر مبنی اور خفیف سی تائیدی جُنبش عطا کر دیں گی۔ اس یونی ورسٹی نے اس تباہ شدہ فلسطینی گاؤں کی یادگار قائم کرنے سے انکار کیا ہے جس کے اوپر اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس گاؤں کا نام شیخ موانس ہے اور اسرائیل کے قبضے کے نتیجے میں وہ گاؤں اب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس کے لوگوں کو نکال دیا گیا ہے۔ ہم آرچ بشپ ٹوٹو کے الفاظ یاد کریں: ''اگر آپ ناانصافی کی صورت حال کے سامنے غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو پھر آپ نے ظلم کرنے والے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔'' لہٰذا ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ غیر جانب داری سے انکار کر دیں، کنارے پر بیٹھ کر دیکھتے رہنے سے انکار کر دیں، اپارتھیڈ والے اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے سے انکار کر دیں، چار سو بچوں کا خون بہا دینے کے بعد یہ معمول پر لانا ممکن نہیں! قبضہ، بندش، نوآبادکاری نوآبادیاتی طریقوں، گھروں کے مسمار کیے جانے، زمین پر تصرف اور فلسطین کی اصلی آبادی کے خلاف امتیازی نظام سے انکار اور مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں (اپارتھیڈ کی طرح سے) ''بنتوستان'' بنا دینے سے انکار! بالکل جس طرح ہر شہری کو معلوم تھا کہ شارپ ول کے قتل عام کے بعد اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ جنوبی افریقہ میں اپارتھیڈ کا بائیکاٹ کرے، اسی طرح ۲۰۰۹ء کا غزہ دنیا کے لیے جاگ جانے کا اعلان ہے۔ اسرائیل کے تمام تعلیمی ادارے ریاستی انتظام کے تحت ہیں اور ریاستی رقم سے چلتے ہیں۔ ان کے کسی انعام سے کچھ حاصل کرنا یا ان کی چکنی چپڑی باتوں کو مان لینا ان کے کراہت انگیز سیاسی عمل کی حمایت کرنا ہے۔ اسرائیل نے ساری دنیا کو للکار کر بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ وہ فلسطین کی زمین پر ناجائز قبضے کا مرتکب ہے۔ وہ فلسطین کے عوام کے خلاف اپنی جارحیت جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ فلسطینیوں کو ان تمام جمہوری آزادیوں سے محروم رکھتا ہے جن کو وہ اتنے فخر کے ساتھ افسانوی طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اسرائیل اپارتھیڈ کی حکومت ہے جو فلسطینیوں کو اپنے گھروں میں واپسی کا وہ حق دینے سے منکر ہے جو اقوام متحدہ کی قرارداد ۱۹۴ کے مطابق ہے۔ اس سمپوزیم میں شرکت آفاقی طور پر توثیق شدہ فلسطینی سول سوسائٹی کے اس مطالبے کی خلاف ورزی کرے گی کہ اسرائیل کے خلاف بائیکاٹ، ڈائی ویسٹ منٹ اور سینکشنز (بی ڈی ایس) بروئے کار لایا جائے۔ یہ درخواست بین الاقوامی ایکٹی وسٹ، آرٹسٹ اور معلمین سے بھی کی جارہی ہے جن کا ضمیر زندہ ہے، جیسے آپ۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس اعلیٰ وارفع جدوجہد کا حصہ بننا پسند کریں گی جو اپارتھیڈ، نوآبادیاتی غلبے اور قبضے کے خلاف ہے

جس کا شکار فلسطین کے عوام پچھلے ۶۱ برس سے ہو رہے ہیں اور جواب بھی جاری ہے۔

مز ایٹ وڈ، ہم آپ کو ان میں سے ایک سمجھتے ہیں جن کو آں جہانی ایڈورڈ سعید نے ''اپوزیشنل انٹلکچوئل'' قرار دیا تھا۔ اس حیثیت میں اور آپ کے کام کے لیے ہماری تکریم کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں جذباتی اور نفسیاتی طور پر چوٹ لگے گی اگر ہم آپ کو اس محفل میں شریک ہوتے دیکھیں گے۔ آپ اپنے الفاظ پر قائم ایک عظیم عورت ہیں، اس پر ہمیں کوئی شبہ نہیں۔ مگر ہمارے خیال میں آپ بھی اتفاق کریں گی کہ عمل الفاظ سے زیادہ بلند آہنگ سے بولتا ہے۔ ہم آپ کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔

محصور غزہ

اسرائیل کے درسیاتی بائیکاٹ کے لیے فلسطینی طلباء کی مہم (پی ایس سی اے بی آئی)
فلسطین میں یونیورسٹی کے اساتذہ کی انجمن سے توثیق شدہ

امیتاو گھوش
ترجمہ: آصف فرخی

یہ انعام اسرائیلی ریاست نے نہیں دیا ہے

جب سے امیتاو گھوش کے نام کا اعلان —مارگریٹ ایٹ وڈ کے اشتراک میں —ڈین ڈیوڈ انعام کے لیے کیا گیا ہے، جس کا صدر مقام تل ابیب یونیورسٹی، اسرائیل ہے، احتجاج کے اعلانات ہوئے اور ایک مہم چلائی گئی جس میں ان سے کہا گیا کہ وہ اس انعام کو وصول کرنے سے انکار کردیں، اور ان کو یاد دلایا گیا کہ انہوں نے ۲۰۰۱ء میں "دولت مشترکہ کے انعامی مقابلے" سے اپنے ناول "شیشے کا محل" کو واپس لے لیا تھا۔ "میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں جو تنازعات کی جستجو کرتا ہے" انہوں نے ۲۰۰۱ء میں ہمیں بتایا تھا اور آج بھی انہوں نے اسی روّیے کی تائید کی جب ہم نے ان سے دریافت کیا کہ ان کا ایک نجی ای میل مختلف ای میل لسٹس اور چند ویب سائٹس پر گھوم رہا ہے بجائے اس کے کہ ان کی جانب سے کوئی باقاعدہ بیان سامنے آتا وہ نہیں چاہتے کہ یہ کوئی بڑا عوامی مسئلہ بن جائے انہوں نے کہا اور بیان کے بجائے مندرجہ ذیل تحریر بھیجی:

(آؤٹ لُک انڈیا)

آپ کے پیغام کا شکریہ۔ مجھے اور بھی بہت سے پیغامات ملے ہیں ڈین ڈیوڈ انعام کے حوالے سے، جس میں میں مارگریٹ ایٹ وڈ کے ساتھ شریک ہوں۔

ابتداء کرتے ہوئے میں کہہ دوں کہ غزہ کے یوں مجبور اور علیحدہ کیے جانے سے، اور مغربی کنارے میں بستیوں کے مستقل پھیلاؤ سے اور اسرائیل کی موجودہ حکومت کی شدّت پسندی اور ہٹ دھرمی پر میں برافروختہ ہوں۔ میری تمام ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے اس

طویل اور تباہ کن تصادم میں تکلیفیں سہی ہیں، اور سہہ رہے ہیں۔

اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ نمایاں اہمیت کی بات ہے کہ یہ غور کیا جائے کہ انعام ایک یونیورسٹی، ایک نجی فاؤنڈیشن کے اشتراک کے ساتھ تفویض کر رہی ہے۔ یہ انعام اسرائیل مملکت تفویض نہیں کر رہی۔ میں یہ واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں مقاطعے، پابندی اور بائیکاٹ پر یقین نہیں رکھتا جب ان کا تعلق علم اور ثقافت کے معاملات سے ہو۔ اس کے برخلاف میں اس بات پر قوی یقین رکھتا ہوں، اس تصور کا دفاع کرنا ضروری ہے کہ علم اور ثقافت کے ادارے، اصولی طور پر، کسی بھی مملکت سے علیحدہ، خود مختار سمجھے جانے چاہئیں۔ ورنہ تو پھر امریکا اور برطانیہ کا ہر ادیب اور ہر وہ شخص جو امریکی یا برطانوی یونی ورسٹی میں پڑھا رہا ہے، لازمی طور پر عراق کی جنگ میں ملوث قرار پائے گا اور اس دلیل کی توسیع میں غزہ اور فلسطین میں اسرائیل کے عمل میں بھی۔ اسی طرح ہر ہندوستانی ادیب اور درس گاہوں کا استاد، تصادم کے علاقوں میں ہندوستانی حکومت کے عمل میں شریک ہو جائے گا۔ اور اگر ہم نے اس اصول کا اب دفاع نہیں کیا تو اختلاف کے لیے ان لوگوں کی حقوق کا دفاع کیسے کریں گے جو یونیورسٹیوں میں ملازم ہیں۔ خاص طور پر، مثلاً جنگ کے دنوں میں جب امور مملکت کو شراکت کا نمایاں سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔

بعض ایکٹی وسٹ کے مشورے کے برخلاف میں ۹۷/۱۹۹۶ء میں برما / میان مار گیا تھا جب میں اپنی کتاب ''شیشے کا محل'' کے لیے تحقیق کر رہا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہاں جانے سے اور پھر جو کتاب میں نے لکھی اس کے لکھنے سے، میں نے ایسا کام کیا جو چھوٹے پیمانے پر سہی، مفید تھا۔ وہاں سے دور رہنے سے کچھ نہ ہوتا۔ ۲۰۰۱ء میں، تصادم کے بدترین دنوں میں، میں ایک لیکچر دینے کے لیے سری لنکا گیا۔ میں ایک خلیجی ملک کے کتاب میلے میں ''مہمانِ اعزازی'' رہا ہوں جہاں میرے لاکھوں ہم وطن غلامی جیسی حالت میں رہتے اور کام کرتے ہیں، شہری حقوق اور مذہبی آزادی کے بغیر۔ میں وطن ہندوستان کے کئی علاقے شدید تصادم کا شکار ہیں۔

میں یہ دیکھنے سے قاصر ہوں کہ یہ مقدمہ قائم کیا جائے کہ اسرائیل اتنا مختلف، اتنا استثنائی ہے کہ اس کے لیے اس معاشرے کے زیادہ لبرل اور تنقیدی اذہان کے مالک افراد سے بھی رشتے منقطع کر لیے جائیں۔ کیا یہ بحث کرنا ممکن ہے کہ اس ملک میں ایسی منفرد اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خباثت ہے جو شہری زندگی کے ہر پہلو کو داغ دار کر دیتی ہے، جن میں فاؤنڈیشن اور یونی ورسٹیاں بھی شامل ہیں۔ میں آپ کو ایک بات یاد دلا دوں جو ایک مرتبہ سری نسو بیبہ نے کہی

تھی:

''اگر ہم اسرائیلی معاشرے کو دیکھیں تو مدرّس حلقوں میں ہی سب سے بڑھ کر امن موافق اور ترقی پسندانہ نظریات ملیں گے، وہ روّیے جو ہم کو برابر کی حیثیت میں دیکھنے کے حق میں آئے ہیں...... اگر آپ کسی شعبے کو سزا دینا چاہتے ہیں تو پھر سب سے آخر میں اس کی طرف رخ کیجیے......''

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ استثنائیت (exceptionalism) باقی کی تمام دنیا کے لیے امریکا اور اسرائیل دونوں کے حوالے سے ایک بڑا مسئلہ بنی رہی ہے۔تو پھر میں خود کیسے ایک استثنائی روّیہ اختیار کرلوں؟

علاوہ ازیں میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ اسرائیل کا بائیکاٹ اس وقت کسی مفید تدبیری مقصد کو پورا کر سکے گا۔

بعض لوگوں نے دولتِ مشترکہ انعام کے تعلّق سے میرے روّیے کا ذکر کیا ہے۔ میں یہاں اس جانب توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ میں نے اس انعام کو وصول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس مقابلے سے اپنی کتاب واپس لے لی تھی اس لیے کہ میں اس مخصوص انعام کے حلقۂ کار سے اختلاف رکھتا تھا اور اپنی تحریروں کو اس سانچے میں رکھے جاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے یہ تصوّر نہیں کروں گا کہ اپنے رشتے، وہ جیسے اور جس طرح کے ہیں، برطانیہ اور برطانیہ کی ادبی یا تدریسی دنیاؤں سے منقطع کرلوں۔

اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ یہ ایک معاملہ ہے جس پر ہمیں احترام کے ساتھ اختلاف کرنے پر اتفاق کرنا پڑے گا۔

گوئین ایکرمین
ترجمہ: آصف فرخی

فن کاروں کے پاس فوج نہیں ہوتی

۱۰رمئی (بلوم برگ): مارگریٹ ایٹ اسرائیل کے اپنے پہلے حوالے کے مصروف نظامِ اوقات کو جھانک کر دیکھتی ہیں۔ یہ طے ہے کہ وہ ایک موقر ادبی انعام وصول کریں گی، اسرائیل اور فلسطین سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں سے ملیں گی جو پرندوں کے شوقین ہیں اور مشرقِ وسطیٰ میں پانی کی کمی کے ماہرین سے ملاقات کریں گی۔

انسانی حقوق کی تنظیم پی ای این انٹرنیشنل کی نائب صدر کی حیثیت سے کینیڈا کی یہ ناول نگار اس یہودی ریاست میں محض اپنی آمد کے ذریعے بھی ایک بیان دے رہی ہیں۔ فلسطینی گروپوں نے ان سے کہا تھا کہ ایک ملین ڈالر کا ڈین ڈیوڈ ادبی انعام وصول نہ کریں جو ان کو ہندوستانی ادیب امیتاوگھوش کی شراکت میں ملا ہے اور نہ کل رات کی انعامی تقریب کے لیے اسرائیل آئیں۔

''ہم ثقافتی بائیکاٹ نہیں کرتے'' ایٹ وڈ نے تل ابیب یونیورسٹی میں اس تقریب سے پہلے ایک انٹرویو میں کہا۔ ''یہ تو میرے دنیا بھر کے ان ہزاروں ادیبوں کو اٹھا کر پھینک دینے کے مصداق ہوگا جو قید میں ڈالے گئے، سنسرشپ کا شکار ہوئے، جلاوطن کیے گئے یا مار ڈالے گئے، انہوں نے جو لکھا تھا اس کی خاطر۔''

فضائی سفر کی مشکل (جیٹ لیگ) کا مقابلہ کافی سے کرتے ہوئے ایٹ وڈ تل ابیب کے ایک ہوٹل کے کتابوں کی قطاروں سے آراستہ پرائیوٹ لاؤنج میں بیٹھ کر فن کار، تخلیق وتحریر، مشرقِ وسطیٰ کا معاملہ اور اس خطے میں پانی کی کمی پر باتیں کر رہی ہیں۔

ایکرمین: آپ سے اصرار کیا گیا تھا کہ اس انعام کو وصول کرنے سے انکار کردیں۔ آپ کا

جواب یہ تھا کہ ثقافتی بائیکاٹ خطرناک ہوسکتا ہے۔ آپ اس کی وضاحت کرسکتی ہیں؟

ایٹ وڈ: یہ ساری باتیں فن کاروں کے ساتھ کیوں ہوتی ہیں؟ آسان سی بات ہے۔ فن کاروں کے پاس فوج نہیں ہوتی۔ وہ جو کام کرتے ہیں نزاکت کا حامل ہوتا ہے، جس سے میری مراد ہے کہ انسانوں کے بارے میں ہوتا ہے، پروپیگنڈا کے روّیوں کے بارے میں نہیں۔ وہ آسانی سے نشانہ بن جاتے ہیں۔ ان کے پاس فوج نہیں ہوتی، نام ہوتے ہیں۔

آپ نے ادیب کی حیثیت سے جوں ہی منھ کھولا آپ کسی نہ کسی سمت سے مشکل میں پڑ جائیں گے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اپنی ویب سائٹ پر وہ ساری بدترین باتیں بھی ڈال دوں جو میرے بارے میں کہی گئی ہیں، محض اس لیے کہ دوسرے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو اور ان کو معلوم ہوجائے کہ ایسا محض انھی کے ساتھ نہیں ہوتا۔

۱۹۷۲ء میں مجھ پر الزام لگایا گیا تھا کہ کامیابی کی سیڑھی چڑھ رہی ہوں اور یہ سیڑھی مردوں کے تراشے ہوئے سروں سے بنی ہے۔ یہ بھی بڑی پیاری بات رہی۔ مگر یہ اپنے دور کی بات تھی۔ آپ کو تنقید کا سامنا کرنا ہوگا اگر آپ لوگوں کے سامنے موجود ہیں اور آپ کا ایک نام ہے، کوئی فوج نہیں۔

ایکرمین: اس دورے نے آپ کو مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کے عین بیچ میں پھینک دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے یہ دورہ ایک اور ناول کو جنم دے گا؟

ایٹ وڈ: آپ کو نہیں پتہ کہ کیا ہوسکتا ہے۔ تخلیق کے بارے میں بات یہ ہے کہ ذہن کو کشادہ ہونا چاہیے ورنہ اس میں کوئی بات نہیں آسکے گی۔ یہ مشرقِ وسطیٰ کی انتہائی پیچیدہ صورتِ حال میں ایک فوری و مختصر سبق تو ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے اس میں کھینچ لیے گئے ہوں۔

بہت سے لوگ جن کا کوئی مفاد نہیں ہے، اس کو الگ کردیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ اس کو نہیں سمجھتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس معاملے کو طے کردیں۔ اور وہ حیران ہوتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہورہا، رکاوٹ ٹوٹ کیوں نہیں رہی۔

ایکرمین: آپ کو ڈین ڈیوڈ انعام ملنے کا ایک سبب، انعام کے منصفین کے بقول، ''ماورائے اقوام مسائل کی دید و دریافت ہے جیسے نو آبادیاتی نظام، تانیثیت، سیاسی طاقت اور جبر کے سانچے اور فطرت کا استحصال اور بربادی۔'' جب آپ کوئی ناول لکھنے بیٹھتی ہیں تو یہ پیغام دینے کے مقصد سے ہوتا ہے؟

ایٹ وڈ: اس طرح اسکول میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ الٹا پڑھایا جاتا ہے اس لیے کہ استاد کو اس کا سارا عمل پتہ نہیں ہوتا۔

یہ سلسلہ بہت حد تک گیلی مٹی سے برتن بنانے کی طرح ہے۔ آپ کے پاس مٹی کا یہ ڈھیلا ہے، آپ اس کو شکل دینا شروع کرتے ہیں اور یہ کسی کام کا نہیں۔ آپ نے اسے ایک بار پھر ہاتھوں میں دبا لیا اور پھر سے شروع کر دیا۔ آپ نے ایک نئی شکل بنائی اور آپ کو وہ پسند نہیں آئی۔ آپ نے اسے پھر ہاتھوں میں دبا لیا۔

یہ بار بار غلطی اور کوشش کا عمل ہے۔ آپ ایک ناول کو چار پانچ مرتبہ شروع کر سکتے ہیں اور یہ پھر بھی نہیں چلتا۔ میرے پاس دو ناول ایسے ہیں جو دو سو صفحوں تک آ گئے اور پھر پھینکنے پڑے کیوں کہ وہ چل نہیں رہے تھے۔

پیغام نمودار ہو جاتے ہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بلا قصد ہوتے ہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کمہار کا ارادہ پیالہ بنانے کا نہیں تھا۔

ایکرمین: اگر آپ کی کوئی پریوں والی گاڈ مدر ہوتی اور آپ یہ خواہش کر سکتیں کہ دنیا کو ۱۰ سال بعد کیسا دیکھیں گی تو آپ کس چیز کی خواہش کرتیں؟

ایٹ وڈ: میں وہی دیکھنا چاہوں گی جو باقی سب بھی دیکھنا چاہتے ہیں: اس عالمی تپش سے گزر جائیں۔ اس علاقے میں مسئلہ گرمی اور خشکی ہے۔ اس سے گزر سکیں گے؟

انسانی جسم پانی کے بغیر صرف ۳۶ گھنٹے رہ سکتا ہے۔ اس لیے پانی میرے لیے سرفہرست ہوگا۔ اگر میں یہاں رہ رہی ہوتی تو آس پاس سبھی کے ساتھ تعاون کر رہی ہوتی کہ کسی نہ کسی طرح کا منصوبہ تیار کر لیں جو انصاف پر مبنی ہو۔ اور میں پانی سے نمک صاف کرنے کے سستے اور بڑے پیمانے تک لے جائے جانے والے عمل کو غور سے دیکھ رہی ہوتی۔

حوزے ساراماگو
ترجمہ: آصف فرّخی

خودنوشت

میں زمین سے محروم کسانوں کے ایک خاندان میں، آزین ہاگا میں پیدا ہوا جو رباتیجو کے صوبے کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، آلمونڈا دریا کے دائیں کنارے پر، لزبن کے شہر سے شمال مشرق کی سمت میں لگ بھگ سو کلومیٹر قریب۔ میرے والدین حوزے ڈی سوسا اور ماریا ڈی پائیڈاڈ تھے۔ حوزے ڈی سوسا میرا نام بھی ہوتا اگر گاؤں کے محرّر (رجسٹرار) نے از خود اس میں اس عرفیت کا اضافہ نہ کردیا ہوتا کہ جس سے میرے والد کا خاندان سارے گاؤں میں پہچانا جاتا تھا۔ ساراماگو۔ میں یہ وضاحت کردوں کہ ساراماگو ایک جنگلی پودا ہے جس کے پتّے ایسے وقت میں غریب لوگوں کی غذا کے کام آتے تھے۔ سات کی عمر تک، جب مجھے ابتدائی اسکول میں داخلے کے لیے شناخت کے کاغذات دکھانے پڑے، کسی کو یہ احساس نہ ہوا کہ میرا پورا نام ہے: حوزے ڈی سوسا ساراماگو......

شناخت کا یہ اکیلا مسئلہ نہیں تھا کہ جس سے میں اپنی پیدائش پر دوچار ہوا۔ گو کہ میں ۱۶ نومبر ۱۹۲۲ء کو اس دنیا میں وارد ہو چکا تھا، میرے سرکاری کاغذات ظاہر کرتے ہیں کہ میں دو دن بعد، ۱۸ نومبر کو تولد ہوا۔ اس فضول بحث کی وجہ سے یہ ممکن ہوسکا کہ میری پیدائش کا صحیح وقت پر قانونی اندراج نہ کرانے کے جرمانے سے بچ گیا۔

شاید اس وجہ سے کہ انھوں نے جنگ عظیم اوّل کے دوران فرانس میں توپ خانے کے سپاہی (آرٹلری) کے طور پر کام کیا تھا اور اپنے گاؤں کے علاوہ دوسرے گردوپیش سے بھی واقف تھے۔

میرے والد نے ۱۹۲۴ء میں فیصلہ کیا کہ کھیتی باڑی چھوڑ دیں گے اور اپنے خاندان کے ساتھ لزبن منتقل ہو جائیں گے۔ جہاں انہوں نے پولیس کے سپاہی کے طور پر کام کا آغاز کیا کہ اس ملازمت کے لیے اس کے سوا ''ادبی اسناد'' (اس وقت کا ایک عام فقرہ) درکار نہیں تھے کہ پڑھنا، لکھنا اور حساب آتا ہو۔

دار الحکومت میں منتقل ہونے کے چند ماہ بعد مجھ سے دو سال بڑا بھائی فرانسسکو انتقال کر گیا۔ شہر آنے کے بعد ہمارے حالات تھوڑے سے بہتر ہوئے تھے مگر ہم خوش حال کبھی نہیں ہوئے۔

میں ۱۳ یا ۱۴ سال کا ہوں گا جب ہم آخر کار اپنی ملکیت کے — لیکن بہت مختصر سے مکان میں منتقل ہوئے۔ اس وقت تک ہم مختلف مکانوں کے الگ الگ حصوں میں دوسرے خاندانوں کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ اس تمام عرصے میں اور سنِ بلوغت تک پہنچنے کی عمر تک میں نے خاصی مدّت اور بعض دفعہ طویل مدت، گاؤں میں اپنی ماں کے والدین، جیرونیمو میر-نہو اور جوزیفا کائیکز نہا کے پاس گزاری۔

ابتدائی اسکول میں، میں اچھا طالب علم ثابت ہوا۔ دوسرے جماعت تک میں ہجے کی غلطی کے بغیر لکھ رہا تھا اور تیسری اور چوتھی جماعتیں ایک سال میں پوری کر لیں۔ پھر میں گرامر اسکول بھیج دیا گیا جہاں میں دو سال رہا۔ پہلے سال نہایت عمدہ نمبر پائے اور دوسرے سال اتنے اچھے نہیں رہے۔ مگر میرے ہم جماعت اور اساتذہ مجھے پسند کرتے تھے، حد تو یہ ہے کہ میں طالب علموں کی انجمن کا خزانچی منتخب ہو گیا (اس وقت میری عمر بارہ سال تھی) ...... اس دوران میرے والدین اس نتیجے پر پہنچے کہ وسائل کی کمی وجہ سے وہ مجھے گرامر اسکول میں نہیں پڑھا سکیں گے۔ اس کا واحد مترادف یہ تھا کہ ٹیکنیکل اسکول میں داخل کروا دیا جائے۔ سو یوں ہی ہوا۔ پانچ سال تک میں یہ سیکھتا رہا کہ مکینک کیسے بنا جائے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس وقت کے نصاب میں، جو ظاہر ہے کہ ٹیکنیکل مزاج رکھتا تھا، فرانسیسی کے علاوہ ادب کا مضمون بھی شامل تھا۔ چوں کہ میرے پاس گھر میں کوئی کتاب نہیں تھی (اپنی کتابیں، جن کی قیمت میں نے خود ادا کی ہو، چاہے دوست سے قرض مانگے ہوئے پیسوں سے، مجھے اس وقت میسر آئیں جب میں ۱۹ برس کا ہوا) اس لیے پرتگیزی زبان کی درسی کتابیں، جن کا مزاج ''ادبی انتخاب'' کا جیسا تھا، ہی دراصل وہ ذریعہ تھیں جنہوں نے میرے لیے ادبی ثمر آوری کے دروازے کھول دیے۔ میں آج بھی وہ نظمیں دُہرا سکتا ہوں جو میں

نے اس پرانے وقت میں زبانی یاد کی تھیں۔ نصاب مکمل کرنے کے بعد میں دوسال تک گاڑیوں کی مرمت کے ورک شاپ میں کام کرتا رہا۔ اس وقت تک میں نے شام کے اوقات میں لزبن کی ایک پبلک لائبریری میں باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا تھا اور یہ یہیں پر ہوا کہ مجھ میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور اس نے جلا پائی کہ سوائے تجسس اور سیکھنے کی خواہش کے علاوہ کسی کی مدد شامل تھی اور نہ رہنمائی۔

جب ۱۹۴۴ء میں میری شادی ہوئی تو میں نوکری بدل چکا تھا۔ اب میں سماجی بہبود کے محکمے میں انتظامی افسر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ میری بیوی، اڈاریز جو اس وقت ریلوے کمپنی میں ٹائپسٹ تھی، کئی سال کے بعد پرتگال کے اہم ترین نقاش میں سے ایک بننے والی تھی۔ ۱۹۸۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء میں، جو میری اکلوتی اولاد ویولانتے کی پیدائش کا سال تھا، میری پہلی کتاب شائع ہوئی، یہ ناول تھا جس کا نام میں نے ''بیوہ'' رکھا مگر ادارتی وجوہ کی بنا پر ''گناہ کی زمین'' کے نام سے شائع ہوا۔ میں نے ایک اور ناول ''روشن دان'' بھی لکھا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اور اس کے علاوہ ایک اور ناول شروع کیا مگر ابتدائی چند صفحات سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کا نام ''شہد اور ورم'' ہونا تھا، یا پھر ''تادیس کا بیٹا لوئس۔'' یہ معاملہ اس وقت طے ہوگیا جب میں نے اس منصوبے کو چھوڑ دیا۔ مجھ پر عیاں ہو چکا تھا کہ میرے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انیس سال تک، یعنی ۱۹۶۶ء تک، جب میں نے ''امکانی نظمیں'' شائع کیں، میں پرتگیزی ادب کے منظر سے غائب رہا جب کہ چند ایک لوگوں نے ہی اس غیر حاضری کو درخور اعتناء سمجھا ہوگا۔

سیاسی وجوہ کی بناء پر میں ۱۹۴۹ء میں بے روزگار ہوگیا مگر ٹیکنیکل اسکول کے ایک پرانے استاد کی مہربانی سے مجھے دھات کی ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی جہاں وہ مینجر تھے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے کے آخر میں، میں نے ایک ناشر کے ہاں پروڈکشن مینجر کے طور پر کام کر دیا اور یوں ادب کی اس دنیا میں لوٹ آیا، مگر ادیب کی حیثیت سے نہیں، کہ جس سے چند سال پہلے میں رخصت ہوگیا تھا۔ اس نئی سرگرمی سے مجھے اس عہد کے بعض اہم ترین پرتگالی ادیبوں کی دوستی اور واقفیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں، گھر کی اقتصادی حالت بہتر کرنے کے لیے اور اس لیے بھی کہ میں اس کام سے لطف اندوز ہوتا تھا، میں نے فارغ وقت میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا اور یہ سرگرمی ۱۹۸۱ء تک جاری رہی۔ کولیت، پار لاگر کوسٹ، ژاں کوسو، موپساں، آندرے بونارڈ، ٹولسٹوئے، بودیلیر، ایتیں بلیبر، نکوس پولانتزاس، آنری فوسیلوں، ژاکس رومین، ہیگل، راموں بیئر،

ان چند ادیبوں میں سے تھے جن کا میں نے ترجمہ کیا۔ مئی ۱۹۶۷ء اور نومبر ۱۹۶۸ء کے درمیان میرا ایک متوازی پیشہ ادبی تنقید بھی تھا۔ اس دوران ۱۹۶۶ء میں، میں نے ''امکانی نظمیں'' شائع کردی تھی۔ شاعری کا یہ مجموعہ ادب کی طرف میری واپسی کا اشارہ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں شاعری کا ایک اور مجموعہ ''احتمالاً خوشی'' اور اس کے کچھ عرصے بعد، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۳ء میں ''اس دنیا اور دوسری دنیا سے'' اور ''مسافر کا سامان''، اخباری مضامین کے دو مجموعے، جن کو ناقدین میری بعد کی تصانیف کی مکمل تفہیم کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں طلاق کے بعد میں نے پرتگیزی ادیبہ ازابیل ڈانو بریگا کے ساتھ تعلق استوار کیا جو ۱۹۸۲ء تک جاری رہنے والا تھا۔

۱۹۷۱ء میں ناشر کو چھوڑ دینے کے بعد میں اگلے دو سال تک شام کے اخبار کے لیے ایک ثقافتی ضمیمے کے منتظم اور مدیر کے طور پر کام کرتا رہا۔

۱۹۷۴ء میں ''وہ آراء جو ڈی رکھتا تھا'' کے عنوان کے تحت شائع ہونے والے متون اس آمریت کے اختتامی زمانے کا بڑی دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ پیش کرتے ہیں، اسی اپریل میں جس کا تختہ الٹنے کو تھا۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں صبح کے ایک اخبار کا ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوگیا، جس عہدے پر میں نومبر تک فائز رہا اور ۲۵ نومبر کی سیاسی عسکری بغاوت کے، جس نے انقلابی عمل کا راستہ روک دیا، بعد آنے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں برطرف کردیا گیا۔ اس دور میں دو کتابیں سامنے آئیں۔ ''۱۹۹۳ء کا سال'' نامی طویل نظم جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اور جسے بعض نقاد ان کتابوں کا نقیب قرار دیتے ہیں جن کا سلسلہ دو سال بعد اس کتاب کی اشاعت سے شروع ہوا جس کا نام ''خطاطی اور مصوری کا ہدایت نامہ'' ہے اور ''نوٹس'' کے نام سے ان سیاسی مضامین کا مجموعہ جو اس اخبار میں شائع ہوئے جس کا میں ڈائریکٹر رہا تھا۔

ایک بار پھر بے روزگار اور اس سیاسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جس سے ہم گزر رہے تھے، اور ملازمت حاصل کرنے کے خفیف سے امکان سے بھی عاری ہوکر میں نے اپنے آپ کو ادب کے لے وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب وقت تھا کہ میں معلوم کرلوں کہ ادیب کے طور پر میری حیثیت کیا ہے؟ ۱۹۷۶ء کے آغاز میں، میں ایلنتیجو صوبے کے گاؤں لاورے میں قیام پذیر ہوگیا۔ یہ مطالعے، مشاہدے اور نوٹس لکھنے کا وہ وقت تھا جو بالآخر ۱۹۸۰ء میں ''زمین سے اٹھنا'' نامی ناول کی اشاعت پر منتج ہوا جس میں وہ انداز بیان پیدا ہوا کہ جس سے میرے ناول خاص طور پر عبارت ہیں۔ اس دوران ۱۹۷۸ء میں، میں نے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۷۹ء میں
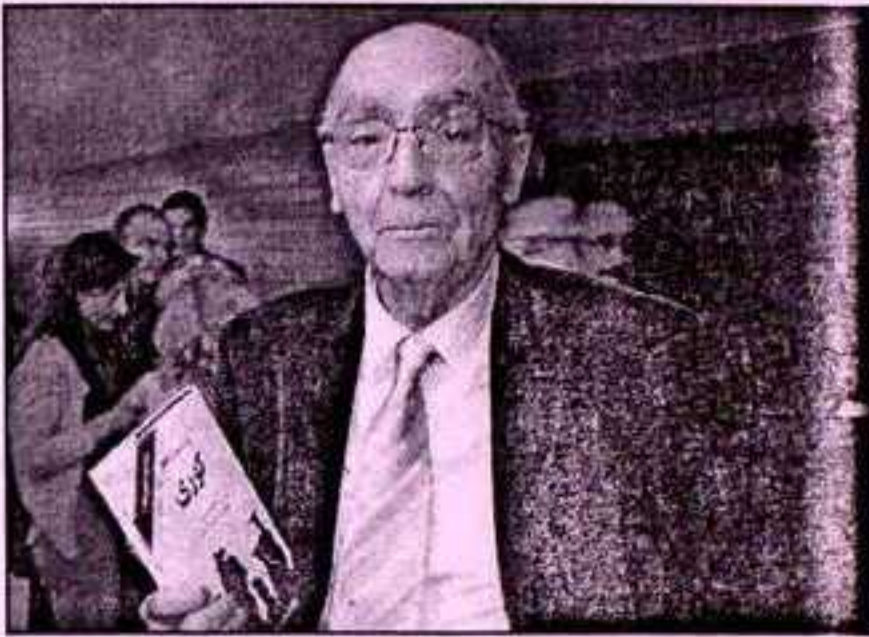
''رات'' نام کا ڈرامہ اور ناول سے چند ماہ پہلے ایک نیا ڈرامہ ''ہم اس کتاب کا کیا کریں؟'' ایک اور ڈرامے کے سوا، جس کا نام تھا ''سینٹ فرانس کی دوسری زندگی'' اور جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا، ۸۰ء کی دہائی تمام و کمال ناول سے منسوب تھی۔ بالتا زار اور بلی مونڈا، ۱۹۸۲ء رکارڈو دیس کی وفات کا سال، ۱۹۸۴ء پتھر کا بیڑا، ۱۹۸۲ء، لزبن کے محاصرے کی تاریخ،۱۹۸۹۔ ۱۹۸۶ء میں ہسپانوی صحافی خاتون پلار ڈیل ریو سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۸۸ء میں ہماری شادی ہوگئی۔

''یسوع مسیح'' کا صحیفہ'' پر پرتگیزی حکومت کی سنسر شپ کے نتیجے میں، جس میں حکومت نے اس ناول کو یورپی ادبی انعام کے لیے پیش ہونے سے ویٹو کر دیا تھا اور بہانہ یہ بنایا تھا کہ یہ کیتھولک عقیدہ کے حامل افراد کے لیے ناگوار ہے، میری بیوی اور میں اپنی رہائش کنیری جزائر میں منتقل کر گئے۔ اس سال کے آغاز میں نے نیا ڈرامہ شائع کیا جس کو لزبن میں لکھا تھا، اور جس سے آپرا کا متن حاصل ہوا۔ اس آپرا کی موسیقی اطالوی موسیقار آزیو کورگی نے ترتیب دی اور یہ پہلی بار جرمنی کے شہر مونسٹر میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ کورگی کے ساتھ میرا پہلا اشتراک نہیں تھا، اس سے پہلے اس نے ۱۹۹۰ء میں ''بلنڈا'' نامی آپرا کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی جو میرے ناول پر مبنی تھا۔ ۱۹۹۳ء میں، میں نے روزنامچہ لکھنا شرع کر دیا جس کی اب تک پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں میرا ناول ''اندھے لوگ'' شائع ہوا اور ۱۹۹۷ء میں ''سارے نام'' ۱۹۹۵ء میں مجھے (پرتگال) کا میوز انعام دیا گیا اور ۱۹۹۸ء میں نوبیل انعام برائے ادب۔

(نوبیل انعام کے اعلان کے موقع پر لکھا گیا)

نابینائی کے مصنف کی آنکھ بند ہوگئی

''اس کے اگلے دن، کوئی نہیں مرا۔ یہ حقیقت، جو زندگی کے اصولوں کے مطلقاً خلاف تھی، لوگوں کے ذہن میں بے تحاشہ، اور ان حالات میں مکمل طور پر حق بجانب تشویش برانگیخت کر رہی تھی، اس لیے کہ ہمیں محض یہ ملحوظِ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے کہ آفاقی تاریخ کی تمام وکمال چالیس جلدوں میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا، ایک مثالی نمونے تک کا ذکر نہیں کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو کہ ایک پورے کا پورا دن گزر جائے، چوبیس گھنٹے کی اپنی فراخ دلانہ گنجائش، اپنی روزانہ اور شبانہ، سحرگاہی اور شام کے ساتھ، اور کوئی موت نہ ہو کسی بیماری سے یا مہلک چوٹ سے یا کامیاب خودکشی سے، ایک نہیں، ایک بھی نہیں...''

حوزے سارا ماگو کا ناول ''وقفے وقفے سے موت'' ایسی متضاد صورت حال سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن موت کا یہ احساس تسکین کے بجائے ایک نئی پریشانی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے اور ناول کے حیران کن واقعات کا ایک پیچ دار سلسلہ چل پڑتا ہے۔ موت کے بارے میں اسی ناول کا خیال سب سے پہلے ذہن میں آیا جب حوزے سارا ماگو کی سناؤنی سُنی۔ سارا ماگو کی زندگی میں ایسا دن آئے بغیر گزر گیا اور اپنے ناول میں موت کو عارضی طور پر معطل کر دینے والا ادیب انجام رسیدہ ہوگیا۔ اس کے نام پر قائم ہونے والی سارا ماگو فاؤنڈیشن نے اپنی ویب سائٹ پر ایک اعلامیہ جاری کیا جس کے مطابق جمعہ ۱۸ر جون ۲۰۱۰ء کو ۸۷ سالہ ادیب ایک طویل بیماری کے بعد کنیری آئی لینڈ میں لانزاروتے کے مقام پر انتقال کر گیا۔ جہاں وہ کئی سال سے مقیم تھا۔ اعلامیے میں کہا گیا کہ طویل بیماری کے سبب اس کے جسم کے کئی اعضاء ناکارہ ہو گئے تھے، تاہم اس کے آخری لمحوں میں اس کے اہلِ خانہ اس کے ساتھ تھے اور وہ پُرسکون اور پُرامن طریقے سے اپنی زندگی کے

اختتام تک پہنچ گیا۔

انتقال کے بعد حوزے سارا ماگو کے بارے میں بات زور وشور سے دہرائی گئی کہ وہ مذہب کا منکر اور علی الاعلان کمیونسٹ خیالات کا حامل تھا۔ اخباروں میں یہ خبر بھی نمایاں سرخیوں کے ساتھ آئی کہ وہ پرتگال کا واحد ادیب تھا جس نے ادب کا نوبیل انعام حاصل کیا، اور اس کے جنازے میں ۲۰،۰۰۰ کے قریب افراد شریک ہوئے جن میں پرتگال کے وزیراعظم شامل نہیں تھے۔ اس غیر حاضری پر ان کو ٹوکا گیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ ان کو سارا ماگو سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں تھا۔ ایسی فروعی باتوں کے ساتھ یہ بات بھی بار بار سامنے آتی رہی کہ سارا ماگو دورِ حاضر کے سب سے زیادہ خلّاق ناول نگاروں میں سے ایک اور اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے ساتھ ناول نگاری کا وہ مخصوص انداز ختم ہوگیا جس میں سرریئلی تجربات، دہقانوں کی عملی افادیت پسندی کے امتزاج سے ایک نئی شکل اختیار کر گئے تھے۔

تعزیتی مراسلوں میں اس بات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا کہ سارا ماگو نے آمریت کے زوال کے بعد پرتگال میں حاوی ہونے والی آرتھوڈاکسی کو بار بار چیلنج کیا اور جب حضرت عیسیٰؑ کے کردار پر مبنی اس کے متنازعہ ناول کو برسر اقتدار حکومتِ وقت نے ایک یوروپی ادبی مقابلے میں شریک ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو وہ پرتگال کو خیرباد کہہ کر کینری جزائر میں مقیم ہوگیا اور آخر وقت تک وہیں رہتا رہا۔ اخبارات میں اس کے سیاسی افکار کا خاصا چرچا رہا۔ خاص طور پر اس امر کا کہ وہ عالم گیریت (گلوبلائزیشن) کو مطلق العنانی کی ایک نئی شکل قرار دیتا تھا اور موجودہ دور کی جمہوریت سے شاکی تھا کہ وہ ملٹی نیشنل کارپوریشنز کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے میں ناکام رہی ہے۔ بعض امریکی اخبارات نے ۲۰۰۲ء میں مشرق وسطیٰ کے دورے میں مغربی کنارے کا سفر کرتے ہوئے اس بیان کا حوالہ بھی دہرایا جب اس نے اسرائیل کے ہاتھوں فلسطینیوں کے ساتھ بدسلوکی کو یہودیوں کے ساتھ نازی جرمنی کی بدسلوکی سے مماثل قرار دیا۔

مشہور امریکی اخبار ''نیویارک ٹائمز'' میں فرنانندہ ایبرسٹاٹ نے سیاسی افکار کے ساتھ ساتھ اس کے ناولوں کے بارے میں ارونگ ہو اور جیمز وڈ جیسے نقادوں کی آرا بھی شامل کیں۔ ان میں مغربی ادب کے کلاسیکی سرمائے (Canon) پر زور دینے والے پروفیسر ہیرلڈ بلوم کی ۲۰۰۸ء کی رائے بھی درج کی۔ پروفیسر صاحب موصوف نے فرمایا کہ پچھلے ۲۵ برس سے سارا ماگو مغربی دنیا کے کسی بھی ادیب کے سامنے اپنی امتیازی حیثیت کے ساتھ ایستادہ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ اگلے

فقرے میں یہ بھی لکھ دیا کہ وہ فلپ راتھ، گنٹر گراس، تھامس پنشن اور ڈون ڈی لیلو کے برابر مرتبہ رکھتا تھا۔ چلیے صاحب، اگر یہی مرتبہ رہ گیا ہے تو پھر اس کو پڑھنے کے لیے بھنور دار اور متلاطم طویل طویل جملوں کا کشٹ کیوں اٹھائیں، امریکی ناول نگار کیا بُرے ہیں۔ گنٹر گراس کا نام تو شاید برائے بیت آ گیا یا پھر وہ بھی بہت ارزاں ہو گیا۔ امریکی ناول نگاروں کے باصلاحیت ہونے میں کس کافر کو شبہ ہے لیکن ان کا تجربہ اور بیان سارا ماگو جیسا آفاقی اور متنوع بھی ہے؟ پروفیسر صاحب موصوف کے اس بیان پر ہم محمد حسن عسکری کو یاد کیے بغیر نہ رہ سکے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے اپنی کتاب ان کے نام معنون کرنا چاہی اور یہ بھی لکھ دیا کہ یہ انتساب ان کے ساتھ ساتھ آل احمد سرور کے نام بھی ہوگا۔ اپنے جوابی خط میں عسکری صاحب نے لکھا کہ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ان کی دعوت کی جائے اور دعوت کے دوران ان کے ساتھ ساتھ روئی کے بورے بھی لا کر رکھ دیے جائیں۔ ہیرلڈ بلوم صاحب نے سارا ماگو کو ایسی ہی دعوت میں بلا کر روئی کے بوروں کے ساتھ بٹھا دیا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ اسے بڑا اعزاز عطا کیا ہے۔

سارا ماگو کا ناول ''وقفے وقفے سے موت'' یوں ختم ہوتا ہے:

''موت بستر کی جانب واپس آئی، اس آدمی کے گرد بازو حمائل کیے اور یہ سمجھے بغیر کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، وہ جو کبھی نہ سوتی تھی آنکھیں موند کر سکون کے ساتھ سو گئی۔ اس کے اگلے دن، کوئی نہیں مرا۔''

انتظار حسین

صاحبِ بصیرت

میں نے ابھی چند صفحات پڑھے ہی تھے حوزے ساراما گو کے ناول ''اندھے لوگ'' سے جس کا ترجمہ احمد مشتاق نے اردو میں کیا ہے اور ''دنیا زاد'' کراچی کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے کہ میرے دروازے پر اخبار کے ہاکر نے دستک دی اور صبح کا اخبار پہنچایا۔

میں ''ڈان'' کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ ایک سُرخی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی: ''نوبیل انعام یافتہ ناول نگار ساراما گو انتقال کر گیا۔'' اچھا، تو ''اندھے لوگ'' کا مصنف اس دنیا سے گزر گیا۔

اس کے لکھے ہوئے کم از کم دو اور ناول اس وقت میری دسترس میں ہیں، ''حضرت عیسیٰؑ کا صحیفہ'' اور ''لزبن کے محاصرے کی تاریخ''۔ میں نے ان ناولوں میں جو پڑھا تھا اس کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کے لیے میں نے جلدی سے ان کے صفحات کو پھر سے ٹٹولا۔ اس وجہ سے میں اب اپنے زمانے کے اس اعلا ناول نگار کو خراجِ تحسین کے شانِ شایان چند الفاظ ادا کرنے کے قابل ہوسکوں گا۔

''حضرت عیسیٰؑ کا صحیفہ'' غالباً اس مصنف کی بہترین صلاحیتوں کا مظہر ہے کیوں کہ یہ ایک آزاد خیال ذہن کو ظاہر کرتا ہے جو عوامی عقائد کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ ناول اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کی اس زندگی سے مختلف ہے جو ''انجیل'' میں بیان ہوئی ہے۔ یہ ان کو فرزند خداوند کے بجائے جوزف بڑھئی کا بیٹا قرار دینے پر مُصر ہے۔ اس کے علاوہ ساراما گو مریم مجدلین کے ساتھ ان کے تعلقات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ عیسوی عقیدے کے بہت کم افراد اس کو قبول کرسکیں گے۔

جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی، اس ناول نے سارا ماگو کے لیے بہت مشکلات پیدا کیں اور اسے اپنے وطن پرتگال کو الوداع کہنا پڑا۔ (ڈی ایچ لارنس غالباً پہلا ادیب تھا جس نے حضرت عیسیٰؑ سے منسوب ترکِ ازدواج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ان کو اپنے طویل افسانے 'وہ شخص جو مر گیا' میں مختلف طریقے سے دکھایا۔)

''اندھے لوگ'' سارا ماگو کے بعد کے دور کی کتاب ہے۔ یہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اور جلد ہی خوب بکنے والی کتاب بن گئی۔ یہ ان لوگوں کی عجیب کہانی بیان کرتی ہے جو بڑی تیزی کے ساتھ اپنی بصارت گم کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ پورا شہر اندھا ہو جاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں بڑا انتشار پیدا ہوتا ہے اور اندھے لوگوں کا ہجوم، اپنی مکروہ خواہشات کی وجہ سے اندھے ہو کر ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال واضح طور پر علامتی ہے اور اس کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں۔

احمد مشتاق ہمارے لیے شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لیکن اس ناول کے لیے پسندیدگی نے ان کو مجبور کر دیا کہ اسے اردو میں ترجمہ کر دیں۔ وہ ان مشکلات سے ناواقف تو نہیں ہوں گے جو اصل متن سے وفاداری نبھانے والے مترجمین کو درپیش آتی ہیں۔ بہت سارے ترجمے، اصل متن سے قربت کے نام پر اصل متن سے بھی اور اس زبان سے بھی جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے، گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس اردو میں خراب ترجموں کا ایک پورا ڈھیر موجود ہے۔

حیرت انگیز طور پر احمد مشتاق بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں کہ سارا ماگو کے اسلوب تحریر سے وفاداری بھی نبھائیں اور اس کے بیان کی فصاحت کو بھی برقرار رکھیں۔ یہ اس منصوبے کے لیے اچھا شگون معلوم ہوتا ہے جس کا اس نے بیڑا اٹھایا ہے۔ آیئے، ہم اس مکمل ناول کے ترجمے کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ وہ اس اظہار کو باقی رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے جو اس منتخب نثر پارے میں نظر آتا ہے۔

ان کے ترجمے کیے ہوئے کئی اور نثر پارے بھی ''دنیا زاد'' کے اس شمارے میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو، اوکتاویو پاز کی تحریروں سے لیے گئے ہیں۔ کیا ہم اس سے نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ غزل گوئی کے علاوہ اس نے اپنی پسند کے ادیبوں کا ترجمہ کرنے کا شوق بھی اختیار کر لیا ہے؟ شاعری کے چند تراجم بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ اس کی غزل گوئی کے لیے اچھا شگون ہے۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے علاوہ ''دنیا زاد'' کے موجودہ شمارے میں بہت سی چیزیں

موجود ہیں۔ اس سے تاثر ملتا ہے کہ یہ نثر اور نظم دونوں کی منتخب تحریروں کا مجموعہ ہے۔ میں ان تمام پر تبصرہ کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتا۔

ایک اور تحریر جس نے خاص طور پر میری توجہ اپنی جانب مبذول کی، وہ حسن منظر کا مضمون ہے۔ وہ ابتدا ہی میں سرت چندر کا ذکر کرتے ہیں، وہ مشہور بنگالی ناول نگار جس کی کتابیں ایک زمانے میں اردو ترجموں میں بھی دستیاب تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس سے تعارف کے لیے ہم اردو ترجموں سے زیادہ فلموں کے مرہونِ منت ہیں۔

سرت چندر کے ناولوں نے فلمی پروڈیوسروں کو بہت مواد فراہم کیا۔ حسن منظر نے فلم ''کپال کنڈلا'' کا حوالہ دیا ہے۔ یہ پُراسرار فلم آج تک مجھے مسحور کیے ہوئے ہے۔

یہ مضمون سرت چندر سے آگے جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو ثقافتی طور پر پُرثروت دور میں پاتے ہیں، ایسا دور جب سہگل، ایک گلوکار کے طور پر بھی اور دیوداس کے کردار میں ہیرو کے طور پر بھی آج کل کے ہیروز سے کہیں بہتر تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ''دیوداس'' کی گھٹیا شکلیں آج کل کے فلم بینوں سے داد و تحسین وصول کر رہی ہیں۔

(ترجمہ: الف ـ ف)

جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی، اس ناول نے سارا ماگو کے لیے بہت مشکلات پیدا کیں اور اسے اپنے وطن پرتگال کو الوداع کہنا پڑا۔ (ڈی ایچ لارنس غالباً پہلا ادیب تھا جس نے حضرت عیسیٰؑ سے منسوب ترکِ ازدواج کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا اور ان کو اپنے طویل افسانے 'وہ شخص جو مرگیا' میں مختلف طریقے سے دکھایا۔)

''اندھے لوگ'' سارا ماگو کے بعد کے دور کی کتاب ہے۔ یہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اور جلد ہی خوب بکنے والی کتاب بن گئی۔ یہ ان لوگوں کی عجیب کہانی بیان کرتی ہے جو بڑی تیزی کے ساتھ اپنی بصارت گم کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ پورا شہر اندھا ہوجاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں بڑا انتشار پیدا ہوتا ہے اور اندھے لوگوں کا ہجوم، اپنی مکروہ خواہشات کی وجہ سے اندھے ہوکر ہر قید و بند سے آزاد ہوجاتا ہے۔ یہ صورت حال واضح طور پر علامتی ہے اور اس کی مختلف تعبیریں کی جاسکتی ہیں۔

احمد مشتاق ہمارے لیے شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لیکن اس ناول کے لیے پسندیدگی نے ان کو مجبور کردیا کہ اسے اردو میں ترجمہ کردیں۔ وہ ان مشکلات سے ناواقف تو نہیں ہوں گے جو اصل متن سے وفاداری نبھانے والے مترجمین کو درپیش آتی ہیں۔ بہت سارے ترجمے، اصل متن سے قربت کے نام پر اصل متن سے بھی اور اس زبان سے بھی جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے، گڑبڑ پیدا کردیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس اردو میں خراب ترجموں کا ایک پورا ڈھیر موجود ہے۔

حیرت انگیز طور پر احمد مشتاق بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں کہ سارا ماگو کے اسلوب تحریر سے وفاداری بھی نبھائیں اور اس کے بیان کی فصاحت کو بھی برقرار رکھیں۔ یہ اس منصوبے کے لیے اچھا شگون معلوم ہوتا ہے جس کا اس نے بیڑا اٹھایا ہے۔ آیئے، ہم اس مکمل ناول کے ترجمے کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ وہ اس اظہار کو باقی رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے جو اس منتخب نثر پارے میں نظر آتا ہے۔

ان کے ترجمے کیے ہوئے کئی اور نثر پارے بھی ''دنیا زاد'' کے اس شمارے میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو، اوکتاویو پاز کی تحریروں سے لیے گئے ہیں۔ کیا ہم اس سے نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ غزل گوئی کے علاوہ اس نے اپنی پسند کے ادیبوں کا ترجمہ کرنے کا شوق بھی اختیار کرلیا ہے؟ شاعری کے چند تراجم بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ اس کی غزل گوئی کے لیے اچھا شگون ہے۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے علاوہ ''دنیا زاد'' کے موجودہ شمارے میں بہت سی چیزیں

موجود ہیں۔ اس سے تاثر ملتا ہے کہ یہ نثر اور نظم دونوں کی منتخب تحریروں کا مجموعہ ہے۔ میں ان تمام پر تبصرہ کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتا۔

ایک اور تحریر جس نے خاص طور پر میری توجہ اپنی جانب مبذول کی، وہ حسن منظر کا مضمون ہے۔ وہ ابتدا ہی میں سرت چندر کا ذکر کرتے ہیں، وہ مشہور بنگالی ناول نگار جس کی کتابیں ایک زمانے میں اردو ترجموں میں بھی دستیاب تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس سے تعارف کے لیے ہم اردو ترجموں سے زیادہ فلموں کے مرہونِ منت ہیں۔

سرت چندر کے ناولوں نے فلمی پروڈیوسروں کو بہت مواد فراہم کیا۔ حسن منظر نے فلم ''کپال کنڈلا'' کا حوالہ دیا ہے۔ یہ پُراسرار فلم آج تک مجھے مسحور کیے ہوئے ہے۔

یہ مضمون سرت چندر سے آگے جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو ثقافتی طور پر پُرثروت دور میں پاتے ہیں، ایسا دور جب سہگل، ایک گلوکار کے طور پر بھی اور دیوداس کے کردار میں ہیرو کے طور پر بھی آج کل کے ہیروز سے کہیں بہتر تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ''دیوداس'' کی گھٹیا شکلیں آج کل کے فلم بینوں سے داد و تحسین وصول کر رہی ہیں۔

(ترجمہ: الف ۔ فے)

عثمان قاضی

ابنِ صفی اب انگریزی میں

ابھی کل ہی کتابوں کی دکان پر ایک پتلی سی انگریزی کتاب پر نظر پڑی جس کے عنوان House of Fear کے نیچے ابن صفی کا نام دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ اردو زبان کے مشہور جاسوسی ناول نگار عمران سیریز کے دو ابتدائی ناولوں ''خوفناک کمرہ'' اور ''چٹانوں میں فایر'' کا پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو رینڈم ہاؤس نامی ادارے نے ہندوستان سے چھاپا ہے۔ مترجم کا نام بلال تنویر ہے۔

ابن صفی بجا طور پر مصنفوں کے اس زمرے سے تعلق رکھتے ہیں جسے انگریزی میں Phenomenal کہا جاتا ہے۔ ابن صفی کے کام اور ان کی آج تک قائم مقبولیت یا ان کے ادبی مقام کے بارے میں کچھ کہنے کا میں اہل نہیں ہوں مگر مجھے اپنے قیام بنگلہ دیش کے دوران ایک چٹکلہ سننے کو ملا جس سے ابن صفی کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمان کی والدہ مبینہ طور پر ابن صفی کے ناولوں کی شیدائی تھیں اور ہر نیا ناول بالتزام منگوا کر پڑھتی تھیں۔ ۱۹۷۱ کے قریب ان کی آنکھیں کچھ جواب دے چکی تھیں۔ ایسے ماحول میں جب ڈھاکہ شہر میں اردو کا نام لیوا ہونا موت کو دعوت دینا تھا، ان کی فرمائش پر مکتی باہنی کے لوگ ڈھاکہ کالج کے ایک اردو کے استاد کو اپنی حفاظت میں روزانہ شیخ صاحب کے گھر لاتے تھے جو موصوفہ کو ابن صفی کا تازہ ناول پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ صاحب آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ وہیں رہے اور بعد میں شاید کینیڈا چلے گئے۔

کسی بھی فن پارے کا ترجمہ انتہائی مشکل کام ہے۔ اس موضوع پر مشہور مصنف امبرتو ایچو کا ایک مضمون چند سال پہلے چھپا تھا جو اس وجہ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ خود بھی اپنے کام کے تراجم میں شریک رہے ہیں۔ ان کے مضمون کا عنوان غالباً ''Futility of Translation''

تھا اور اس میں انہوں نے خصوصاً محاورات، شاعری اور تہذیبی سیاق و سباق کے ترجمے میں حائل مشکلات کا ذکر کیا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان چیزوں کا ترجمے میں بہ تمام و کمال منتقل ہونا ناممکن ہے۔ حالانکہ ان کا ترجمہ ایک یورپی زبان سے دوسری میں ہو رہا تھا جہاں تہذیبی تضادات شاید اتنے شدید نہیں جتنے اردو اور مثلاً انگریزی کے ہیں۔

بلال تنویر صاحب کو بھی ان مشکلات کا قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا ہے۔ عمران کے طنز و مزاح میں سے اکثر کا تعلق اردو شعر و شاعری یا برصغیر کے تہذیبی پس منظر سے ہے۔ اکثر جگہ مترجم نے محاورات مثلاً ''باپ رے باپ'' کو رومن حروف میں لکھ کر کام چلایا ہے، کہیں فٹ نوٹ دے کر بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے مگر میری رائے میں برصغیر سے تعلق رکھنے والے انگریزی دانوں کے لیے اب بھی اس ترجمے سے پوری طرح لطف اندوز ہونا مشکل ہوگا۔ اسی ناول میں عمران اپنے حریف فیاض کو تنگ کرنے کے لیے ایک شعر یوں پڑھتا ہے ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق۔ نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز''۔ اس کی بے ہودگی کا اندازہ کرنا صرف انگریزی دان طبقے کے لیے ناممکن ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ ابن صفی کے ابتدائی ناول ہیں۔ آگے جا کر جہاں زبان اور بیان مزید ار محاوراتی ہو جائے گا وہاں ترجمہ مزید کٹھن ہوتا جائے گا۔ مثلاً عمران اپنے سیاہ فام ملازم جوزف کو جابجا ''شب دیجور کے بچے'' کہہ کر بلاتا ہے۔ اب اگر قاری اردو غزل میں ہجر کی لمبی کالی رات کی اہمیت اور اس کے حوالے سے انشاء اور جرات کے مکالمے سے بے بہرہ ہے تو وہ اس کا کیا خاک لطف اٹھائے گا۔ ایک ناول میں عمران ایک درزی کی دکان پر پتلون میں رومالی نہ ڈالنے پر جھگڑا کرتا ہے۔ آج کل کتنے لوگ رومالی نام کی چیز سے آشنا ہیں؟ جب کہ اس کا استعمال شلوار میں بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

غالباً ادبی ترجمے کے کام کو ذرا مزید سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس بات پر بحث چھڑنی چاہیے کہ محاورات، اشعار اور تہذیبی پس منظر کو ترجمے میں کس طور برتا جائے۔

غیر معمولی مقبولیت حاصل کرنے والے ناول

ایک لڑکی سے شروع ہو کر جس نے اپنے بدن پر اژدہا گودا ہوا ہے اس لڑکی تک جس نے بھڑوں کے چھتے کو ٹھوکر مار دی۔ سوئیڈن کے ادیب اسٹیگ لارسن کے تین سلسلہ وار ناول ہیں جنہیں "ہزاریہ سہ شاخہ" کا نام دیا جا رہا ہے۔ ان ناولوں نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے اور دنیا بھر میں ان کا شہرہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا ناول ہم نے اس شوق میں پڑھ ڈالا کہ دیکھیں تو سہی آخر کون سی ایسی بات ہے جس پر دنیا ریجھی جا رہی ہے۔ بہت سے پڑھنے والوں کی طرح اس ناول نے پہلی ملاقات میں اپنے دل چسپ کرداروں اور زوردار کہانی کا گرویدہ بنا لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سراغ رسانی اور جاسوسی کے قصّے یا جن کو عرفِ عام میں "تھرلر" کہا جاتا ہے، میں ان کا کچھ ایسا مداح نہیں ہوں۔ مارے باندھے سے پڑھنا پڑھ جائے تو الگ بات ہے۔ مگر اسٹیگ لارسن نے اپنا رنگ جما لیا۔

ان ناولوں نے جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے، اسے بعض مبصّرین "پبلشنگ فینومینا" قرار دے رہے ہیں۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب حال ہی میں امریکا میں شائع ہوئی ہے مگر اس سے پہلے کی دونوں کتابوں کی مجموعی طور پر امریکا میں چھ ملین کاپیاں اور دنیا بھر میں ۳۵ ملین کاپیاں شائع ہو چکی ہیں جو ایک اندازے کے مطابق، ناول نگار کے ملک سوئیڈن کی مجموعی آبادی سے چار گنا زیادہ ہے۔ کامیابی کا یہ ایسا معیار ہے جس پر ہم صرف رشک کر سکتے ہیں۔ پہلی دو کتابوں کی اشاعت کے بعد تیسری کتاب کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ "نیویارک ٹائمز" میں چارلز میک گراتھ نے لکھا کہ "ہیری پوٹر" سے قطع نظر، امریکی عوام نے کسی کتاب کا ایسی شدّت اور بے چینی سے انتظار نہیں کیا تھا اور اس طرح کسی کتاب کے انتظار کی مثال ملتی ہے تو ۱۸۴۰ء کی دہائی میں

جب ایک ہجوم نیویارک کی بندرگاہ پر انگلستان سے آنے والے جہازوں کا انتظار کرتا تھا کہ چارلز ڈکنز کے قسط وار ناول ''دی اولڈ کیوروسٹی شاپ'' میں ''لٹل نیل'' کا کیا بنا؟ تیسری کتاب کے بارے میں سب کو توقع ہے کہ یہ غیر معمولی شہرت میں اضافے کا سبب بنے گی۔ نہ صرف اپنے مصنف کے لیے بلکہ اس کی وجہ سے امریکی ناشراب سویڈن کے دوسرے ناول نگاروں کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں جن میں کامیلا لیک برگ اور دوسرے کئی جاسوسی ناول نگار شامل ہیں۔ کامیلا لیک برگ اس سے پہلے سویڈن میں بہت مشہور رہی ہیں مگر اب ان کا ناول ''برف کی شہزادی'' پہلی بار انگریزی میں شائع ہو رہا ہے۔

ان میں سے پہلا ناول ۲۰۰۵ء میں سویڈن میں شائع ہوا۔ اصل زبان میں اس کا نام ''عورتوں سے نفرت کرنے والے مرد'' تھا جو انگریزی ترجمے میں اژدہا گدی ہوئی لڑکی سے تبدیل ہو کر آج کا ایک مقبول عام ثقافتی نشان بن گیا۔ اگلے دونوں ناول، اس کے بعد ایک ایک سال کے وقفے سے سامنے آئے۔ یہ اس وضع کے ناول ہیں جن کو عام پڑھنے والے ''کرائم تھرلر'' کہتے ہیں۔ ان کا مرکزی کردار میکائیل بلوم کوسٹ (Mikael Blomkvist) ہے جو ''ملی نیم'' نامی رسالے میں کام کرتا ہے اور اسی رسالے کے نام پر ان ناولوں کو ''ملی نیم ٹریلوجی'' بھی کہا جا رہا ہے۔ ان ناولوں کی شہرت کی ایک وجہ میکائیل کی دوست اور ساتھی (امریکی محاورے میں ''پارٹنر'') لزبتھ سیلینڈر (Lisbeth Salander) ہے جو بہت سے لوگوں کو چونکا دیتی ہے مگر اس کے باوجود اپنے اندر کوئی نہ کوئی دلکشی رکھتی ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے جس نے اپنا بدن گدوایا ہوا ہے، یہ ہر دو جنس کے لوگوں کی طرف راغب ہے اور کمپیوٹر ''ہیک'' کرنے کی شوقین۔ ڈاکٹر واٹسن اور شرلاک ہومز سے زیادہ غیر روائتی جوڑا کئی ایسے جرائم کا سراغ لگاتا ہے جن کی تہہ میں بدعنوان سیاست داں، بے ایمان کاروباری، جنسی جرائم میں ملوث دلال اور اغوا کار، بگڑے ہوئے پولیس والے، بے ضمیر صحافی، موٹر سائیکل پر گھومنے والے نوجوان ٹولے شامل ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے سے پڑھنے والوں کو سویڈن کا ایک مختلف روپ دیکھنے کو ملا ہے، ایسا روپ جو امریکی مبصرین کو اپنے ملک جیسا لگا۔

ان ناولوں میں لوگوں کی دل چسپی کی وجہ اسکینڈے نیویا کا محلِ وقوع نہیں ہے، نیویارک ٹائمز نے ایک امریکی کتاب فروش کی رائے درج کی۔ الٹی بات یہ ہوئی کہ ان ناولوں کی وجہ سے سویڈن سے دل چسپی بڑھی ہے اور یوروپی سیاح ٹولیاں بنا کر اسٹاک ہوم کے ان علاقوں کا رُخ

کرر ہے ہیں جن کا بیان ان ناولوں میں ہوا ہے۔ ان ناولوں سے لوگوں کی اصل دل چسپی ان کی وسعت، پیچیدہ کردار، زوردار طرزِ تحریر اور کہانی کے فن میں ہُنر مندی ہیں۔ ہمارے خیال میں لزبتھ کا کردار ان ناولوں کی اپیل کا بڑا اہم جزو ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اسٹیگ لارسن اپنی اس غیر معمولی شہرت کو دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ لارسن ان ناولوں کی اشاعت سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ نومبر ۲۰۰۴ء میں وہ پچاس سال کی عمر میں مر گیا۔ اپنے کردار بلوم کوسٹ کی طرح وہ صحافی تھا جو سوئیڈن کے سیاسی حلقوں میں شدّت پسندی کے خلاف مہم میں حصّہ لینے کی وجہ سے تھوڑا بہت جانا پہچانا جاتا تھا۔ ۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں اس نے پہلا ناول لکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنی دوست ایوا گیبریئل سن کو بتایا، جس کے ساتھ وہ رہتا تھا کہ وہ کم از کم دس ناولوں پر مشتمل سلسلہ لکھنا چاہتا ہے۔ اس نے پہلے دو ناول مکمل کر لیے اور تیسرے پر کام ایک حصّہ مکمل کر لیا تب کہیں جا کر ناشر سے رابطہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، جس طرح کہاں جاتا ہے، وہ خود ایک کہانی ہے۔

بعد از مرگ حاصل ہونے والی اس غیر معمولی کامیابی نے سب سے زیادہ حیران ان لوگوں کو کیا جو لارسن سے کسی نہ کسی طرح واقف تھے۔ اس کے بعض پیشہ ورانہ رفقا نے برملا کہا کہ اس کی تحریر میں اس سے پہلے کوئی عندیہ نہیں ملتا کہ وہ ایسے ناول بھی لکھ سکتا ہے۔ بعض نے شک ظاہر کیا ہے کہ ان ناولوں کی تصنیف میں کسی اور کا قلم لگا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مشکوک کردار لارسن کی دوست ایوا گیبریئل سن کا بھی ہے جس نے اس سے پہلے فلپ کے ڈک کے امریکی ناول کا سوئیڈش زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ گیبریئل سن اس وقت لارسن کی موت کے بعد اس کی وراثت کے جھگڑے میں ملوث ہو گئی ہے۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت تو نہیں ہے لیکن وہ لارسن کے باپ اور بھائی کو کتاب کی رائلٹی میں حصّہ دار نہیں بنانا چاہتی۔ لارسن اپنے خاندان والوں سے مغائرت سی رکھتا تھا۔ رائلٹی سے بڑھ کر ایک اور بات توجہ کے لائق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گیبریئل سن کے پاس وہ لیپ ٹاپ ہے جس میں لارسن نے چوتھے ناول کا کچھ حصّہ مکمل کیا تھا۔ مقدمے کا فیصلہ جو بھی ہو، لارسن کے مداحوں کو اس ادھورے ناول کے بارے میں تجسس رہے گا۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ کہ لڑکی نہیں، جس آدمی نے بھڑوں کے چھتے کو ٹھوکر ماری تھی، وہ اسٹیگ لارسن خود تو نہیں تھا؟

دس سال کے بہترین ناول

آج کل فہرستیں بنانے کا ایک نیا رواج چل پڑا ہے۔ بہترین کتابیں، پسندیدہ کتابیں، سو بڑی کتابیں۔ اخبارات میں آئے دن ایسی فہرستیں تیار ہوتی ہیں، چھپتی ہیں پھر ان پر بحث اور تبصرہ ہوتا ہے۔ مثلاً ابھی مؤقر امریکی جریدے "نیویورکر" نے ۴۰ سال سے کم عمر کے نمایاں افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب کے تعاقی اداریے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ایسی فہرستیں تیار کرنا اضطراری یا مہمل معلوم ہوسکتا ہے۔ ان کے مطابق، اچھی تحریر آگے بڑھ کر خود کلام کرتی ہے اور آج کے بہترین لکھنے والے وہ ہیں جن کو ہمارے بچّے اور ان بچّوں کے بچّے پڑھیں گے۔ اس کے باوجود فہرست بنانے اور گنتی شمار کرنے کا اپنا ایک مزہ ہے جو انسان کی سرشت میں زمانہ قدیم سے داخل ہے۔ یہ تاویل اپنی جگہ لیکن "نیویورکر" نے جس طرح فہرست بنائی ہے، اسے ہم رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ۴۰ سال سے کم عمر کے ایسے ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کی فہرست بنائی جائے تو ہمارے ہاں سے کتنے نام آئیں گے؟ بہت سے پرانوں کی قلعی اُتری، چمک دمک ماند پڑی لیکن نئے لکھنے والے کتنے سامنے آئے؟ اکاّ دکاّ اور وہ بھی بہت جلد پھیکے پڑ جانے والے! لیکن یہ تو ہمارا روز کا رونا دھونا ہے، فہرست سازی نے ہمیں یوں لبھایا کہ لاہور کی ایک مدیرہ نے ہم سے فرمائش کی کہ ان کے اخبار کی کوئی خصوصی رپورٹ شائع رہی ہے، اس لیے پچھلے دس برس میں جو اہم کتابیں ہم نے پڑھی ہوں ان میں سے پانچ کی فہرست بنا کر بھیج دیں۔

اس فرمائش نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ "نیویورکر" کے مدیر کے بقول فہرست سازی کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ کتابیں؟ دس سال؟ میں نے سوچا کہ شاعری میں غالب اور اقبال کو تو میں مستقل پڑھتا آ رہا ہوں، اس لیے ان کو دس سال کے عرصے میں بند کیوں کروں؟ شاعری کی

کتابیں یوں بھی وقت کی مدت سے ناپی نہیں جاسکتیں۔ وقت کے پیمانے ناول کے لیے بہتر ہیں، یوں بھی کہ جس وقت وہ ناول پڑھا گیا، اس عرصے کے لیے سنگ میل کا سا کام کرتا ہے۔ سو میں دس سال کے اہم ترین ناولوں کا نام لوں گا جو میں نے اس عرصے میں پڑھے۔

یہ عرصہ میرے لیے مارسل پردست کی طرف ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھانے کا ہے جیسے کوئی بحرِ ذخار کے ساحل پر کھڑے ہوکر قدم آگے بڑھائے پھر موجوں سے گھبرا کر واپس کھینچ لے۔ اور جب دو قدم آگے بڑھے تو پھر بھنور میں کھنچا چلا جائے، روکے نہ رک سکے۔ میخائیل بلگا کوف کا روسی ناول ''ماسٹر اینڈ مارگریٹا'' (جس میں شیطان ماسکو میں آن براجا ہے) اور نجیب محفوظ کی زیادہ تر کتابیں میں نے اسی عرصے میں پڑھیں کیونکہ اس سے پہلے میری دسترس میں نہیں تھیں۔

فہرست بنانے سے اُکتا کر میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور جو ناول فوراً سامنے آجائیں کہ ان کا نقش گہرا تھا، میں ان کو یاد کرتا ہوں۔ حوزے ساراماگو کا حال میں انتقال ہوا ہے، اس کا ناول ''اندھے لوگ'' بیسویں صدی کے اہم ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اور حان پامک کا ''معصومیت کا عجائب گھر'' جو میں نے حال میں ختم کیا ہے اور محبت کے دونوں رُخ، نشاط کا عالم اور مایوسی کی انتہا، سکّے کے دو رُخ نظر آنے لگتے ہیں۔ لبنان کے الیاس خوری کا ''باب الشمس'' جو فلسطین کی تباہ کاری کا رزمیہ ہے۔ جاپان کے ہاروکی موراکامی کا ''ساحل پر کافکا'' جو بھٹکے ہوئے کرداروں کی کھوج کا قصہ ہے۔ اسماعیل کادرے کا ''خوابوں کا محل'' جہاں آمرانہ ریاست خواب دیکھنے اور ان میں عافیت پانے کا سہارا بھی چھین لیتی ہے۔ امیتاو گھوش کا ''گلِ لالہ کا سمندر'' جو جہازی بھائیوں کے جزیرے میں ختم ہوتا ہے تو یاد آتا ہے کہ یہ سہ شاخہ سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور جب اگلی کتاب چھپے گی تو یہ ناول پھر سے پڑھنا پڑے گا۔ ماریو برگس یوسا کا خونی انقلاب کا مرقع ''بکری کا سال'' اور شاندور مارئی کا ''انگارے۔'' نہیں، نہیں...... ''انگارے'' سے بڑھ کر اس کا وہ ناول کا سانو اوالا، کیا نام تھا اس کا؟ پھر ذرا سوچا تو امین مالوف کا ''سمرقند'' یاد آیا۔

جن ناولوں کا ذکر مجھے تفصیل کے ساتھ کرنا چاہیے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی کا ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' ایک نئی اشاعت کی تیاری کے لیے میں جس کو دوبارہ پڑھے بغیر رہ نہیں سکتا اور جس میں ایک پُرکشش نسوانی کردار ایک پوری تہذیب کا مرقع بنی نظر آتی ہے۔ حسن منظر کا ''دھنی بخش کے بیٹے'' خوب پھیلاؤ والی کتاب ہے لیکن ''العاصفہ'' کا قصہ تناؤ والا اور اثر انگیز ہے کہ تیل کی دریافت سے ایک بے نام خلیجی ریاست میں رشتے ناطے بال پڑے برتن کی طرح چٹخ کر ٹوٹنے

لگتے ہیں۔ نکہت حسن کے ''جاگنگ پارک'' میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ اس قطعۂ زمین پر ٹہلنے کے لیے آتے ہیں، بڑھتی ہوئی عمر کی ناآسودہ اور نیم محسوس آرزوئیں ان کرداروں کو ہلکان کیے جاتی ہیں جن پر زندگی کا بھید کھل کے نہیں دیتا۔ سوزن ابوالہوا کا ناول ''زخم کا نشان'' جس کا ترجمہ مسعود اشعر نے کیا ہے اور ایک فلسطین کنبے کی کہانی میں اس بدنصیب سرزمین کا المیہ سمو کر رکھ دیا ہے۔ ارے ہاں، ''کالا جل'' کو میں کیسے بھول گیا؟ اس کو پڑھے ہوئے کتنے سال ہوئے یا کتنی صدیاں؟ اور خالدہ حسین، جن کے افسانوں کا میں بہت قائل ہوں، ان کا ناول ''کاغذی گھاٹ۔'' کیا اس ناول کو پڑھے ہوئے ابھی دس سال نہیں ہوئے؟ ایسا لگتا ہے اس کو بھی ایک زمانہ ہو گیا۔ ذرا سوچا تو محمد عاصم بٹ کا ''دائرہ'' یاد آیا جو ایک مخصوص دائرے میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کا حقیقت سے قریب مرقع ہے، جس کے برخلاف مرزا اطہر بیگ کا ''غلام باغ'' مجھے اپنی کئی دوستوں کی رائے کے برخلاف موضوع کے اعتبار سے اہم لیکن ضرورت سے زیادہ ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوا۔ اس کو مزید ایڈیٹنگ کی ضرورت ہے۔ اب اگر اس کا نام بھی نہ لوں تو اور کتنے ناول ہیں جن کے بل بوتے پر فہرست بناؤں؟ میں پھر بھی یہ کام کرنا اور گنتے رہنا چاہتا ہوں...... اکڑ بکڑ بمبے بوں، اسی نوے پورے سو۔ اور نوے کے بعد سو پورے ہونے والے ہوں تو گنتی بھول جاؤں، پھر سے ایک پر پہنچ جاؤں۔

فہمیدہ ریاض

دیوداس کا نالۂ نارسا

اگر ہم سب کے (اور سب سے بڑھ کر میرے) دل پسند مصنف حسن منظر اس قدر قدامت پسند نہ ہوتے (شاندار اَدیب ہونے کے ساتھ ساتھ) تو...... کیا ہوتا؟

سرت چندر کے ناول دیوداس کا اُردو یا انگریزی ترجمہ پڑھنے سے تو ہم میں سے بیشتر محروم رہے ہوں گے، یہ خوش خبری ''دُنیازاد'' میں پڑھی کہ جناب انور احسن نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ کاش وہ دُنیازاد میں شائع ہو جائے۔ سہگل والا دیوداس بھی میری عمر کے لوگوں نے نہیں دیکھا، لیکن ہمیں دیکھنے کو ملا تھا، دلیپ کمار کا دیوداس...... آہ یہ پختونخواہ خیبر کا باسی، ایک بنگالی کے رُوپ میں کیسے دیکھنے والوں کے دِل میں سما گیا تھا۔ پھر وہ چترا سین کا اُکھڑی اُکھڑی ہندی یا اُردو بولنا، اِس کے دِل نشین گیت، وہ باؤل گاتے فقیر، سفید و سیاہ گھنے جنگلوں میں پھرتے ہوئے، یہ فلم بھلائے نہیں بھولی جاتی۔ تو اس فلم پر مبنی خیالات عرض گزاشت ہیں۔

دیوداس اور پاروتی پر تو سارا زمانہ آج بھی دل و جان سے مر مٹے۔ پاروتی کوئی روایتی ہندوستانی ناری نہ تھی۔ وہ اپنے بچپن کے ساتھی سے پیار کرتی تھی اور ماتا پتا کی مرضی کے بغیر اسے اپنا شوہر مان چکی تھی۔ اس نے یہ انتظار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ دیوداس پیار کے اظہار میں پہل کرے۔ ''میں خود اُن سے کہوں گی'' وہ اپنی سہیلی سے کہتی ہے۔ ''ارے...... کہیں ایسا بھی ہوا ہے؟'' اس کی سہیلی حیران ہو جاتی ہے۔ ''کیوں نہیں؟'' پاروتی بے خوفی سے جواب دیتی ہے۔ ''جب میں نے انہیں اپنا پتی مان لیا تو پھر شرم کیسی؟''

یہ ایک نہ شرمانے والی ایسی غیر روایتی لڑکی ہے جو اپنے من کے سچ کے مقابلے میں سماج کی عائد کردہ پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ نڈر ہے، بے خوف اور سچی (ہمارے سماج کی عام

لڑکیاں تو آج تک پاروتی جیسی نہیں بن پائیں)، سو انتہائے معصومیت، سادگی اور سچائی سے وہ رات گئے دیوداس کے گھر جا پہنچتی ہے اور کہتی ہے کہ دَیو اس سے شادی کرلے۔

اور دَیو؟ یہ دَیو کس قسم کا آدمی ہے؟ ایک کھاتے پیتے بنگالی زمیندار گھرانے کا نوجوان، پاروتی کا بچپن کا ساتھی، جواں سال پاروتی کے حسن پر موہت اور اس کی سچائی، بے باکی، بے خوفی کی قدر کرنے والا۔ مگر وہ لڑکا ہے، پاروتی کے مقابلے میں اُس نے دُنیا کو زیادہ دیکھا ہے اور اس لیے سماج کے اُلجھاوے اور جکڑ بندیوں کی اہمیت کو زیادہ سمجھتا ہے۔ پاروتی کی شادی کی خواہش پر وہ اس شبہے کا اظہار ضرور کرتا ہے کہ وہ اس کے گھر والے شاید راضی نہ ہوں، لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔

''اگر اتنی رات گئے تم میرے پاس آسکتی ہو، تو میں تمہیں چھوڑنے کیوں نہیں جا سکتا۔ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھ لے۔'' وہ کہتا ہے اور پاروتی کو گھر تک چھوڑ آتا ہے۔

دیوداس گھر والوں سے کہتا ہے کہ وہ پاروتی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ باپ، بھائی اور بھابی کے سختی سے انکار کرنے پر دیوداس کا دِل ٹوٹ جاتا ہے۔ دل شکستہ اور گھر والوں سے سخت ناراض، وہ گھر چھوڑ کر کلکتہ چلا جاتا ہے۔

دیوداس اَب کیا کرے؟ پاروتی کو بھگا لے جائے؟ وہ اسے کہاں رکھے گا؟ کیسی زندگی دے سکے گا وہ پاروتی کو؟

دیوداس پاروتی کے دِل سے اپنا خیال نکالنے کے لیے اسے خط میں لکھتا ہے کہ اس نے پارو سے کبھی پیار نہیں کیا تھا۔ لیکن خط بھیجتے ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے پارو کو ایک بہت بڑا جھوٹ لکھا ہے۔ وہ تصور کرتا ہے کہ اس خط کا پارو کے دِل پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ کس طرح تڑپ اُٹھے گی۔ وہ جو رات کے اندھیرے میں دُنیا تج کر اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اِسے احساس ہوتا ہے کہ وہ پارو سے پیار کرتا ہے۔ اس کو، صرف اسی کو اپنی پتنی بنانا چاہتا ہے۔ وہ بے حد مضطرب ہو کر فوراً اپنے گاؤں واپس لوٹ جاتا ہے۔ لیکن پارو کے دل میں اس خط نے آگ لگا دی ہے، اس کے پندار کو جو ٹھیس پہنچائی ہے، اِس کے دِل میں غصے کا جو الاؤ بھڑکا دیا ہے اِس سے مغلوب ہو کر پارو ماں باپ کے تجویز کردہ رشتے کو قبول کر چکی ہے۔ اب اس کی کہیں اور شادی ہونے والی ہے۔

وہ اپنے پتیم سے ناراض ہے، بہت ناراض۔ ''میں نے اپنے ماتا پتا، سب کو تُچھ سمجھا۔ تمہارے لیے؟؟'' وہ دیوداس سے کہتی ہے اور اس سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی۔

وہ سمجھ نہیں سکتی کہ دیو نے جو کچھ کیا وہ کیوں کیا؟ شاید دیو بھی اپنے گھر والوں کی طرح اسے خود سے نچلی ذات کا سمجھ کر ٹھکرا رہا ہے۔ وہ نہیں سوچتی کہ پھر وہ اس کے پیچھے کیوں بھٹک رہا ہے؟ خط بھیجنے کے بعد فوراً واپس گاؤں کیوں آ گیا ہے؟ کسی لڑکی سے پیچھا چھڑانے کا یہ طریقہ تو نہیں، بلکہ وہ دیو کو بدترین طعنہ دیتی ہے۔ ''جاؤ بتا دو سب کو کہ میں ایک رات تمہارے کمرے میں آ گئی تھی۔''

یہ بات دیو برداشت نہیں کر پایا۔ کیا پاروتی اسے اتنا نیچ سمجھ سکتی ہے؟ وہ لڑکی جس نے اس کے ذہن سے ماں باپ، خاندان سماج، سب کچھ حرف غلط کی طرح مٹا دیے ہیں کیونکہ وہ اتنی حسین اتنی من موہنی ہے؟ اچھا تو میں اس حُسن کو داغ لگاتا ہوں۔ دیوداس جب پاروتی کی پیشانی پر زور سے ضرب لگاتا ہے تو جیسے پاروتی کی ناراضگی کی رَو اچانک ٹوٹ جاتی ہے۔ جیسے وہ غصے کے غبار سے اچانک نکل آتی ہے اور حقیقت سے اس کا رشتہ دوبارہ جڑ جاتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ دیوداس اس سے پیار کرتا ہے۔ حالات کے اس نئے موڑ پر صرف اس کا نہیں، دیوداس کا دل بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔

اور یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا۔ کیونکہ دیوداس نے اسے خط میں لکھ بھیجا تھا کہ وہ پاروتی سے محبت نہیں کرتا۔ ایسا خیال تو اس کے ذہن میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

پھر جو کچھ بھی ہوا وہ دیوداس کی خود رحمی نہیں تھی، اسے ایک گہرا ائمٹ پچھتاوا ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اور یہی اِس کی شخصیت کا سب سے زیادہ پرکشش پہلو ہے۔ اپنی ایک چوک کے باعث پاروتی کو کھو کر اس نے زندگی سے کچھ بھی حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اس کے کردار کی استقامت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ اِنکار ہی اس کے کردار کا بھرپور اثبات ہے، پاروتی اسی لیے اس سے پیار کرتی ہے۔ دھیرے دھیرے دیوداس نے اپنے آپ کو مٹانے کی کوشش کی۔ وہ شراب ایک گونہ بے خودی کے لیے پیتا تھا۔ رنڈی کا کوٹھا وہ جگہ تھی جہاں شراب ملتی تھی۔ رنڈی اس کے لیے پاروتی کا نعم البدل کبھی نہیں بنی۔

پاروتی کو سچائی کا ہمیشہ علم رہا۔ اسے ہمیشہ معلوم رہا کہ دیوداس اِس سے پیار کرتا ہے۔ اِسے کھو کر، ایک بار اِس کے دل کو ٹھیس پہنچا کر اِس نے اپنے آپ کو زندگی بھر کی سزا دی ہے۔ پاروتی اور دیوداس کا باطنی تعلق ایملی برونٹے کی ودرنگ ہائٹس کے ہیرو اور ہیروئن جیسا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی رُوح کی گہرائیوں تک اُترے ہوئے ہیں۔ یہ پاروتی اور دیوداس کا راز ہے۔ اِن کے

اِردگرد کا سماج اس راز کو نہیں جانتا (افسوس کہ بھائی حسن منظر بھی جانتے نظر نہیں آتے۔)

دیوداس زندگی سے، جو اَب اس کے لیے صرف ایک اذیت ناک سزا ہے، پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے سرت چندر نے (اگر یہ ناول میں بھی ہے) جو طریقہ پیش کیا، وہ اِس قدر مؤثر ہے اتنا Original کہ شاید جس کی نقل نہیں کی جاسکتی۔ وہ ٹرین میں سوار ہو جاتا ہے اور بغیر کسی منزل کے تعین کے سفر کرنے لگتا ہے۔ اس ٹرین کی حرکت اس کا بے منزل و مقصود سفر دیوداس کی زندگی کے جگرخراش المیے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس سے زیادہ کارگر، دِل و دماغ کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا استعارہ اگر کسی کہانی کار یا اسکرپٹ رائٹر کو سوجھ جائے تو وہ بڑا خوش قسمت ہوگا۔

بھائی حسن منظر لکھتے ہیں کہ پاروتی کو حاصل کر کے بھی دیوداس ''جیسے'' انسان کے لیے کچھ فرق نہ پڑتا۔ اگر دیوداس کا سچ مچ پاروتی سے بیاہ ہو جاتا؟ تب کیا ہوتا؟

ہونا کیا تھا...... شاعر تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔

عاشقی حدِ شریعت میں جو آجاتی ہے

جلوۂ کثرتِ اَولاد دِکھا جاتی ہے

دونوں کے ڈھیر سارے بچے ہوتے، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، دیوداس شراب میں خود کو نہ ڈبوتا۔ دونوں نون تیل لکڑی کے چکر میں پڑے رہتے، لیکن پاروتی مرتے دَم تک اس کے ساتھ خوش رہتی، ایسے پتی کے ساتھ جو صرف اس کی جسمانی خوبصورتی ہی کی نہیں، اس کی سچائی اور بے خوفی، اس کے غیر روایتی عورت ہونے کی بھی قدر کرتا تھا۔

پاروتی اور دیوداس، دونوں اپنے وقت اور اپنے سماج کے جائے ہیں، پھر بھی ان میں دلکش انفرادیت موجود ہے۔ دیوداس پاروتی پر بچپن سے ہاتھ اُٹھاتا رہتا ہے۔ اس زمانے کی کوئی بھی فلم دیکھ لیجیے، جب ہم کالج میں پڑھتی تھیں تو سب لڑکیاں اس بات پر ہنستی تھیں کہ ہر فلم میں ہیرو کم از کم ایک بار ہیروئن کو طمانچہ ضرور مارتا ہے۔ گئے وقتوں میں اسے عورت مرد کے درمیان اپنائیت کا اظہار سمجھا جاتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے سیکشوالٹی کا مظہر قرار دینے کا ایک مبہم سا تصور موجود تھا۔

دیوداس پر ہم یہ الزام کیونکر رکھ سکتے ہیں کہ وہ تیس کی دہائی میں سن دو ہزار دس کے روشن خیال مرد کی طرح کیوں نہیں سوچتا تھا؟ (سرسید پر یہ الزام کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے مجھے ہمیشہ کچھ عجیب سا لگا ہے۔ ہمیشہ خیال آتا ہے کہ ان کا زمانہ اور حالات دوسری طرح کے تھے اور انہیں عورت مخالف گردانا زیادتی ہے) دیوداس ایک رنڈی کی عزت کر سکتا تھا۔ اس کی انفرادیت،

کردار کی گہرائی اور بڑا پن اس بات میں ہے۔ شاید وہ آج کے روشن خیال، مرد کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ یہ عمارت آخر کسی نہ کسی نیو پر تو کھڑی ہے۔

اور سرت چندر؟ بھائی حسن منظر لکھتے ہیں کہ ایسے اُدیب سے دیوداس جیسے کردار کی تخلیق کے سوا کیا توقع رکھی جاسکتی ہے جو افیون کھا کر جنگل کے ایک کنج میں پڑا رہتا تھا۔

کیا واقعی سرت چندر جنگل میں جا بسے تھے؟ ایسا تو کتنوں کا دِل چاہتا ہے، لیکن کرتا کون ہے؟ لوگ اسے ناممکن سمجھ کر اپنی خواہش کو ہنس کر بھول جاتے ہیں۔ ''اوہو، یہ تو ایک رومانی تصور تھا۔'' پھر وہ ایسا کہتے رہتے ہیں۔

تصور تو بے شک رومانی ہے، لیکن اگر کوئی اسے سچ مچ حقیقت میں بدل دے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ حیرت سے انگشت بدنداں نہ رہ جائیں گے؟ کیسے ناقابل یقین، انوکھے انسان ہوتے ہیں ایسے لوگ اور وہ جنگل میں پڑے جھک نہیں مار رہے تھے۔ ''دیوداس'' جیسے یادگار، لافانی ناول تخلیق کر رہے تھے۔

لیکن وہ تو افیون بھی کھاتے تھے۔

یہ تو بہت بری بات کرتے تھے سرت چندر...... یہ آرٹسٹ اُدیب شاعر ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ (کون جانے کنفیوشس بھی افیم کھاتے ہوں!)

نہ جانے کیوں! ذرا غالب کو یاد کیجیے۔ شراب وہ پیتے تھے، جوا وہ کھیلتے تھے، جیل بھی گئے، آہ لیکن، شوخ کب بند قبا باندھتے ہیں

اور یہ بھی تو وہ ہی کہہ گئے ہیں کہ ؂

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اِک اپنی ہوا باندھتے ہیں
غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اسد محمد خاں
(کراچی)

پیرزادہ نے موہن کلپنا کا بے مثال ترجمہ کیا ہے۔ انور احسن صاحب کی ہجرت ایک زندہ اور لرزتا ہوا ڈاکومنٹ ہے ستائیسویں یہ پہلا تاثر کمال ہے۔

قیصر آفریدی
(کراچی)

آپ کے مؤقر جریدے کا پچیسواں شمارہ نظر سے گزرا۔ مواد و معیار کے اعتبار سے دل نواز لگا، خاص طور سے اس امر سے خاصی مسرت ہوئی کہ غالباً اردو کے ادبی جرائد و رسائل میں پہلی بار کسی جریدے کو یہ استطاعت نصیب ہوئی کہ وہ اردو کلچر اور لٹریچر کے ساتھ ساتھ دیگر ملکی زبانوں کا لٹریچر بھی لائقِ اعتنا سمجھ کر اپنے صفحات میں جگہ دے۔ یہ بات میں اُن چند مضامین کے بارے میں لکھ رہا ہوں جو آپ کے مؤقر جریدے میں مالاکنڈ خصوصاً سوات کے حوالے سے چھپے ہیں۔ گو کہ ایسا بہت پہلے ہونا چاہیے تھا لیکن دیر آید درست آید کے مصداق اب میں جس خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے تراجم کی وساطت سے اگر پشتو زبان، ادب و تاریخ کو اردو میں متعارف کرانا ہی ہے تو پشتو ادب کے اُس حصے کو بطور خاص اہمیت کی نظر سے دیکھنا چاہیے جو پشتون بیلٹ میں گزشتہ ایک عرصے سے موجود عسکری حالات اور اُس سے شدید ردعمل کے طور پر اُبھرنے والے جذبات و خیالات کا نتیجہ ہے۔ ان حالات کی براہِ راست خبر گیری تو ملکی اور بین الاقوامی میڈیا کے ذریعے خوب ہو چکی ہے لیکن عام لوگوں کے دلوں میں چھپے ہوئے جذبات اور اُن کی کچلی ہوئی نفسیات کی عکاسی تو آپ کو اُن ادب پاروں میں ملے گی جو وہاں آج کل شائع ہونے والے رسائل و جرائد اور شخصی کتب کی زینت بنتے ہیں۔ یہی نہیں، ٹی وی اور دیگر کلچرل شوز میں اس کا برملا اور بے جھجک اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ خیالات کا اور جذبات و احساسات کا یہ حصہ وہ ہے جو اس سے پہلے مصلحتاً اور ارادے سے دبایا جاتا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ دبانے سے بھی نہیں دبتا۔

ایسے میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ رہ رہ کر میرے سامنے آتی ہیں۔ سطورِ بالا میں جن مصلحتوں کا ذکر کیا گیا ہے ظاہر ہے وہی مصلحتیں آپ کی صحافتی پالیسی یا طرزِ عمل کا بھی حصہ ہوں گی اور اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ پوچھ رہے ہوں گے کہ اس طرح سوچنے اور اُس کے نتیجے

میں فن پارے یا ادب پارے تخلیق کرنے کا ان لوگوں کے پاس جواز کیا ہے؟ اور بھلا میں خود کو اس جھمیلے میں کیوں اُلجھاؤں۔

مکرمی! اس سوال کا جواب اور موجودہ صورتِ حال کا جواز ڈھونڈنے کے لیے ہمیں ذرا دور سیاست اور تاریخ کے تناظر میں جانا اور واپس آنا ہوگا، لیکن آیئے اس سے پہلے ایک نظم کا آئینہ اُٹھاتے اور اُس میں جھانک کر حالات کی صورت کا جائزہ لیتے ہیں۔

پشاور کو زخم نہ دو / کہ ابھی کابل کے زخم مندمل نہیں ہوئے / کابل کے لہو سے بھرا کاسہ / کیا خالی ہو چکا! / جو یہاں کے خون سے / دوسرا کاسہ بھر لینا چاہتے ہو۔

مکرمی ایڈیٹر، یہ نظم جس کا پلاٹ پشاور، سوات، باجوڑ اور وزیرستان سے ہوتا ہوا کابل، ہرات اور قندھار تک پھیلا ہوا ہے، جب موسیقی کے ساتھ گائی جاتی ہے تو ایک پشتو چینل کا اسکرین گواہ ہے کہ سُننے والے اسے محض سنتے نہیں بلکہ فرطِ جذبات سے رو رو کر اپنے آنسوؤں سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ ظاہر ہے اُن کی نظر میں صرف یہ بات نہیں ہوتی کہ کابل کے بعد اب پشاور تباہی و بربادی کے کنارے کھڑا ہے، بلکہ اس کے پس پردہ جو دوسری بربادی انہیں نظر آتی ہے تو اُس کا ازالہ آنے والے سینکڑوں سالوں میں بھی ممکن نہیں۔

برصغیر میں وارد ہونے والے بدیسی حکمرانوں، مغلوں اور انگریزوں کے مظالم سے اپنی قومی حیثیت، زبان، ادب و ثقافت کو بچا کر یہ لوگ جب پاکستان کے احاطے میں داخل ہوئے تو اُن کی آنکھوں میں اس امید کے دیے جھلملا رہے تھے کہ اب ہم اپنوں کے سائے میں ہیں، ہم محفوظ و مامون ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ لوگ اپنی زبان کی بات کرتے اور ان سے جواباً کہا جاتا کہ نہیں یہ تو سالمیت پاکستان کی منافی بات ہے تو وہ بلا چون و چرا اپنی زبان سے دست برداری کا ارتکاب کرتے۔ جب یہ لوگ اپنے قومی حقوق واقتدار کے بارے میں لب کشائی کرتے تو اُن کو طعنہ دیا جاتا کہ تم اتحادِ امتِ مسلمہ کا حصہ نہیں ہو کیا؟ یوں کرتے کرتے ان لوگوں نے پاکستانی اور مسلمان بننے کے لیے اپنی جھولی تمام تر سرمایۂ تاریخ سے تہی کر دی۔

لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے باوجود انہیں نہ تو دل سے پاکستانی تسلیم کیا گیا اور نہ مسلمان سمجھا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان لوگوں کی زبان کو وہی مغلوں اور انگریزوں سے وراثت میں حاصل کیے گئے لقب ''دوزخی زبان'' سے تعبیر کیا گیا۔ پھر بھی یہی لوگ تھے جو مجاہدین بنے کہ ایک طرف اسلام اور مسلمان کی سربلندی اور دوسری طرف پاکستان کی بقا اور سلامتی انہیں مطلوب

تھی۔ انہوں نے طالبان بننے سے بھی گریز نہیں کیا کہ اس کے بغیر ہرات وقندھار کے راستوں سے وسطی ایشیا کو جانے والے قافلوں کو پہنچنا محال تھا لیکن واہ رے قسمت جب تک ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں تو مالِ غنیمت کے لیے دامن پھیلائے ہوئے مسلمان اور پاکستان خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا لیکن جب گرم ہوائیں چلنے لگیں تو ''سرکار'' نے القاعدہ کے تعاقب میں راتوں رات پاکستانیوں اور مسلمانوں سے ''یار بننے یا دستبردار'' ہونے کا دوٹوک فیصلہ مانگا تو مسلمانوں کو دونوں شانے چت ہونے اور پاکستان کو اپنا تصورِ بقا بیچنے میں دیر ہی نہیں لگی۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ صرف پسنی کے اڈے سے اُن طالبان پر فضائی حملے ہوئے جو کبھی پاکستان اور عالمِ اسلام کے سرپرستِ اعلیٰ کی آنکھوں کے تارے ہوا کرتے تھے جب کہ آج کل دہشت گرد ٹھہرے ہوئے ہیں۔

دہشت گردی کا سہرا باندھ کر عالمی منظر نامے میں شہرت پانے والے افغانستان اور پاکستان کے کروڑوں پشتون اور اُن کے علاقے آج اپنی غیرت کے جس جہنم میں جل رہے ہیں ایسے میں لوگ فطری طور پر معاشی بدحالی سے دوچار ہو کر اخلاقی پستی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں، چور اور راہزن بھی بن بیٹھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کی صورتِ حال پر طعنہ زن ہونے کی بجائے اُن لوگوں سے ہمدردی جتائی جائے، حالات کا درست سمت میں تجزیہ کر کے سفارشات ترتیب دی جائیں اور اُن کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہر سطح پر آواز اٹھائی جائے، اقدامات کیے جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں عالمِ اسلام تو شروع ہی سے ایک مجرمانہ بے حسی کا مظاہرہ کرتا چلا آ رہا ہے، خود پاکستان کے اندر بعض صاحب الرائے تجزیہ نگار اور کالم نگار حقائق کا براہِ راست سامنا کرنے کی بجائے ان لوگوں کو من حیث القوم چور، اسمگلر اور دہشت گرد کہہ کر ذرا بھر شرمندگی کا احساس نہیں کرتے (یہاں میں نذیر ناجی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔)

مکرمی ایڈیٹر، یہاں پر میں اُس نظم کا بھی حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں جو آپ ہی کے جریدے میں ایک خاتون شاعرہ کشور ناہید کے نام کے ساتھ چھپوائی گئی ہے۔ اس نظم کی پوری فضا بندی اور اس کے اندر ترتیب پائے ہوئے رموز وعلائم (سفید ٹوپی، تسبیح اور شلوار میں کھجانا وغیرہ) جن لوگوں کی تضحیک وتحقیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ یہی لوگ ہیں جو آج اپنی حالت پر من حیث القوم ماتم کناں ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمارے پاس رہا ہی کیا، وہ اگر زندہ رہنا چاہیں گے تو محض جنت کے اُس خواب وخیال کے سہارے، جو نام نہاد اسلامی لٹریچر نے انہیں ایک پرکشش فریب کی شکل میں دیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ لوگ اس جہنم کا کیا کریں جو ان لوگوں کے اردگرد ماحول اور اندرونی

طور پر اُن کے دل و دماغ میں بھی سُلگ رہا ہے۔ اس جہنم کا موازنہ جب یہ لوگ خیال ہی خیال میں اُس (بعد از مرگ) جہنم سے کرتے ہیں تو اُس جہنم کو تخیلاتی طور پر مانوس اور پُرسکون پاتے ہیں۔ تب ہی تو ایک شاعر کو اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے اور اپنے خیالات پیش کرنے کا جواز ملتا ہے:

ایسی حالت میں، کہ میرے گھر پر جنگی طیاروں کے بادل منڈلا رہے ہیں،
میرے سر پر رقابت کے سیاہ اولے گر رہے ہیں میرے معصوم بچے سردی کی لمبی راتیں
جاگ کر گزارتے ہیں اور میرے ''مسلمان بھائی'' اپنے ایمان کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔
اپنے دل کی اک بات مجھے اُکسا رہی ہے کہ میں اس بات کو لے کر ہر
اک دل کی چوکھٹ پر تحریر کر جاؤں۔
اپنی غیرت کی جس آگ میں آج میں جل رہا ہوں، دوزخ کی آگ تو
اتنی شدید نہیں ہوگی، کیوں نہ میں دوزخ کی آرزو کو لے کر اپنی ''دوزخی زبان''
سے کلمۂ کفر کا ارتکاب کروں اور جنت کا خوابِ خوشنما اپنے نازدیدہ مسلمان بھائی کو
ترکے میں چھوڑ دوں۔''

مکرمی! آپ نے سُنی یہ آواز، یہ احتجاج، اور یہ فیصلہ۔ بظاہر تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہ آواز، یہ احتجاج کسی مجہول سوچ کا نتیجہ ہے، لیکن حب الوطنی اور اسلام پسندی کی دشوار گزار انتہاؤں سے گزر کر کوئی قوم، کوئی قبیلہ جب بہت ہی بے چارگی کے عالم میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بڑوں، بوڑھوں اور بچوں سمیت پنجاب اور سندھ کے بارڈر پر پڑا ہو اور اُنہیں محض یہ کہہ کر اندر نہیں جانے دیا جاتا ہو، اُن کے سامنے سڑکیں اور شاہراہیں بلاک کردی جاتی ہوں کہ ''ہم نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا مہاجرین و مجاہدین کو سنبھالنے کا۔'' اور ان آوازوں کے پیچھے کچھ اور آوازیں بھی سنائی دیتی ہوں کہ ''ان لوگوں کی رجسٹریشن ہونی چاہیے..... ان لوگوں کی آڑ لے کر سندھ میں طالبان در آئیں گے۔'' یہ آوازیں اُٹھانے والوں میں سے کسی ایک نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ جب ہندوستان سے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد آ کر اسی سندھ کے راستے پورے پاکستان میں پھیل رہی تھی تب تو کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی تھی کہ ان مہاجرین کی شفافیت یقینی بنائی جائے مبادا ان کی آڑ میں ہندوستانی ایجنسیاں یا ہندوستانی غنڈے پاکستان میں داخل ہو رہے ہوں۔

تو یہ آواز، یہ احتجاج کسی مجہول سوچ کا نتیجہ ہرگز نہیں بلکہ یہ پاکستانی عوام و خواص کے اُس معاندانہ رویے کا شاخسانہ ہے جسے یہ لوگ گزشتہ ۶۲ سالوں سے الگ الگ رنگوں اور شکلوں میں

برداشت کر کے چلے آ رہے ہیں۔ گو کہ اُن لوگوں کے پاس ایک آئینہ موجود تھا اور بنگالیوں کے بروقت فیصلے سے یہ لوگ اپنے لیے بہتر فیصلوں کو ترتیب دے سکتے تھے۔ لیکن ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہی تو ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی حب الوطنی اور اسلام پسندی کی سزا تو ملنی چاہیے تھی۔ سو وہ بھگت رہے ہیں۔ دوسری طرف ملکی اور سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ملک طالبانائزیشن اور دہشت گردی کے مسئلے سے جو دوچار ہے یہ بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہو رہا ہے۔ کیا یہ ہمارے اپنے اعمال و افکار کا نتیجہ نہیں؟ جہادِ افغانستان کے ''مقدس'' زمانوں میں جب ہمارے بعض بزرگ راہنما گلا پھاڑ پھاڑ کر ہمیں خبردار کیا کرتے تھے کہ ''دوسروں کے گھروں میں پتھر مت پھینکو، اُس کے بدلے میں وہاں سے ہمارے لیے تحفے میں پھولوں کے ہار نہیں آئیں گے۔'' تو اِن بزرگوں کی تنبیہ سُننا اور اُس پر عمل کرنا تو درکنار، امریکی محبت کے نشے میں سرشار، ہم نے اِن راہنماؤں کی شان میں کیا کیا گستاخی نہیں کی؟ جانتے ہوئے بھی ہم بدستور اپنے چُنے ہوئے غلط راستوں پر گامزن رہے۔ پڑوسیوں کے بیچ میں رہ کر بھی ہم نے اُن سے اچھی ہمسائیگی کی روش نہیں اپنائی، بھارت سے تو ہم دشمنی پال ہی رہے تھے کہ سوویت یونین کو ٹکڑے کرنے کا سہرا بھی ہم نے اپنے سر باندھ لیا، ایرانی سرحدوں تک طالبان کی قوت کو بڑھا کر ہم نے ایرانیوں کو دوستی کا پیغام نہیں بھیجا، افغانستان کو اپنا پانچواں صوبہ بنانے کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے ہمارے اقدامات کو افغانی جان چکے ہیں، اب یہ سب لوگ باری باری یا بیک وقت ہم سے بدلہ لے کر ہی رہیں گے۔

اب اس تمام تر صورتِ حال کے لیے اگر ہم موردِ الزام ٹھہرائیں تو کس کو ٹھہرائیں؟ خود کو!! لیکن خود کو کیوں ذمہ دار ٹھہرائیں؟ کیا ہم ایک ریاستی چھتری کے سائے میں نہیں رہ رہے ہیں؟ اس چھتری کے نیچے ہم گرمی اور سردی سے دوچار ہو کر محسوسات اور آگے چل کر معقولات کے مالک نہیں بنتے ہیں؟ ہماری ذہنی ارتقاء اور پسماندگی، اخلاقی اچھائی اور برائی کا ناطہ اسی چھتری اور اس کے سائے سے جڑا ہوا ہے، اگر ذمہ دار ہی ٹھہرانا ہے تو کیوں نہ ہم اپنے پالیسی سازوں اور اُن کی اندرونی و بیرونی پالیسیوں کو ٹھہرائیں جو اسی ریاستی چھتری کے نیچے ترتیب دی جاتی ہیں اور جو محض جنگ و جنون کی نفسیات کو سامنے رکھ کر تجویز کی جاتی ہیں۔

انسانی نیچر کیا ہوتا ہے؟ کلچر اور لٹریچر کسے کہتے ہیں؟ بالفاظ دیگر انسانی نفسیات، صاف، ستھرے، پُرامن جذبات و احساسات کیا ہوتے ہیں؟ ہمارے پالیسی سازوں نے تو کبھی غلطی سے

مڑ کر اس طرف نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں کتاب کم اور اسلحہ زیادہ خریدا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں ہر چیز سے عسکریت کی ''خوشبو'' آتی ہے اور اسی چیز کو سامنے رکھ کر میں اپنی تجویز کا اعادہ کرنا چاہوں گا کہ اگر ہمیں سچائی ہی کی تلاش ہے تو ہمیں تواریخ اور سیاسی تبصروں و تجزیوں پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تخلیقات کی طرف بھی رجوع کرنا چاہیے جہاں تمام تر مصلحتوں سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف سچائی کا عکس نظر آئے گا۔ یہاں جھوٹ کی گنجائش اس لیے نہیں ہوتی کہ دعویٰ نہیں ہوتا اور دعویٰ اس لیے نہیں ہوتا کہ یہاں ملکیت اور ملکیتی سوچ کا سکہ نہیں چلتا، یہاں حکمرانی صرف اور صرف انسانی فطرت کی چلتی ہے، انسانی فطرت جو اپنے سیدھی اور سادی شکل میں سچ ہی سچ ہے اور جو ملکیتوں میں بٹی ہوئی انسانی زندگی کے دائروں میں محصور ہونے کے باوجود کسی دائرے کی پابند نہیں۔

اجیت کور
(نئی دلّی)

میں داتا دربار میں اپنے سارے دوستوں کے لیے دعا مانگا کرتی تھی جو ساری دنیا میں ہیں، خاص طور پر ہندوستان اور پاکستان میں کہ ہماری مدد کریں تاکہ ہم غربت، جہالت، ناانصافی، تصادم کے مسائل کو حل کر سکیں اور ہمارے مسائل جلدی حل ہو سکیں۔

داتا دربار پر حملہ ہو گیا؟

بم کا حملہ؟

داتا جی نے کیا غلط کیا؟ سوائے اس کے محبت، ہمدردی اور ازلی رحم و کرم پھیلا دیا: ہر ایک کے لیے، اس کا مذہب، رنگ اور نسل چاہے کچھ بھی ہو!

کیوں؟ کیوں؟

میرا دل رو رہا ہے!

کیا قیامت اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ اس سے بڑھ کر خوف ناک کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟

مجھے اپنے بازوؤں میں تھام لو اس لیے کہ مجھے ایسا لگتا ہے میں گر رہی ہوں، سر کے بل گرتی جا رہی ہوں، ایک اندھیرے پاتال میں!

مجھے تھام لو! مجھے تھام لو!

قلم کار

انتظار حسین
احمد مشتاق
احمد آزاد
اشوک واجپئی
الطاف فاطمہ
امیتاو گھوش
تصدق سہیل
تنویر انجم
جان برگر
حسن منظر

حوزے سارا ماگو
ڈاکٹر بصیرہ عنبرین
ڈاکٹر فاطمہ حسن
رضیہ فصیح احمد
سیمین دانشور
شمس الرحمٰن فاروقی
شوکت عابد
صابر وسیم
ظفر اقبال
عبید صدیقی

عثمان قاضی
عذرا عباس
عرفان ستار
فہمیدہ ریاض
فہمیدہ ریاض
کاشف حسین غائر
گوئین ایکرمین
مارگریٹ ایٹ وڈ
محمد عباس
منیب الرحمٰن
نکہت حسن

Price Rs. 200/-
شہرزاد
SCHEHERZADE